نگار

مرتبہ
نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔

۲ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا

۳ خط وکتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں

۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ارکا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں

۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

(نگار)

تصویر زیب النسا بیگم

یہ تصویر صنعت ونقاشی کا ایک نادر نمونہ ہے رنگین آرٹ پیپر پر طیار کرائی گئی ہے یہ وہی تصویر ہے جس کو حکومت نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے برٹش میوزیم کو دیا ہے نہایت نفیس چیز ہے قیمت صرف ۸ر

تصنیفات مولینا نیاز فتحپوری

صحابیات

یعنی عہد سعادت کی اطاعت ان خواتین کے نہایت صحیح اور مستند حالات خواتین کے مطالعہ کے لئے ضروری چیز ہے عہ

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور مصور مزمدار کے قلم کی بہترین صناعی یہ تصویر بھی رنگین آرٹ پیپر پر طبع کرائی گئی ہے اور یہ تصویر رسالۂ نگار ماہ مارچ میں شائع ہو چکی ہے آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہونگے قیمت فی کاپی صرف ۴ر

تاریخ الدولتین	نگارستان	شہاب کی سرگزشت	گہوارۂ تمدن	جذبات بھاشا	المسئلة الشرقیہ
علامہ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی کے پانچویں حصے کا ترجمہ	حضرت نیاز کے تمام بہترین ادبی مضامین کا مجموعہ عہ	اردو میں پہلا فسانہ ہے جو تحلیل نفسی کے اصول پر لکھا گیا ۱عہر	اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ تہذیب و شائستگی کی ترقی کس قدر عورت کی ممنون ہے قیمت عہ	ہندی شاعری کے بیمثل نمونے قیمت ۱۲ر	مصطفےٰ کامل پاشا کی مشہور عربی کتاب کا ترجمہ ۱ر

نرخنامۂ اجرت اشتہارات

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	[illegible] روپیہ	[illegible] روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائے (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دیکر مضمون بدل سکتا ہے

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	[illegible] روپیہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ | جلد ۱۲ - شمارہ ۱

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۲ | شمارہ ۱

فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۷ء

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد (۱۲) | جولائی ۱۹۲۷ء | شمار (۱)

ملاحظات

جن لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کےکسقدر ہلکے اور پر لطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال بندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عہد ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں مجھے حاصل ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے ابلتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب درجہ ناکام دل کی نفس سرد بھی آہِ زباں سوز ہو کر نکلتی ہے پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت و حیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل بیٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بہار آنے سے پہلے ہی دامن و گریباں کے فاصلہ کو کم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ "تداخل فصلین" آدمی کو مہینوں صاحب فراش رکھے، وہ ملک کیا خاک ترقی کر سکتا ہے اور وہاں کے بدنصیب افراد کیا دماغی و ذہنی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخری کاپی لکھی جا رہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیاگرہ کئے ہوئے بیکار پڑا ہوا تھا

کہ مولوی نورالرحمٰن بی اے (مجھیرایونی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے مہمان ہیں مجھے رحم آیا اور انھوں نے معلومات کا حصہ مرتب کر دیا۔ جب سے نگار جاری ہوا ہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ حالات سے متاثر ہو کر نگار کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ کو مشوش پایا۔ اور یہی سبب ہے کہ میں اس مہینے باب استفسار کی طرف بہت کم توجہ کر سکا۔

مقالہ آرگس کے جواب میں ابن یمین اور حافظ کی نزاع پر جناب میر ولی اللہ صاحب بی اے کا مضمون حسب وعدہ اس مہینے میں شایع ہو رہا ہے۔ گو آرگس کے استدلال پر اس سے زیادہ بحث و تحقیق کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر میر ولی اللہ صاحب سعی فرماتے تو اس سے زیادہ تکمیل اس مضمون میں پیدا کر سکتے تھے۔ بہر حال اس مضمون کے بعد جناب آرگس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا جواب دیں، یا اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

جناب آسی کا مضمون طنزیات جاری ہے اور غالباً آئندہ ماہ کے رسالہ میں ختم ہو جائے گا۔ خالص پھبتیوں پر ایک مضمون خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے بھی از راہ کرم عنایت فرمایا ہے جسے آپ اگلے مہینے کے رسالہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس وقت تک رسالہ "قند" کا اجرا ملتوی ہے، لیکن جیسا کہ وعدہ کیا گیا تھا دو چند ہی فسانے نگار میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ نہ خانے کا راز۔ کینن ڈائل کے فسانہ کا ترجمہ ہے اور مراد حضرت مجنوں گورکھپوری کا طبعزاد فسانہ ہے جس میں انھوں نے اپنی انداز تحریر کی خصوصیات کو پوری طرح قائم رکھا ہے اور شخصیت نگاری کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔

تیسرا فسانہ عبد الرحمٰن الداخل کے متعلق ہے جو باوجود تاریخی واقعات ہونے کے صفحات تاریخ سے معدوم ہے۔ اس لحاظ سے یہ فسانہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ماہ کے رسالے میں نپولین کی بیوی جوزفاین کے متعلق بھی ایک ایسا ہی سچا واقعہ درج کیا گیا تھا جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتا۔

حالی کی شاعری کے متعلق سید اعجاز حسین صاحب بی اے کا مضمون آئندہ مہینے میں ختم ہوگا۔ ہر چند سید صاحب نے کافی محنت کے ساتھ یہ مضمون مرتب کیا ہے۔ لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ وسعت کا محتاج ہے اور خالص شاعرانہ

نقطۂ نظر سے بھی نہایت غائر نقد و تبصرہ چاہتا ہے، کیونکہ حالی کے متعلق ان حلقوں میں جہاں شاعری نام صرف ایک مخصوص رنگ تغزل کا ہے، یہ سوءِ ظن پایا جاتا ہے کہ حالی ناظم ضرور تھے لیکن شاعری سے انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ حالانکہ اس سے زیادہ تنقیدی معصیت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہ الزام رکھ کر حالی کو شاعروں کے گروہ سے جدا کیا جائے۔ کیونکہ اس مخصوص رنگ تغزل کے لحاظ سے بھی حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان کی قدیم رنگ کی شاعری میں وہی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر دہلی کے شعراء متقدمین میں کوئی بہتر سے بہتر شاعر ناز کرسکتا تھا۔ افسوس ہے کہ سید اعجاز حسین صاحب نے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی اور حالی کی صرف اس شاعری کو پیش نظر رکھا جس میں انھیں انفرادیت کی حیثیت حاصل تھی۔

عرصہ سے میری خواہش ہے کہ کلام مومن پر ایک فاضلانہ تنقید کی جائے اور میں نے اپنے بعض احباب کو اس طرف متوجہ بھی کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کلام مومن ان کا درخور ذوق نہ تھا یا یہ کہ میری التجا لائق التفات نہ تھی بہر حال اب میں پھر ارباب علم و ادب کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اس خیال سے کہ شاید اس روحانی خدمت کے لئے کوئی مادی ترغیب کارگر ہوسکے، یہ اعلان بھی کرتا ہوں کہ جن صاحب کا مضمون سب سے بہتر ہوگا ان کی خدمت میں ۵۰ روپیہ کا مختصر ہدیہ پیش کیا جائے گا۔

آئندہ مہینے کے رسالہ میں "فسانہ" کا حصہ زیادہ وسیع ہوگا اور منجملہ دیگر افسانوں کے ایک فسانہ جو ارتکاب جرم اور انکشاف جرم دو حصوں میں منقسم ہے اور جو اپنی ترتیب اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے خصوصیت کے ساتھ نہایت دلچسپ ہوگا۔ علاوہ افسانوں کے اور مضامین بھی بعض معرکۃ الآرا مباحث پر پیش کئے جائیں گے۔

عام طور پر رسائل مضمونوں کی کمی کے شاکی رہتے ہیں، مجھے یہ شکایت ہے کہ رسالہ کے سو صفحات بھی کافی نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ گزشتہ دو ماہ سے رسالہ کی کتابت بہت گنجان کرادی گئی ہے لیکن اس پر بھی ایک مسلسل مضمون "لارڈ ریڈنگ کا عہد حکومت" نہیں دیا جاسکا، حالانکہ اس کو اپنی اہمیت کے لحاظ سے برابر جاری رہنا چاہئے تھا آئندہ کے لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ اگر رسالہ کے موجودہ صفحات ناکافی ہوئے تو میں اس مضمون کے لئے اور چند صفحات کا اضافہ کردونگا

نیاز فتحپوری

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست   شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا اس میں گفیہ اور نہفیہ کے کچھ معنے بھی لکھے تھے۔

ظاہر ہے کہ انشا یہ بات جانتے تھے کہ گفتہ نہفتہ خفتہ، سب قوافی ہیں اور صحیح ہیں مگر استہزا کے طریق پر تجاہل کر کے میر منشی صاحب کو بنانے کے لئے یہ کہا۔

۳ ایسے ہی اوج غالب ذوق وغیرہ کے معاصر تھے۔ وہ ایک معمولی بلکہ غلط گو شاعر تھے جب غالب کو شعر سناتے تھے تو مرزا کہتے تھے کہ "واللہ کیا خوب" "وہ لوگ کافر ہیں جو تم کو شعر گوئی کا استاد جانتے ہیں۔ شاعری کے خدا ہو خدا" یہ کہکر دوسرا شعر سنتے اور سبحان اللہ کہکر سجدہ کرنے کے طریقہ پہ گردن جھکا لیتے تھے۔

کبھی استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ ایک دوسرا واقعہ دوسرے کو مخاطب بنا کر یا بغیر خطاب کے کہتے ہیں اور اصل میں مقصود کسی اور کو بنانا اور کسی دوسرے واقعہ پر اس کو شرمانا ہوتا ہے۔ کہتے کچھ اور ہیں اور مطلب کچھ اور لیتے ہیں۔ جیسے نعمت خاں عالی نے اراکین شاہی اور خود اورنگزیب عالمگیر پر اس قصیدہ میں استہزا کیا ہے۔

معراج و سلّم آمدہ زینہ بحق کمند   زیں ہر دو ہیچ کا نیاید بانصرام

ظاہرا نعمت خاں عالی، الفاظ کے معنی بیان کرتا ہے کہ معراج اور سلّم زینہ کو کہتے ہیں اور وہ حق کمند کو، مگر ان دونوں سے انتظامی معاملات میں کوئی کام نہیں نکلتا۔ اور در اصل اس واقعہ پر بادشاہ اور فیروز جنگ بہادر کو بنایا گیا ہے، کہ انھوں نے شبخون کے طریقہ پر قلعہ گولکنڈہ پر ایک کو کمند اور زینہ لگا کر دیوار قلعہ پر چڑھنا چاہا تھا۔ مگر قلعہ میں خبر ہوگئی اور الٹا انھیں پہ حملہ ہوگیا اور فوج شاہی نہایت ناکامی کے ساتھ پسپا ہوگئی ؎

الکسر و السقوط شکستن فتادن است   آنہم شدو حصار نیفتاد از نظام

مطلب ظاہری یہ ہے کہ کسر ٹوٹنے اور سقوط گرنے کو کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوگیا مگر حصار کا نظام برقرار رہا مگر در اصل کہا یہ گیا ہے کہ کمندیں جب کاٹ ڈالی گئیں اور زینہ والوں پر جب حملہ کیا گیا تو یہ لوگ گرے بھی، ہڈیاں بھی ٹوٹیں، مگر شرم نہیں آتی کہ ابتک حصار کئے ہوئے پڑے ہیں۔ نعمت خاں عالی کے یہاں وقایع میں اکثر قصیدہ اسی قسم کے ہیں بخوف طوالت ہم سب کو لکھنے سے مجبور رہیں کبھی کبھی صرف تمسخر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور شعر ہے کہ ؎

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی   مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس میں صرف شیخ اور مولوی مدن پر استہزا کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ شعر ؎

سمجھا کہ سر پہ رکھ کے مرا چاک لے چلے   دوڑا کمہار شیخ کی دستار دیکھکر

اس میں تمسخر کے ساتھ شیخ کے احمق کا بھی اظہار کیا گیا ہے یا یہ شعر ؎

شیخ نے مانگی ہے اپنے وقت کی — میکدے سے اب پرانی جائیگی

شب ماہ کا لطف ای شیخ جب ہے — کہ ہالا بنے تیری پگڑی اچھلکر

اکبر — مغرب نے خردبین سے گہرائی دیکھ لی — مشرق کی شاعری کا مزا اکر کرا ہوا

داغ — زاہد کو ایک قطرۂ زمزم پہ ناز ہے — یاں خم کے خم اڑا ئے ہیں پیر مغاں کیسا

" — انھیں لوگوں کے آنے سے تو میخانہ کی عظمت ہے — قدم تو شیخ کے تشریف لائے بادہ خواروں میں

غالب طنز کو استہزا میں شریک کرتا ہوا کہتا ہے

می بزہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب — پیش این قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

دوسرے مصرع میں صرف استہزا اور تمسخر ہے۔ قوم۔ شورابۂ زمزم۔ عجیب عجیب استہزا کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ایک طنز بھی شامل ہے۔ کسی جگہ مخاطب کو حماقت کا احساس کر کے اسپر استہزا کیا جاتا ہے جیسے اکبر کا یہ شعر۔

بڈھو میاں بھی خیر سے گاندھی کے ساتھ ہیں — گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

کہیں استہزا اظہار واقعات کی صورت میں کیا جاتا ہے جیسے ریاض صاحب کہتے ہیں

جناب شیخ نے پی اور منھ بنا کے کہا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

بیخود دہلوی — پی کے زاہد نے مئے ناب یہ ارشاد کیا — اس کا انگور کے شربت میں مزا ملتا ہے

کامگار خاں پسر دوم عمدۃ الملک جعفر خاں وزیر اعظم بادشاہ عالمگیر ایک سادہ مزاج آدمی تھے انھوں نے جب حیدرآباد فتح ہوا تو ابوالحسن تانا شاہ والی سابق دکن کے وزیر ناکتخدا لڑکی کے ساتھ شادی کی نعمت خاں عالی نے استہزا کے طریق پر ایک قصیدہ لکھا جس کے ہر ہر لفظ سے استہزا ٹپکتا ہے۔

عرفی اور فیضی میں کچھ چشمک ہوگئی تھی اسپر طرہ یہ ہوا کہ عرفی سے کسی ستم ظریف نے یہ کہدیا کہ عرفی تم کو اپنا شاگرد بتاتا ہے اسی واقعہ پر عرفی نے یہ رباعی کہی اور فیضی کا تمسخر کیا۔

اخوند من اند کے زانصاف کجاست — گر در تو بسے ہست مئے صاف کجاست

این بے ادباں ازتو سوائے دارند — عنقائے فضیلت ترا قاف کجاست

انشاء اللہ خاں انشا نے ایک مکان پر یہ تاریخ لکھی ہوئی دیکھی ؎

حویلی علی نقی خان بہادر کی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر کی دوکان محض ایمانداری کیوجہ سے مشہور ہے

چونکہ یہ مصرع موزوں نہ تھا لہذا تمسخر کے طریقہ پر آپ نے اس کو دوبیتی ۔ یا رباعی کی صورت میں کر دیا اور کہا ؎

تال کی نہ سم کی نہ سُر کی فارسی نہ عربی نہ ترکی

تاریخ کہی ہوئی ہے یہ کیسی لڑکی حویلی علی نقی خاں بہادر کی

ایک شاعر نے اتفاق سے بجائے اجناس کے اجنا نظم کر دیا یعنی سین گر گیا انشا یہ واقعہ بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں

اجناس کے موقعہ پہ اجنا آیا سلمائے علوم کا یہ سجنا آیا ؟

اجنا چیزے ست کاں برویند زمیں ہو تخم لغت کا تو اپجنا آیا ؟

دوسری رباعی دیکھئے وہ بھی اسی رنگ میں ہے ۔

دستا لغت تھیں نہ سمجھا آیا اجناس میں کو دکیونکر اجنا آیا ؟

اجنا کوئی ڈھول والہ ہوگا اسکا کاغذ میں کہاں سے ڈھول بجنا آیا

اسی قسم کی اور کئی رباعیاں انھوں نے کہی ہیں جنمیں بچارے غلطی کرنے والے کو خوب خوب بنایا ہے تمسخر جس سے کسی کو بنایا جاتا ہے کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اپنا عجز بیان کیا جائے اور دوسرے کو اپنی حرکات یا اقوال سے برتر ثابت کیا جائے ۔ مگر در اصل اس شخص کو بیوقوف بنانے کا ارادہ کیا جاتا ہے جیسے انشاء اللہ خان انشا ایک جگہ کہتے ہیں :-

خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا جب اسنے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

سلام کرنا ایک ایسی حرکت ہے جو بظاہر اپنے آپ کو عاجز اور دوسرے کو برتر ثابت کرتی ہے مگر در اصل گالی دینے والے کو اس صورت سے بنایا گیا ہے ۔ یا یہ شعر بالکل اسی انداز کا ہے

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں تم میں دو وصف ہیں بدخو بھی جفا کار بھی ہو

کبھی تمسخر اور استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ اپنے کو مہمل طریقوں سے بدتر ثابت کیا جاتا ہے اور اس سے نتیجہ یہ مرتب کیا جاتا ہے کہ دوسرے کو ذلیل ثابت کیا جائے ۔ اور آوازہ کی سی ایک صورت پیدا کر دی جائے جیسا کہ جعفر زٹلی نے اپنے کسی حریف کو یہ مثنوی کہکر بنایا ہے

من آں رستم وقت رو ئیں تنم کہ وہ پا پڑ از مشت خود بشکنم

یہ پوری مثنوی تیس چالیس شعروں کی ان کے کلیات میں موجود ہے ۔

پھبتی طنز کی یہ بھی ایک قسم ہے ۔ جلال مرحوم سرمایۂ زبان میں اس کے معنی صرف تشبیہ کے لکھتے ہیں ۔ غالب مرحوم بھی تشبیہ اور پھبتی میں کوئی فرق نہیں کرتے مگر در اصل یہ ایک غلطی ہے پھبتی کوئی تشبیہ نہیں ہے بلکہ استعارہ ہے جس کی

ہمارے مبحث کے موافق یہ تعریف کیجاسکتی ہو کہ کسی کو دیکھکر اس کے حسب حال دفعتاً کوئی چبھتا ہوا مختصر فقرہ کہنا جو اسپر پھب جائے یعنی کسی شخص کو کوئی دوسری چیز فرض کرلیا جائے اور مستعار لہ سے مستعار منہ ہمیشہ بدتر ہو اور جس چیز سے استعارہ کیا جائے اس کی بدتری کی وجہ سے وہ شخص جسپر پھبتی کہی گئی ہے بدتر معلوم ہونے لگے۔

جس استعارہ میں ظرافت اور ہجو کا جزو غالب ہو اسی کو پھبتی کہا جائے گا۔ پھبتی کی اقسام مختلف ہیں کبھی پھبتی کسی شخص کی ذات پر کہی جاتی ہے اور کبھی اس سے صفات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا جملہ اس شخص کے اکثر حالات کا ایک آئینہ ہوجاتا ہے جسمیں دھندلی دھندلی بہت سی تصویریں نظر آتی ہیں ایسی پھبتی کو تشبیہ تام کے درجہ پر رکھا جائے گا۔ مثال کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔

اشرف علی خان فغاں، ناگرمل دیوان تن پراکو جوان کی معاصر اور امرائے شاہی میں سے تھے (گھی کی منڈی کا سانڈ) کہتے تھے اس پھبتی کے سنتے ہی ناگرمل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ ناگرمل ایک کھیت اور عقل و خرد سے بے بہرہ انسان ہے' اسی طرح حکیم معصوم اشرف علی خان فغان کے معاصر تھے چونکہ غریب تھے کچھ ظاہری نمائش نہیں تھی' ایک بھولے بھالے فربہ جسم کے آدمی تھے' فغاں نے انپر "گاؤ گجراتی" کی پھبتی کہی۔

رشید الدین ایران کا ایک نہایت مشہور و معروف شاعر گزرا ہے۔ اتفاق سے وہ پستہ قد اور حقیر تھا خاقانی یا اور کسی بڑے آدمی نے اسپر (وطواط) کی پھبتی کہی وطواط ایک بہت چھوٹا سا پرند ہوتا ہے مگر اس کی زیرکی مشہور ہے۔ یہ پھبتی کچھ ایسے مبارک وقت میں کہی گئی تھی کہ رشید الدین کے ساتھ لفظ وطواط ہمیشہ کے لئے شامل ہوگیا۔ اور آج تک رشید الدین وطواط نہ کہا جائے کوئی رشید کو سمجھ نہیں سکتا۔

ایک رئیس نے نگن نامی طوائف کو اسوقت ملازم رکھا جب وہ صحیح طریقہ سے سن شعور کو بھی نہ پہونچی تھی' ایک دوست نے رئیس صاحب سے کہا کہ ابھی تو یہ پوری نگن بھی نہیں ہوئی۔ "ادھا نگن" ہیں، نوکر رکھنے سے فائدہ۔ یہ پھبتی اس قدر مقبول ہوئی کہ آج نگن ہر جگہ ادھا نگن ہی کے نام سے مشہور ہے۔ کبھی کبھی پھبتی سے صرف وصف خاص پر روشنی پڑتی ہے شیخ شرف الدین مضمون کے دانت گرگئے تھے اس لئے خان آرزو اُن کے استاد نے ایک مرتبہ انپر (شاعر بیدانہ) کی پھبتی کہی

خدمت گار خان ایک خوجہ تھا اُن سے اور آبرو سے کچھ چشمک ہوگئی تھی اس لئے آبرو نے یہ شعر کہکر پھبتی کہی ؎

یارو خدمتگار خاں خوجوں کے بیچ　　　ہے تو منتشی ولیکن منقطع

بقا نے شیخ چلہ نشین پر یہ قطعہ کہکر پھبتی کہی۔

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے　　　چلے بیٹھے تو شیخ چلی ہے

داغ مرحوم ایک سیاہ رنگ چیچک رو آدمی تھے جب رامپور میں تشریف لائے اور اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو لوگوں نے مشکی کی پھبتی انپر کہی

شیخ ناسخ ایک بسیار خوار پہلوان آدمی تھے آزاد نے لکھا ہے کہ لوگ ان پر دم کٹا بھینسا کی پھبتی کہتے تھے۔

چنان لکھنؤ کے ایک ظریف شاعر تھے اپنے رقیب کو وصل معشوق سے کامیاب دیکھکر پھبتی کہتے ہیں

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت　　زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

سجاد حسین مرحوم اپنی تصنیف احمق الذین میں نواب احمق الذین پر اسوقت جب مس اسمتہ نے ان پر نالش کی اور وہ قطعاً مفلس ہوگئے نواب تحت اللفظ کی پھبتی کہی۔

ایک ریاست کے دیوان پر جو مرد متشرع مگر نہایت خشک آدمی تھے ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین نے (حاریابس) پھبتی کہی۔ اسی طرح احمق الذین نے اس جگہ جہاں بھولے نواب نے اپیل کرنی چاہی ہے اور قاضی صاحب نے منظور نہیں کی اور یہ دہاں سے ناکام پلٹے تو ان پر (دعائے مستجاب) کی پھبتی کہی ہے۔

حاجی بغلول کی ریش مبارک نوکدار مگر اجڑی ہوئی سی تھی لہذا اس پر (پرانی کوچی) کی پھبتی کہی گئی۔ اسیطرح حاجی بغلول کے رونے اور قطرات اشک کے آنکھوں سے نکلنے پر پھبتی کہی گئی کہ "تمبا کو پنڈے پر لگی ہوئی کوڑیوں سے شیرہ بہا" لمبی لمبی سانسیں لینے سے جو حاجی بغلول کا پیٹ پھولتا تھا اُسپر (لہار کی کھال) کی پھبتی کہی گئی۔ حاجی بغلول کے ایک جگہ فرش پر ڈھیر ہوگئے تو پھبتی کہی کہ (چھاپے کی روشنائی سل پر پھیل گئی) ۔حاجی بغلول چلتے چلتے ایک جگہ گر کر بیہوش ہوگئے ہیں ان کے مصاحب خاص حمرقہ ریوڑی پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں پر اڈیٹر اودھ پنچ نے پھبتی کہی ہے مری بھینس کے قریب چمر گد۔

ایک بیرسٹر صاحب ضعیف ہوکر دہرے ہوگئے تھے، اُن پر ایڈیٹر اودھ پنچ نے خط منحنی کی پھبتی کہی۔ حاجی بغلول کے تیز چلنے پر پھبتی کہی کہ (ڈھیکلی کرتے ہوئے جارہے تھے) اسیطرح میں ایک مرتبہ بازار میں جارہا تھا دیکھا کہ ایک لنگڑے بنگالی بابو بہت تیزی سے تشریف لیجارہے ہیں میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے انھوں نے بابو صاحب کی چال پر یہ پھبتی کہی کہ (باؤن سے ٹائپ کرتے جارہے ہیں) ایک جگہ حاجی بغلول کی ہچکی بندھ گئی سجاد حسین مرحوم نے اس کو (سینہ میں ڈھیکلی چلنے لگی) کہا

لکھنؤ کے شاعر مرحوم جو نہایت ہی کریہ المنظر سیہ فام بدہئیت شخص تھے ایک مرتبہ ایک بچہ کو کھلا رہے تھے خود لیٹے ہوئے تھے اور بچہ کو سینہ پر بٹھا رکھا تھا ان کے ایک دوست نے پھبتی کہی۔ (نور وز سور پر سوار ہے) ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اپنی تصنیف خدائی فوجدار میں لکھتے ہیں کہ خدائی فوجدار کا گھوڑا چونکہ بہت دبلا تھا لوگ اسپر پھبتیاں کہتے تھے ابے ٹھئے لگوائے تو چلے، بھئی واہ رے نکھار کیا گھوڑا اپنایا ہے) خدائی فوجدار کی صورت دیکھکر ایک نے پھبتی کہی (قبر کی پہلی منزل سے بھلے گئے ہیں)

تہ خانے کا راز

(افسانہ)

شرلاک ہومز دیر سے خوردبین پر جھکا ہوا تھا۔ اب اُسنے سیدھے ہوکر میری طرف دیکھا۔

—"واٹسن یہ گوند ہے" بلا شبہ یہ گوند ہے۔ ذرا تم بھی ان ریزوں کو دیکھو" میں خوردبین پر جھکا اور اپنی نظر کی مناسبت سے اسے ترتیب دیا۔

—"یہ جو بال ہیں یہ ایک اونی کوٹ کے تار ہیں، بھورے بھورے ڈلے مٹی کے ہیں، اور درمیان میں جو زرد ذرے پڑے ہیں وہ یقیناً گوند کے ہیں"

—"خیر میں آپ کے دعوے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کیا کسی مسئلہ کا انحصار اسپر ہے؟"

—"یہ بہت اچھا ثبوت ہے تمھیں یاد ہوگا کہ سینٹ پینکرا والی واردات میں ایک ٹوپی مقتول سپاہی کے قریب سے ملی تھی۔ ملزم نے انکار کیا تھا کہ وہ اس کی نہیں ہے لیکن وہ تصویروں پر فریم چڑھانے والا ہے اور اسے اکثر گوند سے کام پڑتا ہے"

—"کیا تم اس معاملے کی تفتیش کررہے ہو؟"

"نہیں بلکہ میرے دوست میری ویل نے جو پولس کا ملازم اور میرا دوست ہے مجھ سے اس معاملے میں مدد چاہی ہے جب سے میں نے اس سکے بنانے والے کو تانبے کے ان ذرات کے ذریعے سے جو اس کے کف کی سیون میں پائے گئے تھے پکڑا ہے، تب سے پولیس والے خوردبین کی قدروقیمت سے واقف ہوگئے ہیں" یہ کہکر اُس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا "مجھے ایک شخص کے آنے کی امید تھی مگر اس کا وقت گزر گیا ہے اور واٹسن تمھیں گھوڑدوڑ کی بابت کچھ معلوم ہے؟"

—"ہونا تو چاہیئے۔ میری پنشن کا نصف حصہ جو مجھے زخمی ہونے کی وجہ سے ملتی ہے گھوڑدوڑ ہی میں صرف کرتا ہوں"

—"سر رابرٹ نار برٹن کا نام کوئی یاد تمھارے دل میں تازہ کرتا ہے"

—"ضرور کرتا ہے۔ وہ شاسکمب کے محل میں رہتے ہیں اور میں اس جگہ کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں موسم گرما میں وہاں ٹھیرا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو سر رابرٹ قریب قریب قانونی حدود میں پھنس گئے تھے"

—"وہ کیونکر؟"

—"وہ یوں کہ ایک مرتبہ انھوں نے سام بروور کرزن اسٹریٹ کے مشہور ساہوکار کو خوب زدوکوب کیا اور قریب الموت کردیا"

—"خوب خوب۔ کیا وہ اکثر اسی قسم کا شوق فرماتے رہتے ہیں"

—"اسمیں شک نہیں کہ وہ ایک مخدوش آدمی ہیں۔ انگلستان بھر میں سب سے بیخوف دوڑ کھیلنے والے ہیں چند سال گزرے ان کا گھوڑا گرانڈ انٹرنیشنل میں دوسرے نمبر پر

آیا تھا وہ ان آدمیوں میں سے ہیں جو اپنے حسب حال زمانہ گزر جانے کے بعد پیدا ہوئے۔ اگر وہ انیسویں صدی کے شروع میں جب جارج چہارم اپنے باپ کے بجائے حکومت کرتا تھا پیدا ہوتے تو خوب بنتی کیونکہ وہ بڑے ماہر گھونسے باز، پہلوان، دوڑ کھیلنے والے اور عاشق مزاج آدمی ہیں۔ یہ بھی ہر جگہ افواہ ہے کہ وہ قرض کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ نکلنا مشکل ہے"

"اچھا اب تم ذرا شاسکمب کے محل کا نقشہ تو بتاؤ"

—"محل باغ کے درمیان واقع ہے اور اس کے مشہور اصطبل وغیرہ بھی وہیں ہیں"

—"اور دارو غہ اصطبل غالباً مسٹر جان میسن ہیں میری اس واقفیت پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ خط جسکو میں کھول رہا ہوں انھیں کا بھیجا ہوا ہے۔ شاسکمب کے بارے میں کچھ اور بتاؤ"

— شاسکمب کے مشہور کتے ہیں۔ کتوں کی نمائش میں تم نے بھی ان کا تذکرہ سنا ہوگا۔ انگلستان میں خالص ترین نسل ہے اور شاسکمب کے محل کی مالکہ بجا طور پر اس پر فخر کرتی ہے"

— "شاسکمب کے محل کی مالکہ سر رابرٹ نار برٹن کی بیوی ہوگی"

"سر رابرٹ نے کبھی شادی نہیں کی اور یہ اچھا ہوا کیونکہ انکی موجودہ مالی حالت اچھی نہیں۔ وہ اپنی بیوہ بہن لیڈی فار لڈر کے پاس رہتے ہیں"

"یعنی انکی بیوہ بہن لیڈی فالڈر ان کے پاس رہتی ہیں؟"

نہیں وہ محل ان کے شوہر مرحوم سر جیمس کا ہے اور نار برٹن کا اسپر کوئی حق نہیں ہے۔ لیڈی نارلڈر تا عین حیات اسپر قابض ہیں۔ بعدہٗ وہ سر جیمس کے بھائی کو ملیگا۔ فی الحال جائداد کی کل آمدنی لیڈی فالڈر کو ملتی ہے" "اور غالباً رابرٹ اس آمدنی کو خرچ کرتے ہونگے"

"ہاں قریب قریب یہی بات ہے۔ رابرٹ بڑے حضرت ہیں۔ اور ان کی بہن کی جان ان کے ہاتوں ضرور ضیق میں ہوگی میں نے سنا ہے کہ لیڈی فالڈر کو ان سے بہت محبت ہے۔ لیکن آخر شاسکمب میں غیر معمولی بات کیا ہے"

—"یہی میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ آدمی جو ہمیں بتا سکتا ہے آرہا ہے"

اتنے ہی میں دروازہ کھلا اور ملازم نے ایک طویل قامت آدمی کو داخل کیا جس کی داڑھی مونچھ صاف تھیں اور جس کے چہرے سے ایسا استقلال اور سکون ٹپکتا تھا جو صرف سائیسوں و گھوڑوں کی نگہداشت کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جان میسن گھوڑوں اور سائیسوں کی کافی تعداد اپنے زیر حکومت رکھتا تھا اور وہ اس فرض کی انجام دہی کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سلام کیا۔ ہومر نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا

"مسٹر ہومر آپ کو میرا رقعہ مل گیا تھا؟"

"جی ہاں مگر اوس سے کسی بات کی تشریح نہ ہوتی تھی"

معاملے کی نزاکت ہی اس بات کی متقاضی تھی کہ معرض تحریر میں نہ لایا جائے میں اُسے زبانی ہی بیان کر سکتا ہوں"

ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں"

"مسٹر ہومز سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے مالک سر رابرٹ پاگل ہو گئے ہیں" ہومر نے تیوری چڑھائی "جناب

یہ تو بیکر سٹریٹ ہے اور پاگل خانہ ہارلے اسٹریٹ میں ہے مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں"

—— جب کوئی آدمی ایک یا دو عجیب حرکتیں کرے تو خیر اس کے لئے کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب اس کا ہر فعل عجیب ہو تو دیوانہ پن کا گمان کیوں نہو۔ میرا خیال ہے کہ ڈربی کی گھوڑ دوڑ اور شاسکمب پرنس کے خیال نے انکا دماغ خراب کر دیا ہے"

—— "شاسکمب پرنس اس گھوڑے کا نام ہے جو آپ کی طرف سے دوڑ رہا ہے؟"

—— "مسٹر ہومز یہ انگلستان کا بہترین گھوڑا ہے۔ اگر کسی کو اس بات کا علم ہے تو مجھکو ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بیان کر دونگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ معتبر آدمی ہیں اور یہ باتیں ہم ہی تک محدود رہیں گی۔ سر رابرٹ کو ڈربی کی یہ دوڑ ضرور جیتنی چاہئے۔ پانی ان کے گلے گلے ہے اور یہی ان کا آخری موقع ہے۔ وہ جو کچھ قرض لیتے ہیں اسی گھوڑے پر لیتے ہیں اور آج کل بازی بھی اس گھوڑے کی زبردست ہے۔ لوگ ایک ایک کے چالیس دینے کے لئے تیار ہیں اور جب اسے داخل کر کے بازی لگانی شروع کی تھی تو ایک ایک کے سو سو تھے۔"

—"لیکن اگر گھوڑا اس قدر اچھا ہے تو ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟"

"عوام کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کیسا عمدہ گھوڑا ہے۔ سر رابرٹ عام لوگوں سے بہت چالاک ہیں۔ وہ اس گھوڑے کے بھائی کو سلانے کے لئے نکالتے ہیں اور ان دونوں میں بالکل فرق نہیں ہے۔ شناخت ناممکن ہے۔ لیکن صرف ایک فرلانگ کی دوڑ میں "پرنس" اسے دو بانس سے مار سکتا ہے۔ آج کل سر رابرٹ کو گھوڑے اور دوڑ کے سوا کسی بات کا خیال نہیں ہے انکی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ دوڑ کے وقت تک سر رابرٹ نے قرضخواہ مہاجنوں کو روک رکھا ہے۔ اگر پرنس ہار گیا تو خیر نہیں ہے"

—— "اس میں شک نہیں کہ نہایت بیباکانہ بازی لگ رہی ہے مگر اس میں پاگل پن کا کیا ذکر؟"

—— "سب سے پہلے ان کی صورت۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ رات کو سوتے ہیں۔ وہ وقت بے وقت اصطبل میں موجود رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حواس خراب ہو گئے ہیں۔ پھر ان کا برتاؤ لیڈی فالڈر کے ساتھ"

—— "وہ کیسا ہے؟"

—— "ہمیشہ سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ دونوں ایک ہی مذاق کے تھے اور لیڈی فالڈر بھی گھوڑوں سے ایسی ہی محبت کرتی تھیں جیسی کہ رابرٹ۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی وقت گھوڑوں کو دیکھنے گاڑی میں سوار ہو کر آتی تھیں اور سب سے زیادہ محبت انہیں "پرنس" سے تھی۔ سڑک پر انکی گاڑی کے پہیوں کی آواز سنکر پرنس کے بھی کان کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ روزانہ خود جاکر ان کے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ چیز کھاتا تھا۔ مگر اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں"

—— "کیوں"

—— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گھوڑوں سے دلچسپی ہی نہیں رہی ایک ہفتہ سے وہ روزانہ اصطبل کے سامنے سے گاڑی میں گزرتی ہیں مگر بات تک نہیں پوچھتیں"

—— "آپ کا خیال ہے کہ باہمی نزاع ہو گیا ہے"

—— "اور نزاع بھی نہایت شدید اور تلخ۔ ورنہ وہ لیڈی فالڈر کے پالتو کو جسے وہ اپنے بچے کی طرح عزیز رکھتی تھیں کیوں الگ کرتے چند روز ہوئے انھوں نے وہ کتا بارنس کو دیدیا جو گرین ڈریگن نامی سرائے کا مالک ہے۔"

—— "یہ بات یقیناً عجیب معلوم ہوتی ہے"

—— "یہ صحیح ہے کہ مرض استسقا اور کمزوری قلب میں مبتلا ہوتے ہوئے لیڈی فالڈر سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ عرصہ تک نباہ سکیں گی۔ لیکن اس سے قبل دونوں روز شام کو دو گھنٹے باہم صرف کرتے تھے اور وہ ان کی بہترین رفیق ثابت ہوئی تھیں لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اب وہ ان کے پاس بھی نہیں جاتے اور لیڈی فالڈر کچھ متفکر اور پریشان سی رہتی ہیں غم غلط کرنے کے لئے اب وہ شراب پینے لگی ہیں۔"

—— "کیا اس رنجش اور کشیدگی سے پہلے بھی وہ پیتی تھیں ؟"

"ہاں لیکن بہت قلیل مقدار میں۔ مگر اب تو روزانہ ایک بوتل خالی ہوتی ہے۔ یہ مجھے بٹلر سے معلوم ہوا یعنی صورت حال ہی بدل گئی ہے اور کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ اس کے علاوہ آخر وہ رات کو گرجا کے تہ خانے میں کیا کیا تے رہتے ہیں ؟ اور وہ کون آدمی ہے جو ان سے رات کو وہاں ملتا ہے ؟"

—— "ہومز نے اضطراب سے ہاتھ ملنے شروع کئے"

—— "مسٹر مین آپ کہے جائے۔ آپ کا بیان دلچسپ ہوتا جا رہا ہے"

بٹلر نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا۔ رات کا وقت تھا اور سخت بارش ہو رہی تھی۔ پچھلی رات کو میں بھی مکان پر بیدار رہا اور سر رابرٹ کو میں نے جاتے دیکھا۔ بٹلر اور میں ان کے پیچھے چلے۔ مگر یہ حرکت بھی خطرناک کیونکہ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو کہیں ٹھکانا ہی نہ تھا وہ گھونسہ بازی کے لحاظ سے مخدوش آدمی ہیں اس لئے ہم قریب جاتے ہوئے تو گھبرائے مگر ہم نے ان کو نگاہ میں رکھا۔ وہ تہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ اور ایک آدمی وہاں انکا انتظار کر رہا تھا۔"

—— "یہ تہ خانہ کیا بلا ہے ؟"

"باغ میں ایک پرانا منہدم گرجا ہے۔ وہ اتنا پرانا ہے کہ آج تک کوئی اس کے زمانۂ تعمیر کا یقین نہیں کر سکا اس گرجا کے نیچے تہ خانہ ہے۔ ہم لوگ اس میں آسیب کا خیال کرتے ہیں۔ یہ تہ خانہ دن میں بھی بیحد تاریک اور سنسان رہتا ہے اور ایسا آدمی جو رات کو اس کے قریب جانے کی ہمت کر سکے اس نواح میں شاید ہی کوئی ہو۔ لیکن سر رابرٹ بالکل بیخوف آدمی ہیں انھوں نے اپنی تمام عمر میں کسی شے سے خوف نہیں کیا۔ لیکن وہ رات کو وہاں کیا کیا کرتے ہیں ؟"

"ذرا صبر کیجیے آپ نے کہا تھا کہ وہاں ایک آدمی اور بھی آتا ہے۔ وہ ضرور ملازمین یا اہل خانہ میں سے ہوگا پس آپ اس کو شناخت کر کے اس سے دریافت کیجئے"

—— "میرے صورت آشناؤں میں سے تو وہ کوئی ہے نہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟"

کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ دوسری شب کا واقعہ ہے سر رابرٹ واپس ہو کر میرے اور بٹلر کے قریب سے نکلے چلے گئے۔ ہم دونوں خرگوش کی طرح جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے کیونکہ چاند نکلا ہوا تھا ہمنے دوسرے آدمی کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھا اس سے ہمیں بالکل خوف نہ تھا۔ اس لئے جب سر رابرٹ چلے گئے تو ہم اٹھے

اور سیدھے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے گویا ہم چاندنی میں چہل قدمی کر رہے تھے اور اتفاق سے اسے مل گئے تھے۔ میں نے فوراً آواز دی اور نام پوچھا اس نے ہمیں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا پس آواز سنتے ہی اسنے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گویا اس نے دوزخ سے نکلتے ہوئے شیطان کو دیکھ لیا ہے وہ چلایا اور بھاگا وہ خوب بھاگ سکتا تھا۔ ایک منٹ میں وہ نظروں سے غائب ہوگیا اور ہمیں یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کون تھا"

— "لیکن آپ نے اسے چاندنی میں بخوبی دیکھا؟"

— "ہاں میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ زرد رنگ کا آدمی تھا اور ذلت اس کے چہرے سے عیاں تھی"

— "ہومز کچھ دیر تک خیال میں محو بیٹھا رہا۔ لیڈی فالڈر کے ساتھ کون رہتا ہے؟" اس نے دریافت کیا

— "ان کی ملازمہ کیری الونس ہے جو پانچ سال سے ان کے پاس ہے؟"

— اور اس میں بھی شک نہیں کہ بہت مانوس ہے؟"

— "مسٹر میسن نے ذرا گھبرا کر کہا "ہاں وہ مانوس تو ضرور ہے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مانوس ہے!"

— "اچھا!"

— "میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"

— "مسٹر میسن میں خوب سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر واٹسن نے جو تصویر سر رابرٹ کی پیش کی ہے اس سے میں سمجھ سکتا ہوں کہ کوئی عورت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بھائی بہن کا نزاع اسی بنا پر ہوا ہو تمہارا کیا خیال ہے؟"

— "مگر یہ معاملہ تو مدت سے طشت از بام ہے"

— ممکن ہے کہ لیڈی فالڈر کو پہلے سے اس کا علم نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ انہیں یہ ابھی معلوم ہوا ہے۔ اور وہ خادمہ کو علٰحدہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے بھائی اس کی اجازت نہیں دیتے اور وہ اپنے کمزوری قلب کے مرض اور خرابی صحت کی وجہ سے اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتیں اور اسوجہ سے وہ قابل نفرین خادمہ ہنوز ان کے ساتھ ہے۔ انھوں نے بولنا ترک کر دیا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے شراب پینی شروع کر دی ہے۔ کیا یہ تمام مفروضہ باتیں معقول اور ممکنات سے نہیں ہیں؟"

— "ہاں ہیں تو ٹھیک مگر صرف وہیں تک جہاں تک انکا تعلق ہے"

— یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے رات کو تہ خانے کی آمد و رفت سے ان کا تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو ہم اس ضمن میں نہیں لا سکتے"

— ہرگز نہیں اور جناب اس کے علاوہ ایک اور بھی بات ہے جو اس ضمن میں نہیں آتی وہ یہ کہ آخر سر رابرٹ کو مردے کی ہڈیاں کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہومز چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

— "یہ میں نے کل ہی معلوم کیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینے کے بعد کل سر رابرٹ لندن چلے گئے تھے۔ بس میں بٹلر کے تہ خانے میں گیا۔ کوئی بات غیر معمولی نہ تھی لیکن ایک گوشہ میں آدمی کی ایک لاش تھی"

— "میں خیال کرتا ہوں کہ آپ نے پولس کو اطلاع دیدی ہوگی"

ہمارا مہمان یہ سنکر ہنسا۔

"جناب میں نے یہ خیال کیا کہ معاملہ پولس کے لئے چنداں دلچسپ ثابت نہ ہوگا۔ ایک بوسیدہ نعش کی چند ہڈیوں اور کھوپری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لاش ایک ہزار سال پرانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس سے قبل یہ نعش وہاں نہ تھی اس بات کی میں قسم کھا سکتا ہوں اور بٹلر بھی۔ ہڈیاں ایک کونے میں رکھکر تختے سے ڈھک دی گئیں تھیں لیکن پہلے وہ کونا بالکل خالی تھا۔"

—"آپ نے ان ہڈیوں کا کیا کیا؟"

"ہمنے تو انھیں وہیں چھوڑ دیا"

—"بہت ہی اچھا کیا۔ اور آپ نے کہا تھا کہ سر رابرٹ باہر گئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ واپس آگئے؟"

"امید ہے کہ آج واپس آئیں گے"

—"سر رابرٹ نے اپنی بہن کا کتا بارنس کو کب دیا تھا؟"

"آج پورا ایک ہفتہ ہوا وہ مکان کے باہر کھڑا بھونک رہا تھا اور اس روز سر رابرٹ غصے میں تھے۔ انھوں نے پکڑکر ملازم کو دیدیا اور حکم دیا کہ "اسے بارنس کو دے آؤ کیونکہ اب میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا"

ہومز کچھ دیر خیالات میں غرق خاموش بیٹھا رہا اس نے اپنا پرانا پائپ سلگا لیا تھا۔

"مسٹر میسن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ مجھ سے اس معاملے میں کیا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس سے زیادہ تشریح نہیں کرسکتے؟"

—"شاید اس سے کچھ اور تشریح ہو سکے" ہمارے مہمان نے کہا اور یہ کہکر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور احتیاط سے اُسے کھول کر ہڈی کا ایک جلا ہوا ٹکڑا دکھایا۔ ہومز نے اسے بڑے غور سے ملاحظہ کیا۔

—"یہ آپ کو کہاں سے ملی ہے؟"

—"لیڈی فالڈر کے کمرے کے نیچے کوٹھری میں ایک آتشدان ہے وہ مدت سے سرد تھا۔ لیکن سر رابرٹ نے سردی کی شکایت کی اور اسے روشن کرالیا۔ میرا لڑکا ہاروے اس کی دیکھ بھال رکھتا ہے آج صبح وہ میرے پاس اس ہڈی کو لایا جو اسے راکھ اٹھاتے وقت ملی اسے دیکھکر وہ بہت گھبرایا"

—"اور میں بھی بہت گھبراتا ہوں" ہومز نے کہا "ڈاکٹر واٹسن اس کی بابت تمھاری کیا رائے ہے؟" ہڈی جلکر سیاہ ہو چکی تھی لیکن اس کی شناخت میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔

"یہ آدمی کے گھٹنے کی ہڈی ہے" میں نے کہا۔

—"ٹھیک ہے" ہومز نے کہا "تمھارا لڑکا آتشدان میں کوئلہ وغیرہ کس وقت ڈالتا ہے؟"

—"شام کو۔ اور پھر چلا آتا ہے"

—"تو گویا رات کو وہاں ہر شخص آ سکتا ہے؟"

—"ہاں"

—"کیا تم باہر سے جا سکتے ہو"

"ہاں ایک دروازہ باہر سے ہے اور دوسرا وہ ہے جو زینہ چڑھنے کے بعد لیڈی فالڈر کے کمرے کے راستے میں مل جاتا ہے"

—"سر رابرٹ کل مکان پر نہ تھے؟"

—"جی نہیں"

— تو یہ بڑی سر رابرٹ نے نہیں بلکہ کسی اور آدمی نے جلائی ؟"

— "ظاہر ہے"

— اس سرائے کا کیا نام ہے جس کا آپ نے ابھی تذکرہ کیا تھا؟"

— "گرین ڈریگن"

"برک شائر کے اس حصے میں مچھلی کا شکار کیسا ہے ؟"

سیدھے سادے مسٹر مین کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں ایک اور پاگل سے سابقہ پڑا ہے

"سنا تو ہے کہ پن چکی والی ندی میں سول اور شا سکمب کے باغ میں جو جھیل ہے اسمیں رہو پائے جاتے ہیں"

واٹسن اور میں بڑے مشہور شکاری ہیں۔ واٹسن! ہے نہ یہی بات آئندہ تم گرین ڈریگن کے پتے پر خط و کتابت کر سکتے ہو۔ ہم آج شبکو وہاں جائیں گے۔ یہ کہنا فضول ہے کہ وہاں ہم آپ سے ملنا نہیں چاہتے لیکن پرچے ہم تک پہنچ جائیں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ میں آپ کو تلاش کر لونگا۔ جب ہم معاملات کی گہرائی تک پہنچ جائینگے تو میں آپکو زیادہ پر وثوق رائے دے سکوں گا"

یہ تھے وہ واقعات جن کی بنا پر میں اور ہومز مئی کی ایک خوشگوار شام کیوقت ریل میں سفر کر رہے تھے اور ہماری جیب میں فرسٹ کلاس کے ٹکٹ شا سکمب اسٹیشن کے تھے جہاں پر معمولاً نہیں بلکہ اگر کوئی مسافر خواہش کرے توخصوصاً اس کے واسطے گاڑی ٹھرائی جاسکتی تھی۔ .... اوپر ریل کا تختہ بنسیوں۔ ٹوکریوں اور ڈونگی ریلوں سے بری طرح لدا ہوا تھا۔ منزل مقصود پر پہنچکر گاڑی میں سوار ہوئے اور تھوڑی دیر بعد ایک پرانی وضع کی سرائے کے مالک، جوشیا بارنس نے بڑے شوق سے ہمسے قرب وجوار کی مچھلیوں کو تباہ کرنے کے متعلق گفتگو کی۔

شا سکمب کے باغ میں جو جھیل ہے وہاں سے کوئی رہو ملنے کی بھی امید ہے یا نہیں ؟" ہومز نے پوچھا۔ سرائے والے کا چہرہ اداس ہوگیا" جناب وہاں گزر نہیں ہے قبل اس کے کہ آپ جھیل میں کوئی مچھلی پائیں آپ خود جھیل میں ہوں گے"

"یہ کیوں ؟"

— وکیا جناب نے سر رابرٹ کو کوئی معمولی آدمی خیال کیا ہے جناب وہ ان لوگوں کی تو فکر میں رہتے ہیں جو گھوڑوں کی خیر خبر لینے آتے ہیں اگر آپ دونوں صاحب اس کے اصطبل کے قریب پھٹکے تو وہ شیطان کی طرح آپ کے سر ہو جائینگے اس گھوڑ دوڑ میں نہوں تے لگی لپٹی تو رکھی ہی نہیں ہے"

— میں نے سنا ہے انھوں نے ڈربی کی دوڑ میں ایک گھوڑ اداخل کیا ہے ؟"

جی ہاں کیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے ہمارا تو سارا روپیہ اسی پر لگا ہوا ہے اور سر رابرٹ کا بھی۔ اور یہ تو بتائیے" اس نے ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا" میں خیال کرتا ہوں کہ آپ خود گھوڑ دوڑ میں حصہ نہیں لیتے ہیں ؟"

نہیں ہم تو لندن کے دو آدمی ہیں جو وہاں کی ابرآلود ہوا سے تنگ آکر برکشائر میں تبدیل آب وہوا کی غرض سے آئے ہیں"

اس لحاظ سے تو آپ بالکل ٹھیک جگہ آئے آب و ہوا یہاں اچھی ہے۔ لیکن سر رابرٹ کی بابت میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے

اس کا خیال رکھے گا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں جو ہاتھ پہلے چھوڑتے ہیں اور سوال بعد میں کرتے ہیں۔ باغ سے تو آپ بچے ہی رہیں"

— "مسٹر پارس اگر واقعی یہ بات ہے تو ہم ضرور اس کا خیال رکھیں گے۔ اوہو! یہ کتا جو ابھی ہال میں غرا رہا تھا بہت خوبصورت ہے — یقیناً وہ شاسکمب کی اصلی نسل کا کتا ہے۔ انگلستان بھر میں اس سے اچھا کتا نہیں ہے"

"میں خود بھی کتوں سے شوق رکھتا ہوں" ہومز نے کہا "اگر آپکو ناگوار نہو تو یہ کتا مجھے دیدیجئے اور جو قیمت مناسب ہو لے لیجئے"

"قیمت تو اس کی اتنی ہے کہ میں خود دے نہیں سکا۔ یہ تو مجھے سر رابرٹ نے عنایت کیا تھا۔ اسی وجہ سے میں اُسے بند کئے رکھتا ہوں اگر اسے کھولدوں تو منٹوں میں وہیں پہونچے"

"واٹسن ہمیں کھوج ملتا جا رہا ہے" ہومز نے سرائے والے کے جانے پر کہا "یہ کام کھیل نہیں ہے لیکن دو ایک روز میں ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ میں نے سنا ہے کہ سر رابرٹ ہنوز لندن میں ہے اس صورت میں ہم آج بلا خوف، جان ان کے مالک مقبوضہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دو چار باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مزید تصدیق کرنا چاہتا ہوں"

"ہومز کیا تم نے کوئی نظریہ قائم کر لیا ہے؟"

"واٹسن صرف یہ کہ پچھلے ہفتے میں کوئی واقعہ ہوا ہے جسنے شاسکمب کے باشندوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے وہ کیا واقعہ ہے اس کی بابت ہم صرف ان نتائج سے خیال کر سکتے ہیں جو رونما ہو رہے ہیں اور وہ نتائج کچھ عجیب طرح پر الجھے ہوئے ہیں۔ یہ الجھاؤ ہماری مدد کریگا۔ صرف وہی تفتیش ناکام رہتی ہے جو معمولی، سادی اور غیر دلچسپ ہو"

"اچھا جو مواد ہمارے پاس جمع ہے اس کا امتحان کریں۔ بھائی نے اپنی بہن کے پاس آنا جانا ترک کر دیا ہے اس کا پیارا کتا دوسرے کو دیدیا ہے! واٹسن کیا اس سے کچھ پتہ چلتا ہے؟"

— "سوائے بھائی کے غصے کے اور کیا معلوم ہو سکتا ہے؟"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ یا ممکن ہے کہ — خیر ایک دوسری صورت بھی ہے۔ اچھا صورت حالات پر ابتدائے مخاصمت سے اگر کوئی مخاصمت ہے۔ نظر ڈالنی چاہیئے۔ لیڈی فارلڈر اپنے کمرے میں رہتی ہیں، اپنا طریق عمل تبدیل کر دیا ہے سوائے اس کے کہ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھکر ٹہلنے جائیں انکو کوئی نہیں دیکھتا وہ اصطبل پر اپنے عزیز گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے کبھی نہیں رکتیں۔ اور ظاہر ہے کہ شراب پیتی ہیں یہی ہے سارے معاملے کی کیفیت"

— "سوائے تہ خانے والے معاملے کے"

"وہ علیحدہ بات ہے۔ دو پہلو ہیں اور میں تم سے درخواست کرونگا کہ دونوں کو آپس میں نہ ملاؤ پہلے سلسلۂ خیالات سے جسکا تعلق لیڈی فارلڈر سے ہے بظاہر آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے"

"میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں"

"اچھا اب سلسلۂ دوم کو لیجئے جس کا تعلق سر رابرٹ سے ہے ڈربی کی دوڑ جیتنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ مہاجنوں کے پھندوں میں گرفتار ہیں اور ان کے ہاتھوں غیر محفوظ۔ وہ چاہیں تو اسوقت قرقی کرا کر ان کے اصطبل پر قابض ہو جائیں۔ وہ بہت نڈر اور بیباک آدمی ہیں۔ ان کی گزر اوقات کا سہارا انکی بہن کی

اور انکی بہن کی خادمہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں تک تو ہم بالکل مطمئن ہیں نہ؟"

— "لیکن تہ خانہ؟"

"ہاں تہ خانہ۔ فرض کیجیئے۔ یہ بیہودہ قیاس صرف ضرورتاً ہے۔ کہ سر رابرٹ نے اپنی بہن کو ہلاک کر دیا ہے"

"ہومز یہ تو بہت بعید از قیاس بات ہے"

"ہاں بہت بعید کیونکہ سر رابرٹ ایک شریف خاندان کے رکن ہیں لیکن اصیل کبوتروں کے غول میں کبھی کبھی جنگلی بھی آملتا ہے اگر ہم اسی فرض کردہ دعوے کی بنا پر اپنی بحث قائم کریں تو ظاہر ہے کہ سر رابرٹ اس ملک سے اس وقت تک نہیں بھاگ سکتے جب تک کہ ان کی قسمت پلٹا نہ کھاجائے اور ان کی قسمت اسوقت پلٹا کھاسکتی ہے جب ان کا گھوڑا ساسکب پرنس جیت جائے اس لئے ان کو رہنا یہیں رہنا لازم ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شکار کی نعش کو پوشیدہ کرنے کا انتظام کریں اور کسی ایسی ہستی کو تلاش کریں جو لیڈی فالڈر کے روپ میں رہ خادمہ کے ہمراز ہوتے ہوئے یہ بات مشکل نہیں رہی نعش سو وہ تہ خانہ میں جہاں شاذ و نادر ہی کوئی آجاتا ہے بیجا کر پوشیدہ کی جاسکتی ہے اور وقتاً فوقتاً آتشدان میں سپرد آتش کیجاسکتی ہے ایسی نشانیاں جیسی کہ ایک اسوقت ہمارے پاس ہے اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

—"یہ تمام ممکنات میں سے ہیں اگر ابتدائی مہیب قیاس کو مان لیا جائے"

میرا خیال ہے کہ اس معاملے پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے کل ہمیں ایک معمولی سا تجربہ کرنا ہوگا۔ فی الحال اگر ہمیں اپنا یہ فریب قائم رکھنا ہے تو میرے خیال میں سرائے والے کو بلاکر اس سے شکاریوں کی طرح سول اور ردھو مچھلیوں کے بارے میں واقفکارانہ گفتگو کرنی چاہیئے۔ یہی اسکو دوست بنالینے کا سیدھا سادہ ذریعہ ہے۔ اور ممکن ہے کہ دوران گفتگو میں اس نواح کے متعلق کوئی مفید بات معلوم ہوجائے۔"

صبح اٹھکر ہومز نے یہ بہانہ تراشا کہ ہم غلطی سے مچھلیوں کے واسطے چارہ بھول آئے ہیں اس لیئے آج شکار ناممکن ہے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم سرائے سے چلے اور ہومز نے کتے کو اپنے ہمراہ لے چلنے کی اجازت لے لی

اُسنے ایک عالیشان باغ کے دو بلند دروازوں کے قریب پہنچکر کہا "یہ وہ مقام ہے جہاں سے دوپہر کے قریب لیڈی فالڈر کی گاڑی میں سوار ہوکر نکلتی ہیں جب وہ باہر آجائے اور قبل اس کے کہ تیزی سے روانہ ہو تم گاڑیبان سے کوئی سوال کرکے اسے روک لینا۔ میں اس جھاڑی کے پیچھے بیٹھکر دیکھوں گا کہ کیا ہوتا ہے۔"

ہمیں دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر ایک عمدہ زرد رنگ کی گاڑی آتی ہوئی نظر پڑی جسمیں دو خوبصورت مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ہومز مع اپنے کتے کے جھاڑی میں پیچھے چھپا رہا اور میں نہایت سادگی سے بید ہلاتا ہوا سڑک پر کھڑا رہا۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور دروازہ کو کھولا

گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور میں نے بہ آسانی

اسمیں بیٹھنے والوں کو دیکھا گدی پر بائیں طرف ایک گوری چٹی، بھورے بال والی شوخ چشم عورت بیٹھی تھی اور اس کے دائیں جانب کوئی اور کمر جھکائے شال سے سر اور شانے ڈھکے بیٹھا تھا۔ جو بظاہر مریض معلوم ہوتا تھا۔ جب گھوڑے شارعِ عام پر آگئے تو تومیں نے کافی مرعوب کن طریقے سے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ کوچوان نے باگ کھینچی تومیں نے اسے پوچھا کہ "سر رابرٹ نارکمب میں ہیں یا نہیں" ٹھیک اسی وقت ہومز جھاڑی سے نکلا اور کتے کی زنجیر کھولدی وہ خوش ہوکر غراتا، دم ہلاتا ہوا گاڑی کی طرف دوڑا اور پائدان پر چڑھ گیا دوسرے لمحے میں اس کی خوشی غصے سے بدل گئی اور گاڑی میں بیٹھنے والوں کی طرف بھونکتا ہوا جھپٹا۔

—"گاڑی ہانکو۔ گاڑی ہانکو!" ایک کرخت آواز نے کہا۔ کوچوان نے گھوڑوں کے ایک ہنٹر رسید کیا اور ہم سڑک پر کھڑے رہ گئے۔

"واٹسن اب سب کچھ ہوگیا" ہومز نے پرغضب کتے کے گلے میں زنجیر باندھتے ہوئے کہا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ وہ اسکی مالکہ تھی لیکن اس نے دیکھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے۔ کتے ایسے معاملات میں غلطی نہیں کیا کرتے۔"

"مگر وہ ایک آدمی کی آواز تھی!" میں نے کہا۔

"ہاں واٹسن ہمیں ایک اور راز معلوم ہوگیا ہے۔ تاہم بڑی احتیاط کی ضرورت ہے"

میرے دوست کو غالباً اس دن اور کچھ فکر نہ تھا۔ پن چکی والی ندی میں اپنی ڈوروں اور بنسیوں کو ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کے کھانے پر مچھلیوں کی بھی ایک قاب تھی۔ کھانے کے بعد ہومز نے پھر میدانِ عمل میں سرگرمی ظاہر کی۔ ہم پھر اسی صبح والی سڑک پر گامزن ہوئے باغ کے دروازے کے قریب ایک بلند بالا آدمی کوٹ میں لپٹا ہوا ہمارا منتظر تھا جو قریب پہونچنے پر ہمارا لندن والا مہمان مسٹر جان میسن داروغۂ اصطبل ثابت ہوا۔ معمولی رسم ملاقات کے بعد اس نے کہا کہ مجھے آپ کا رقعہ مل گیا تھا۔ سر رابرٹ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں لیکن سنا ہے کہ آج رات کو واپس آئینگے"

—"تہ خانہ مکان سے کتنی دور ہے؟" ہومز نے پوچھا

—"قریب دو فرلانگ کے ہے"

—"تو ہمیں سر رابرٹ کی طرف سے خوف نہ کرنا چاہیئے"

—"مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا۔ آتے ہی وہ مجھ سے ملنا چاہیں گے تاکہ پرنس کی بابت معلوم کریں"

—"اچھا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو ہم بلا آپ کے کام کریں گے۔ آپ ہمیں صرف تہ خانہ بتا کر واپس آجائے گا"

چاند آسمان پر نہ تھا اور بعید تاریکی تھی لیکن مسٹر میسن ہم کو گھاس سے ڈھکے ہوئے راستوں سے لے گئے تا آنکہ ایک تاریک تودہ ہمارے سامنے آیا جو پرانا گرجا تھا ہم اس ٹوٹے ہوئے حصے میں داخل ہوئے جو کسی زمانے میں گرجا کا برآمدہ ہوگا اور ہمارے رہنما منہدم عمارت کے ڈھیروں میں سے گرتے پڑتے ہمیں گرجا کے ایک گوشہ کی طرف لے گئے جہاں ایک زینہ تہ خانے میں اترتا تھا۔ دیا سلائی جلاکر انھوں نے اس سنسان جگہ کو روشن کیا جو نہایت منحوس اور پتھر کی پرانی دیواروں میں ریہہ لگ جانے کی وجہ سے بدبودار تھی پتھر اور سیسے کے تابوتوں کے انبار چھت تک لگے ہوئے تھے جو تاریکی میں ہمیں نظر نہ آتے تھے۔ ہومز نے اپنی لالٹین روشن کردی تھی

جسمیں سے زردی مائل روشنی کی ایک تیز شعاع اس المناک منظر پر پڑ رہی
تھی اس کی کرنیں تابوتوں کے ان مجلا کتبوں پر سے منعکس ہو رہی تھیں
جنپر اس معزز خاندان کے مخصوص نشانات کندہ تھے

"مسٹر مین آپ نے ہڈیوں کا تذکرہ کیا تھا۔ کیا آپ جانے سے
پہلے مجھے انھیں دکھا سکتے ہیں؟"

"وہ اس کونے میں ہیں" داروغہ صطبل آگے بڑھا اور پھر خاموش
تعجب میں کھڑا رہ گیا جب ہماری روشنی اس طرف پڑی اور اس نے
کہا" وہ تو غائب ہو گئیں!"

"یہی میرا بھی خیال تھا" ہومز نے مسکرا کر کہا۔ "میں خیال کرتا ہوں
کہ انکی راکھ اب بھی اس آتشدان میں مل سکتی ہے جسمیں کہ ان کا
ایک حصہ قطعاً ضائع ہو چکا ہے۔"

"مگر کسی کو کیا غرض پڑی تھی کہ کسی ایسے آدمی کی ہڈیاں جلاتا
جو ہزارہا سال پہلے مر چکا ہے؟" مسٹر مین نے پوچھا

"یہی معلوم کرنے تو ہم یہاں آئے ہیں" ہومز نے کہا "ممکن ہے
تفتیش طول پکڑ جائے اور ہم آپکو یہاں روکنے کی تکلیف دینا نہیں
چاہتے میں خیال کرتا ہوں کہ ہم اس گتھی کو صبح سے پہلے سلجھا لینگے"

جب جان مین ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو ہومز نے کام شروع
کیا پہلے قبروں کا بغور معائنہ کیا سب سے پرانی قبر سے شروع کر کے
وہ سر ولیم اور سر ڈینس کی قبر تک آ گیا جو اٹھارویں صدی میں ہوے
تھے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ گزر چکا تھا قبل اسکے کہ ہومز
تلاش کرتے کرتے ایک سیسے کے تابوت تک پہنچا جو تہ خانے کے دروازے
کے قریب قائم تھا میں نے اسکی اطمینان بخش چیخ سنی اسکی پھرتی
سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک نتیجے اور مقصد پر پہونچ گیا ہے۔

وہ اپنے آتشی شیشہ سے وزنی ڈھکنے کے کناروں کو ملاحظہ کر رہا تھا
پھر اس نے جیب سے لوہے کی ایک دھاردار سلاخ نکالی اور ایک
دراز میں اسے ڈال کر پورا ڈھکنا جو صرف دو قبضوں سے جڑا ہوا
تھا اوپر اٹھا دیا جب وہ اوپر اٹھا تو رگڑ کی وجہ سے بڑی کرخت آواز
پیدا ہوئی۔ ڈھکنا پورا کھلنے نہ پایا تھا اور تابوت کی اندرونی
اشیا پورے طور پر نظر بھی نہ آئی تھیں کہ ایک ناگہانی واقعہ پیش آیا
تہ خانے کی چھت پر کوئی چل رہا تھا۔ قدموں کی تیزی اور
استواری بتلا رہی تھی کہ کوئی معینہ غرض لیکر یہاں آیا ہے اور
گرجا کے راستوں سے واقف ہے روشنی کی ایک شعاع زینے میں
ظاہر ہوئی اور ایک لحہ بعد ایک آدمی محراب میں نمودار ہوا۔

وہ بڑا مہیب صورت آدمی تھا۔ قوی الجثہ اور تند مزاج
ایک بڑی لال ٹین جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اس کے گھنی
مونچھوں سے ڈھکے ہوئے زبردست چہرے اور خشمگیں آنکھوں
پر چمک رہی تھی۔ اسکی آنکھیں تہ خانے کے کونے کونے میں شعلہ ریز
معلوم ہوتی تھیں اور آخر کار وہ میرے ساتھی اور مجھ پر یکٹک
ٹکٹکی کے ساتھ قائم ہو گئیں

"تم کون ہو؟" اس نے گرج کر کہا۔ "اور تم میرے تہ خانے میں
کیا کر رہے ہو؟" مگر جب ہومز نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ دو قدم آگے
بڑھکر اس نے وہ وزنی ڈنڈا جسے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا
اٹھایا "تم سنتے ہو یا نہیں؟ وہ چلایا "تم کون ہو اور یہاں
کیوں آئے ہو؟" اور اس کا ڈنڈا ہوا میں گھما

لیکن اس سے سہمنے کے بجائے ہومز مقابلے کے لئے آگے بڑھا
"میں بھی آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں" اس نے

اپنی سخت ترین آواز میں کہا "آخر یہ کون ہے؟ اور یہ یہاں کیا
کر رہی ہے؟"

اسنے لوٹ کر تابوت کا ڈھکنا اکھاڑ ڈالا۔ لالٹین کی روشنی
میں میں نے ایک جسم سر سے پیر تک چادر میں لپٹا ہوا دیکھا جس کی
شکل مسخ ہو چکی تھی، ناک اور فکِ اسفل بری طرح نمودار تھے
آنکھیں ایک زرد چہرے میں بھیانک طور پر اوپر کو تک رہی تھیں
سر رابرٹ چلا کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کو ہٹے اور ایک سنگین
تابوت کے سہارے کھڑے ہوگئے "تم کو اسکی بابت کیونکر معلوم
ہوا؟" وہ چلائے اور پھر کسیقدر حواس بجا کر کے "تم کو اس سے
کیا سروکار؟"

— "میرا نام شرلاک ہومز ہے" میرے ساتھی نے جواب دیا
"شاید آپ اس نام سے واقف ہوں گے۔ بہر حال میرا اس سے
وہی تعلق ہے جو ہر انسان کا ہونا چاہئے یعنی قانون کو برقرار رکھنا
میرا خیال ہے کہ آپ پر بہت سی باتوں کی جوابدہی عائد ہوتی ہے"

سر رابرٹ کچھ دیر تک گھورتے رہے۔ لیکن ہومز کی پرسکون
آواز، مطمئن اور مستقل مزاجی کا اثر ہو کر رہا۔

"مسٹر ہومز، خدا شاہد ہے کہ میں بری الذمہ ہوں ظاہری
واقعات ضرور میرے خلاف ہیں یہ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن میں اس کے
علاوہ اور کیا کر سکتا تھا؟"

"اگر ایسا ہے تو میں بہت خوش ہوں لیکن مجھے افسوس ہے
کہ آپ کو یہ تمام باتیں پولس کے روبرو دہرانی ہونگی"

سر رابرٹ ذرا گھبرائے "اگر یہ لازمی ہے تو چارہ کیا ہے
اچھا مکان چلئے اور آپ خود ہی طے کر لیجئے کہ یہ معاملہ کیا ہے"

پندرہ منٹ بعد ہم اس قدیم محل کے ایک کمرے میں پہونچے
جو اسلحہ خانہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ بندوقوں کی نالیں
شیشے کی الماریوں سے نظر آتی تھیں۔ سر رابرٹ چند منٹ
کے لئے ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے جب وہ واپس آئے تو دو
آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو وہی گوری چٹی جوان عورت
تھی جسکو ہمنے گاڑی میں دیکھا تھا دوسرا ایک آدمی تھا جسکے
زرد چہرے سے عیاری اور بزدلی عیاں تھی۔ ان دونوں کے
بشرے سے انتہائی حیرت ٹپکتی تھی جس سے ظاہر تھا کہ سر رابرٹ
کو ان سے یہ بیان کرنے کا کہ واقعات کی رفتار کیا سے کیا ہوگئی
تھی کافی وقت نہ ملا تھا۔

"دیکھئے" سر رابرٹ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا "یہ مسٹر نارلیٹ
اور ان کی زوجہ ہیں مسز نارلیٹ چند سال سے میری بہن کی
خادمہ تھیں۔ میں ان دونوں کو یہاں اس وجہ سے لایا ہوں کیونکہ
میں محسوس کرتا ہوں کہ اب دنیا میں میرے لئے بہترین چارہ کار
یہی ہے کہ میں اصلی واقعات آپ سے بیان کردوں اور میرے
بیان کی تائید کرنے والے دنیا بھر میں یہی دو شخص ہیں"

"سر رابرٹ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے غور کر لیا ہے
کیا یہ ضروری ہے؟" عورت نے چلا کر کہا۔

"اور میری بابت تو یہ ہے کہ میں تمام ذمہ داری سے انکار کرتا ہوں"
اس کے شوہر نے کہا۔

سر رابرٹ نے اُس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی "ساری
ذمہ داری میں اپنے آپ پر لیلونگا۔ انھوں نے کہا "مسٹر ہومز،
آپ واقعات کا سیدھا سچا بیان سن لیجئے"

آپ واقعات کی تہ تک پہونچ چکے ہیں ورنہ میں آپ کو وہاں نہ پاتا جہاں دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ڈربی کی دوڑ میں ایک گھوڑا دوڑا رہا ہوں اور میری حیات کا انحصار اس کے جیتنے پر ہے اگر میں جیت گیا تو تمام مشکلات آسان ہوجائیں گے اور اگر ہار گیا تو ـــــ نتائج کا خیال کرتے میری روح کانپتی ہے۔

"میں آپ کی حالت کو سمجھتا ہوں" ہومز نے کہا۔

"میں ہر چیز کے لئے اپنی بہن لیڈی فالڈر کا دست نگر ہوں لیکن یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انکی جائداد پر انکا قبضہ تاحینِ حیات ہے اور میں بری طرح مہاجنوں کے قبضے میں ہوں میں ہمیشہ سے چاہتا ہوں کہ اگر میری بہن مرجائیں تو قرضخواہ چیل کوؤں کی طرح مجھپر ٹوٹ پڑیں گے اور ہر چیز پر' میرے اصطبل پر میرے گھوڑوں پر قابض ہوجائیں گے۔

ـــ "مسٹر ہومز اب سنئے کہ میری بہن ایک ہفتہ ہوا درحقیقت مرگئی ہیں"

ـــ "اور آپ نے کسی سے نہیں کہا؟"

مسٹر ہومز میں کیا کرسکتا تھا۔ تباہی کا سامنا تھا۔ اگر میں تین ہفتے کے لئے معاملات کو سنبھال لوں تو کام چلے انکی خادمہ کے شوہر یعنی یہ جو میرے سامنے کھڑے ہیں ایکٹر ہیں۔ ہمنے یہ سوچا میں نے سوچا۔ کہ وہ کچھ عرصے کے لئے میری بہن کے روپ میں رہ کر ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ روزانہ وہ گاڑی میں نکلا کرے کیونکہ انکی خادمہ کے علاوہ کسی کو میرے کمرے میں داخل ہونے کی نہ اجازت ـــ تھی نہ ضرورت۔ ان سب باتوں کا انتظام کرنا چنداں مشکل نہ تھا میری بہن مرض استسقا میں مریں جو ان کو مدت سے لاحق تھا۔

"خیر یہ تو ڈاکٹر خود طے کرلیگا"

"ان کا ڈاکٹر تصدیق کرسکتا ہے کہ کئی ماہ سے علامات اسی نتیجہ کا خوف دلاتی تھیں"

"خیر تو آپ نے کیا کیا؟"

پہلی ہی شب کو میں اور نارلیٹ لاش کو اسے کوئیں والے مکان میں لے گئے جو اب غیر مستعمل ہے۔ لیکن ان کا پیارا کتا ہمارے پیچھے لگ گیا اور دروازے پر جاکر چلانے لگا۔ اس لئے میں نے خیال کیا کسی اور محفوظ جگہ کی ضرورت ہوگی کتے سے چھٹکارا پاکر ہم لاش کو گرجا کے تہ خانے میں لے گئے۔ ہم نے نعش کی کسی قسم کی توہین یا تحقیر نہیں کی میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مرنے والی پر کوئی ظلم نہیں کیا

"میرے خیال میں آپ کا طرز عمل ناقابل معافی ہے" ہومز نے کہا۔

سررابرٹ نے بے صبری سے سر ہلا کر کہا "پند ونصائح بہت آسان ہیں۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کے خیالات مختلف ہوتے کوئی آدمی اپنی تمام تدبیروں اور امیدوں پر آخری لمحے میں اس طرح پانی پھرتے نہیں دیکھ سکتا یہ ناممکن ہے کہ وہ کوشش نہ کرے میں نے خیال کیا کہ اگر ہم نعش کو ان کے آباواجداد میں سے کسی کے تابوت میں جو گرجا میں مدفون ہیں رکھدیں گے تو وہ نعش کے لئے کوئی ناموزوں جگہ نہو گی ہم نے ایک تابوت کھول کر اس میں سے قدیم نعش نکال لی اور لیڈی فالڈر کی نعش رکھدی جیسا کہ آپنے خود دیکھا۔ اور جو پرانی ہڈیاں ہمنے نکالی تھیں ان کو ہم تہ خانے کے فرش پر پڑا چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ نارلیٹ اور میں انکو وہاں سے

لے آئے اور وہ رات کو اتر کر انھیں آتشدان میں جلا یا کرتے تھے یہ سارا قصہ ہے مگر آپ نے کیونکر مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں اسے بیان کر رہا ہوں میری سمجھ سے باہر ہے" ہومز نے کچھ دیر خیال میں غرق بیٹھا رہا۔

"سر رابرٹ آپ کے قصے میں ایک خامی ہے" آخر کار اُسنے کہا "گر قرضخواہ آپ کی جائداد پر قبضہ کر لیتے تب بھی دوڑ کی بابت آپ کی امیدیں اور بازیاں قائم رہ سکتی تھیں"

وہ گھوڑا منجملہ میری جائداد کے ہو اور ان لوگوں کو میری بازیوں کی کیا پرواہ؟ یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اسے سرے سے دوڑنے ہی نہ دیتے اور میرا سب سے بڑا قرضخواہ بدقسمتی سے میرا سب سے بڑا دشمن ہے وہ بڑا بدمعاش ہے سام برور اس کا نام ہے میں نے ایک مرتبہ مجبور ہو کر اسے خوب ہنٹر چلائے تھے۔ تو کیا آپ امید کرتے ہیں کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کریگا؟

خیر سر رابرٹ" ہومز نے اٹھکر کہا "اس معاملے کی اطلاع پولس میں ضرور ہونی چاہیے۔ میرا فرض صرف یہ تھا کہ واقعات کا انکشاف کر دوں اور میں انکو یہیں چھوڑتا ہوں رہا آپکا طرز عمل سو اس کے جائز یا ناجائز ہونے کی بابت رائے دینا میرا کام نہیں۔ واٹسن اب آدھی رات کا وقت ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم اب اپنی جائے قیام کو چلیں"

یہ بات عام طور پر معلوم ہو کہ اس عجیب واقعے کا انجام وہ نہ ہوا جس کے سر رابرٹ مستحق تھے، شاسکمب پرنس ڈربی کی دوڑ جیتا اور مالک کو اسی ہزار پونڈ نقد کی آمدنی ہوئی قرضخواہ دوڑ کے ختم ہونے تک ہاتھ روکے رہے اور اس کے بعد ان کا قرض ادا ہو گیا پھر بھی سر رابرٹ کے پاس کافی روپیہ بچا اور وہ آئندہ زندگی میں خوشحال زندگی بسر کرتے رہے۔ پولس اور عدالت دونوں نے معاملے پر ترحمانہ نظر ڈالی اور ڈربی کے خوش قسمت فاتح کو اطلاع وفات میں غیر معمولی تاخیر کی بنا پر عدالت نے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا اور اب اس عجیب واقعہ کے صاف بچکر انکی آئندہ زندگی تفکرات سے بری بسر ہو رہی ہے۔ (ڈائیل)

شہاب برنی

ابن یمین کے گمشدہ نایاب دیوان کی دستیابی

حافظ کی شاعری کے متعلق ایک جدید انکشاف

اور

تاریخ ادب فارسی میں حیرت انگیز اضافہ

مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت رسالہ نگار (ماہ مئی ۱۹۲۶ء) میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار صاحب نے بعض وجوہ کی بنا پر جنھیں وہ خود اچھا جانتے ہیں اپنا نام آرگس بتایا ہے۔ دنیائے ادب کی خوش قسمتی سے آرگس صاحب کو کہیں سے ابن یمین کے نایاب دیوان کی ایک کاپی دستیاب ہوگئی ہے جس کے مطالعہ نے آپ کی طبیعت پر ایک حیرت انگیز اثر پیدا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ نے خواجہ حافظ کی شاعری کو "صرف ابن یمین کی تقلید اور نقل" کہدیا ہے کاش کہ آپ اپنے خیالات کے اظہار میں ذرا میانہ روی سے کام لیتے اور اس اضافۂ معلومات کی بنا پر ادبیات فارسی میں تہلکہ ڈالنے کی کوشش نہ کرتے، بات بہت معمولی تھی۔ اور معمولی طور پر کہی جاسکتی تھی۔ لیکن آپ نے قطرۂ شبنم میں طوفانِ یم پیدا کرنے کی جو سعی کی ہے اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ آرگس صاحب کے اس بلند آہنگ دعوی کا جواب لکھا جائے آرگس صاحب لکھتے ہیں:-

"اگر ایک طرف یہ امر مسلم ہے کہ بزم تغزل میں اپنے لئے بجا طور پر مسند صدارت حاصل کر چکے ہیں تو دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ حافظ کی شاعری کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے اگر اس وقت وہ ایک صوفی باصفا ہیں تو دوسرے وقت ایک رند لاابالی۔ اگر ابھی انکی تسبیح و تہلیل کے نعروں سے خانقاہ گونج رہی تھی تو کبھی ان کے ہوحق سے مےخانہ میں ہنگامہ برپا نظر آتا ہے۔ کسی جگہ نکات تصوف بیان ہو رہے ہیں کہیں فلسفیانہ معمے حل کئے جارہے ہیں اور کہیں نہ تصوف ہے نہ حکمت نہ شریعت ہے نہ طریقت ایک اہمال ہے ناقابل تاویل ایک بے راہ روی ہے منزل سے کوسوں دور۔ یہ اعتراض زمانہ حال ہی میں ان پر وارد نہیں ہوا بلکہ خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جب شاہ شجاع خواجہ حافظ سے کبیدہ خاطر ہوگیا۔ تو اس نے خواجہ حافظ کو بلا کر کہا کہ آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں جو ہموار ہو اور ایک رنگ پر قائم۔ ایک شعر میں صوفیانہ نکات ہیں تو دوسرے میں بوالہوسی کے جذبات۔ تیسرے میں مشائخ پر طعن و تشنیع۔ چوتھے میں فلسفہ۔ اس کا کیا سبب ہے .... اسی طرح اور لوگوں نے بھی حافظ کے اس انداز پر اعتراضات کئے ہیں اور آج بھی نقاد نگاہیں ان کی شاعری کے اس نقص کو نظر انداز نہیں کرسکتیں ...."

مجھے معلوم نہیں کہ علاوہ شاہ شجاع کے اور کن اصحاب نے خواجہ صاحب کی شاعری پر یہ اعتراض وارد کرکے اپنی خوش مذاقی اور سخن شناسی کا ثبوت

دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے اور مقالہ نگار صاحب بھی اس سے نا آشنا نہیں کہ شاہ شجاع نے جس وقت خواجہ حافظ پر اعتراض کیا تھا اس وقت ان کے تعلقات باہم نہایت کشیدہ تھے اور نہ صرف یہ اعتراض بلکہ اور کئی ایسے ہی بے معنی اعتراض اس نے آپ کے کلام پر کیئے اور وہ ہر حیلہ سے جائز ہو یا ناجائز خواجہ صاحب کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کو تکلیف دینا چاہتا تھا ایسے اعتراضات کی وجہ محرک پر کچھ لکھنا میرے خیال میں چنداں مفید کار نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اعتراض کیا ہے۔ اور اس کی وقعت کیا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جب کسی شخص کو کسی شاعر کے کلام پر میں یہ اعتراض کرتے سنتا ہوں کہ کلام ہموار نہیں ہم رنگ نہیں۔ کہیں ایک خیال ہے کہیں دوسرا۔ کہیں وہ صوفی ہے کہیں رند۔ کہیں موحد ہے کہیں بت پرست۔ کہیں مست ہے اور کہیں مستور۔ کبھی مجاز ہے کبھی حقیقت۔ کبھی تسبیح و تہلیل ہے اور کبھی ہوس رانی۔ تو مجھے معترض کی سخن ناشناسی اور اس کی ادبیات سے بیگانگی پر رحم آتا ہے اور اس کی دلیری پر غصہ۔ شاہ شجاع نے یا اس کی تقلید میں کسی اور صاحب نے جب ذوق صحیح کا جنازہ نکال کر خواجہ حافظ کی شاعری پر یہ اعتراض کیا تو کیا اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ حافظ غزلیں کہتا ہے۔ احیاء العلوم کو منظوم نہیں کرتا۔ وہ صوفی نہیں ہے اور فصوص الحکم پر حاشیہ نہیں رکھتا۔ وہ فقیہ نہیں ہے اور ہدایہ کی شرح نہیں کرتا وہ فلسفی نہیں ہے اور بوعلی سینا یا فارابی کے فلسفہ کی تردید یا تائید نہیں کرتا۔ وہ مفسر نہیں ہے اور کشاف کو شعروں میں منتقل نہیں کرتا وہ کسی لکیر کا فقیر نہیں ہے جو چاہتا ہے کہتا ہے۔ وہ پابہ زنجیر نہیں ہے جدھر چاہتا ہے جاتا ہے۔ معترض آنکھیں بند کرے تو یہ اور بات ہے۔ وگرنہ وہ دیکھ سکتا ہے کہ حافظ جو کچھ کہتا ہے لوگ اسے گوش دل سے سنتے ہیں اور وہ جدھر جاتا ہے لوگ اس کی خاک راہ کو آنکھوں کا سرمہ بناتے ہیں۔ شاہ شجاع کے اعتراض کے جواب میں خواجہ صاحب نے جو کچھ کہا شاہ شجاع اسے نہ سمجھا اور نہ شاہ شجاع کی کورانہ تقلید کرنے والے اسے سمجھے۔ جواب مختصر اور دندان شکن تھا۔ آپ نے فرمایا حضرت آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر۔ لیکن آنکھوں سے تعصب کی پٹی کھولیئے اور دیکھیئے کہ میری غزلوں کو دنیا کن نگاہوں سے دیکھتی ہے اور برخلاف اس کے ان لوگوں کے کلام کا کیا حشر ہوتا ہے جو آپ کو میرے شعروں پر اعتراض کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ　　　قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

حیران ہوں کہ یہ اعتراض خواجہ صاحب کی شاعری کے ساتھ کیوں مخصوص کیا گیا ہے۔ کسی ایسے فارسی یا اردو شاعر کے دیوان کو اٹھا کر دیکھیئے جسے قبول عام نصیب ہوا ہو۔ اور فرمایئے کہ یہ اعتراض یہاں بھی اسی شدت سے وارد ہوتا ہے یا نہیں۔ آدمی مثنوی یا قصیدہ لکھنے بیٹھے تو البتہ وہ ایک خاص رنگ ایک خاص خیال اور ایک خاص مدعا کو مدنظر رکھ سکتا ہے غزل گو شاعر کو کسی ایسی پابندی سے کیا سروکار اس کی ایک غزل کو دوسری غزل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ایک ہی غزل کے ایک شعر کو دوسرے شعر کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں۔ یہاں ایک خیال ہے وہاں دوسرا۔ یہاں ایک رنگ ہے وہاں دوسرا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی رنگ آمیزی میں غزل گو شاعر کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے مناظر قدرت میں رنگ آمیزی کے کرشمے دیکھیئے۔ کیا قوس قزح کا حسن مختلف رنگوں کی آمیزش سے پیدا نہیں ہوتا۔ دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، ریگستانوں اور خیابانوں کے نظاروں کی دلکشی کیا اسی اختلاف کی مرہون منت نہیں مصور کے قلم کی سحر کاریاں جو طلسم پیدا کرتی ہیں کیا وہ انہی مختلف رنگوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت غزل کی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ متنوع غزل

کہنے والے شاعر ایک رنگ کے پابند رہے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوئے اور کیا خود ابن یمین کی غزلیات بھی اسی وجہ سے قبول عام سے محروم نہیں ہوئیں؟ قبول عام اور شہرت دوام کی دولت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر ہر خیال کی ترجمانی کرے تاکہ اس کے دیوان میں جہاں ایک صوفی کے لئے سامان دلکشی موجود ہو وہاں ایک رند بادہ خوار کی طبیعت بھی لگی رہے۔ جہاں ایک فلسفی کو حقائق و معارف کا خزانہ مل سکے وہاں ایک عامی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ موجود ہو۔

—— شاعر جس دوربیں آنکھ اور جس دقیقہ رس تخیل سے دنیا کو دیکھتا ہے وہ ہر ایک آدمی کو نصیب نہیں۔ شاعر جس چیز کو دیکھتا ہے اس کے مختلف پہلو اسے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اگر آج وہ ایک چیز کے ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو کل اسی چیز کے دوسرے پہلو کو بیان کریگا جسے ایک ظاہر بیں آنکھ ایک ناقابل حل تضاد دیکھتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔

—— اس صورت میں کیا یہ کتنا صریح ظلم نہیں کہ بعض دفعہ حافظ اپنی بے راہ روی کی وجہ سے منزل سے کوسوں دور چلے جاتے ہیں۔ کیا آرگس صاحب بتا سکتے ہیں کہ حافظ کی شاعری کی منزل مقصود کیا تھی اور وہ اپنی بے راہ روی کی وجہ سے منزل سے کوسوں دور جاکر کہاں جا نکلے۔

—— خواجہ حافظ کی شاعری کا یہ نقص بیان کرکے مقالہ نگار صاحب اس نقص کے وجوہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"........ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں تعلیم معمولی ہوئی ہوگی۔ خود تا سمجھ تھے۔ مکتب معمولی تھا اور یوں بھی استاد لاوارث بچوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ لہذا پہلا سبب تو ان کی تعلیمی خامی ہے جس نے عمر بھر ان کو کوئی ایک راہ اختیار نہ کرنے دی۔ دوسرا سبب غالباً یہ ہوا ہوگا کہ ان کے محلے میں کوئی موزون طبع بزاز رہا کرتا تھا ..... شعراء وہاں جمع رہا کرتے تھے حافظ صاحب ادھر سے گزرتے تو ان کی طبیعت میں بھی ایک قسم کی گدگدی پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ انھوں نے بھی شاعری شروع کردی ..... مجالس میں انکا گذر ہونے لگا جہاں لوگ ان کو بناتے تھے .... چونکہ بزاز کی دکان پر مختلف باکمالوں کا مجمع رہتا تھا اسلئے جو رنگ ان کو اچھا معلوم ہوتا ہوگا اسی طرف توجہ کرتے ہوں گے شاعری کی ابتدا طبیعت میں ذاتی جوہر تابیت مفقود۔ استاد کوئی نہیں۔ مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہونا ضروری تھا کچی لکڑی تھے۔ جدھر جوچاہتا تھا موڑ دیتا تھا۔ الغرض یہیں سے ان کی شاعرانہ کجروی کا آغاز ہوا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا......"

تاریخی شہادتوں اور خود خواجہ صاحب کے دیوان سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ایک نہایت جید عالم تھے۔ آپ کا ہمدرس اور ہم عصر محمد گل اندام جس نے آپ کا دیوان مرتب کیا آپ کو ان الفاظ سے یاد کرتا ہے (ملکی صفات مولانا الاعظم المرحوم المبرور افضل العلماء استاد نحاریر الادبا معدن لطائف الروحانیہ مخزن معارف السبحانیہ) اس امر سے کون شخص انکار کرسکتا ہے کہ کتاب اللہ کے حقائق و معارف سے آپ کا سینہ روشن تھا اور شعرائے عرب کے دیوانوں کا آپ بہت گہری دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے حتی کہ انہی علمی مشاغل کی وجہ سے آپ اپنا دیوان مرتب نہ کرسکے خیالات کی بلندی الفاظ

کا بے مثل انتخاب بندشوں کی چستی اور اشعار کی سلاست شیرینی اور روانی جس کا ثبوت آپ کے دیوان کے ہر صفحہ سے ملتا ہے اس امر کی لاجواب دلیل ہے کہ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع تھا - اور ادبیات فارسی میں آپ کو کماحقہ دسترس حاصل تھی - پھر معلوم نہیں کہ مقالہ نگار صاحب نے آپ کی تعلیم کو خام کیونکر سمجھ لیا میں انکی اس منطق پر بھی حیران ہوں کہ ایک بے کس یتیم بچہ کی تعلیم معمولی ہوئی ہوگی کیا دنیا کے بڑے بڑے شاعر بڑے بڑے مصنف اور ہر سرزمین کے قابل ترین افراد تمام کے تمام نوابوں اور امیروں کے بیٹے ہوئے ہیں - نہیں بلکہ برعکس اس کے کہ تاریخ بتا رہی ہے کہ تمام وہ لوگ جو آسمان علم و ادب پر ستارے بن کر چمکتے ہیں اور جن کی ضیا افشانیوں نے روئے زمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کیا ہے غریب والدین کے بیٹے تھے - الاماشاءاللہ - اس لئے یہ دعویٰ کہ خواجہ صاحب نے چونکہ بے کسی کی حالت میں تعلیم پائی تھی - اس لئے ان کی تعلیم خام رہی - اور ابن یمین چونکہ امیر ابن امیر تھے اس لئے ان کی تعلیم نہایت مکمل تھی - ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید او تکذیب تمام اقوام عالم کی تاریخ سے ہو رہی ہے -

——— علاوہ ازیں خواجہ صاحب کے کلام پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ تعلیمی خامی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تعلیمی خامی کا لازمی نتیجہ کلام کی خامی ہے - لیکن خواجہ صاحب کے معاصرین نے جو ان کے دشمن تھے یا حاسد کبھی ان کے کلام کو خام نہیں کہا - نہ کوئی ذی شعور آدمی ان کے کلام پر یہ اعتراض کر سکتا ہے -

——— دوسری وجہ جو مقالہ نگار صاحب نے خواجہ حافظ کی شاعرانہ کجروی کی بیان کی ہے وہ یہ ہے "طبیعت میں ذاتی جوہر قابلیت مفقود استاد کوئی نہیں مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہونا ضروری تھا" شاعری کے لئے جس ذاتی جوہر قابلیت کی ضرورت ہے - اگر خواجہ حافظ میں وہ مفقود تھا - تو معلوم نہیں یہ جوہر اور کس شاعر کو ودیعت ہوا تھا خواجہ صاحب کے بے استاد ہونے کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شعراء تلامیذ الرحمٰن اسلئے کہلاتے ہیں کہ فن شاعری اسکولوں یا کالجوں میں نہیں پڑھایا جاتا " ذاتی جوہر قابلیت" کی ضرورت ہے اور اگر یہ جوہر موجود ہو تو استاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی - بصورت دیگر کوئی استاد کسی شاگرد کو شاعر نہیں بنا سکتا - دنیائے ادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے -

رہا مختلف رنگوں کا اثر - اس باب میں بھی زیادہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی شاعر جتنے مختلف شعرا کا کلام سے جتنے مختلف رنگوں کا اس پر اثر ہو اتنا ہی مفید ہے مطالعہ کی وسعت کو تعلیم کا نقص نہیں کہا جا سکتا -

آگے چل کر آرگس صاحب خواجہ حافظ اور دیگر مشاہیرین پر ابن یمین کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"......... مگر ابن یمین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کیونکہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے کیفیات حقیقی کو جذبات غیر حقیقی سے جدا کیا - اور حقیقت و اسرار حقیقت کو غیر معصوم جذبات کی آمیزش سے بچایا وہ ابن یمین ہے - انھوں نے جہاں جہاں فضائے قدس میں پرپرواز کھولے ہیں اس قدر بلند چلے گئے ہیں کہ کسی دوسرے خیال کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی

ابن یمین کا یہ رنگ بھی ہے کہ کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کر میخانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر یہاں بھی

صوفی قائم رہتے ہیں۔ نہ کبھی رندِ لاابالی کی طرح کسی کی پگڑی اچھالتے ہیں نہ ان کا خرقہ و سجادہ کبھی رہن مے ہوتا ہے اور نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان کر دیتے ہیں"

ابن یمین کے متعلق یہ سب کچھ صحیح سہی۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں مثنوی یا قطعات میں یہ رنگ کامیاب ہو سکتا ہے کیا وہاں غزل میں بھی اس رنگ کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب خود ابن یمین کی شاعری سے مل سکتا ہے۔ آپ کے قطعات گو زبان زد خلائق ہوئے مقبول ہوئے اور شہرت دوام کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن آپ کی غزلیں گوشۂ گمنامی سے باہر نہ آسکیں۔ غزل وعظ نہیں ہے جو ممبر پر کہا جاتا ہے اور جس میں پاس ادب ضرور ہوتا ہے۔ یہ ان لاابالی رندوں کا کلام ہے جو لوگوں کی پگڑی بھی اچھالتے ہیں مگر ان لوگوں کی جن کی دستار فضیلت کے نیچے خدا جانے کیا کیا چھپا ہوتا ہے۔ خرقہ و سجادہ کو رہن مے بھی کرتے ہیں لیکن اس خرقہ و سجادہ کو دنیا دام تزویر کہتی ہے وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان بھی کر دیتے ہیں لیکن اس دین و دنیا کو جس سے تمام دنیا بیزار ہوتی ہے اور اس ساقی کی نیم نگاہی پر جس کی نیم نگاہی پر آج بھی دنیا سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے۔

اگر ابن یمین بھی یہی کچھ کرتے اور اسی رنگ میں کرتے جس رنگ میں خواجہ صاحب نے کیا تو آج ان کا دیوان بھی دیوانِ حافظ کی طرح گھر گھر موجود ہوتا اور ان کی غزلیں دنیا سے اس طرح مفقود نہ ہوتیں جس طرح وہ مفقود ہوئیں۔ یہ غلط ہے کہ چونکہ ان کا دیوان گم ہو گیا اس لئے اُن کی غزلیں مقبول اور مشہور نہ ہو سکیں۔ مشہور اور مقبول غزلوں کے دیوان کے گم ہو جانے سے غزلیں گم نہیں ہو سکتیں۔ آرگس صاحب خود فرماتے ہیں کہ "لوگ ان کے قطعات اور غزلوں کو بازاروں میں گاتے تھے اور سوز و سرود کی مجلسوں میں ابن یمین کی غزلیں خاص عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں" ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ "خراسان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جہاں کا گوشہ گوشہ امیر یمین الدین کے مایۂ ناز فرزند ابن یمین کے کمالاتِ شاعری سے گونج رہا تھا" پس اگر یہ سچ ہے اور صحیح ہے کہ خراسان کا گوشہ گوشہ ابن یمین کے کمالاتِ شاعری سے گونج رہا تھا اور اُن کی غزلیں بازاروں میں اور ہر بزم طرب میں گائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے دیوان کے ایک نسخے کے گم ہو جانے سے ان کی تمام تر غزلیات روئے زمین سے گم ہو جاتیں۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ابن یمین کے دیوان کی دستیابی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ دنیا میں دیوان ابن یمین کا صرف وہی ایک نسخہ تھا جو ابن یمین کا اپنا تھا اور گم ہو گیا۔ بلکہ اور نسخے بھی موجود تھے جن میں سے بعض کو متقدمین نے بھی دیکھا اور جن میں سے ایک کو آج آرگس صاحب نے خود بھی دیکھا ہے۔

با این ہمہ ابن یمین کے قطعات کے نسخے تو دنیا میں موجود ہیں۔ ہر ایک تذکرہ میں ان میں سے بعض نقل بھی ہوئے اور کتابی صورت میں طبع بھی ہوئے۔ لیکن دیوان غزلیات مفقود ہی رہا اور غزلیں ایسی گم ہوئیں کہ گویا کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ غزلیات اس لئے مقبول نہ ہوئیں کہ ابن یمین گو کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کر مے خانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر وہ یہاں بھی صوفی قائم رہتے ہیں۔

ایک اور مقام پر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"ابن یمین کے دیوان میں صوفیانہ رنگ کے ساتھ انبساطی اور خمریاتی شاعری بھی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ بات کسقدر عجیب ہے کہ وہ خراباتی ہونے کے بعد بھی اپنی دلقِ پارسائی کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ ایک چھینٹ بھی اس پر نہیں پڑ سکتی"

پھر کیا یہی دلق پارسائی کی حفاظت اور یہی پاسِ ادب غزلیات کے مقبول نہ ہونے کی وجہ نہیں ہے خراباتی ہونے کے بعد بھی دلق پارسائی کی حفاظت کرنا اور اُس کو چھینٹوں سے بچانا غزل گو شاعر کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

آرگس صاحب یہ دعویٰ کرکے کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری صرف ابن یمین کی تقلید اور نقل ہے اور خواجہ صاحب نے ابن یمین کے دیوان کو رد و بدل کرکے "اپنا لیا ہے" اپنے اس دعوے کو مضبوط کرنے کی خاطر حافظ اور ابن یمین کی ملاقات ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس پر تاریخی شہادت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"حافظ کی ابتدائی زندگی نہایت آزادی سیر و سیاحت اور رند مشربی میں گزری اور وہ مدتوں ادھر ادھر پھرا کئے۔ چنانچہ ان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "مدتے بحدود اقالیم خراسان و ترکستان و ہندوستان رسیدہ" تذکرہ نویسوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کرلی ہے۔ کہ خراسان کب گئے۔ کیوں گئے اور وہاں کی شاعری کا رنگ کیا تھا .... ہمارے پاس اس بات کی شہادت ہیں کہ حافظ خراسان گئے وہ الفاظ کافی ہیں جو ان کے دیوان کے دیباچہ میں موجود ہیں اور جن کو ہم ابھی نقل کرچکے ہیں اب رہا یہ امر کہ وہ خراساں پونہچ کر ابن یمین سے ملے یا نہیں۔ سو اس کے لئے خود ابن یمین کی شہادت سے زیادہ معتبر گواہی کس کی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

چہ غم از طعنہ اغیار ترا ابن یمین کہ چوں حافظ بجہاں یار و نگارے داری

اس شعر سے نہ صرف اس بات پر قطعی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ابن یمین حافظ سے ملے بلکہ اس سے ان تعلقات محبت و الفت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کی بنا پر انھوں نے حافظ کو یار و نگار لکھا ہے۔ یعنی نہ صرف حافظ کی محبوبیت اور ابن یمین کی دلدادگی اس سے ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپس کی یہ محبت کافی بدنام ہوچکی تھی"

معلوم نہیں آرگس صاحب نے کن آنکھوں سے دیوان حافظ کے دیباچہ کو دیکھا اور وہاں سے مذکورہ بالا عبارت نقل کی جس کی بنیاد پر ایک بے بنیاد اور بے سرو پا افسانہ مرتب کرلیا۔ اگر وہ معمولی انسانی دو آنکھوں سے دیباچہ کو ملاحظہ فرماتے تو وہ کبھی اس خطرناک غلطی میں نہ پڑتے نہ وہ ان تذکرہ نویسوں کا گلہ کرتے جنھوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کرلی ہے۔ دیباچہ کی اصل عبارت اس طرح ہے۔

.... بنابریں غزلہائے جہانگیرش بادنیٰ مدتے بحدود اقالیم خراسان و ترکستان و ہندوستان

رسیدہ وقوافل سخن ہاے دلپذیرش در اقل زماں باطراف واکناف عراقین وآذر بائیجان سرکشیدہ ...."

دیباچہ نگار کہتا ہے کہ خواجہ حافظ کے کلام کو وہ عالم گیر شہرت نصیب ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی غزلیں خراسان، ترکستان، ہندوستان عراق عرب عراق عجم اور آذر بائیجان تک پہنچ گئیں۔ لیکن مقالہ نگار صاحب نے خود خواجہ صاحب کو اُٹھا کر ان تمام اقالیم کی سیر کرا ڈالی۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواجہ حافظ کبھی ایران سے باہر نہیں نکلے اور گو مندرجۂ بالا تمام ممالک سے ان کو طلبی کے فرمان شاہی درباروں سے پہونچتے رہے لیکن اس گنج عافیت کے درویش نے کبھی باہر جانا گوارا نہ کیا۔ دیباچہ نگار کے اس مضمون کی تائید دیوان حافظ میں جابجا موجود ہے۔ مثلاً:-

عراق وپارس گرفتی بشعر خود حافظ بیا کہ نوبت بغداد ووقت تبریز است

ز شعر حافظ شیراز مے گویند ومے رقصند سیہ چشمان کشمیری وترکان سمرقندی

بغداد کے بادشاہ سلطان احمد بن اویس نے کئی بار آپ کو طلب کیا آپ جانے کی آرزو تو کرتے رہے لیکن گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ فرماتے ہیں۔

رہ نبردیم بمقصود خود اندر شیراز خرم آن روز کہ حافظ رہ بغداد کند

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب دکن آتے آتے رہ گئے جہاز میں سوار بھی ہوئے۔ لیکن پھر اتر پڑے اور شیراز واپس چلے گئے اسی تقریب پر کہتے ہیں۔

بس آسان مے نمود اول غم دریا بوئے در غلط کردم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

افسوس ہے کہ مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے پڑھنے میں ذرا سی غلطی کر کے بات کو کہاں سے کہاں پونہچا دیا اور پھر اس ایک شعر سے جو انھیں دیوان ابن یمین میں نظر آیا۔ کیا کیا نتائج اخذ کئے خدا جانے یہ شعر ابن یمین کا ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ آرگس صاحب خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی دیکھ پاتے تو فوراً فرماتے کہ یہ شعر حافظ نے اس شعر کے جواب میں لکھا ہے اور طرفین سے اس دعوے کی تائید کرا لیتے ہے

بس دعائے سحرت حافظ جان خواہد بود تو کہ چوں حافظ شبخیز غلامے داری

مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے مذکورۂ بالا الفاظ اور دیوان ابن یمین کے ایک کی بنا پر خواجہ صاحب کی ایک مکمل سوانح عمری قیاسات کے زور پر مرتب کر لی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"قیاس کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ ترک نژاد تھے .... ممکن ہے کہ میر یمین الدین اور حافظ کے والد بہاؤ الدین کے تعلقات اچھے رہے ہوں .... غرض یہ کہ حافظ یقیناً اپنی ابتدائی شاعری میں خراسان گئے اور .... اور قصبۂ فریومد میں پہونچے ابن یمین ...... نہایت مشہور مہمان نواز تھے

حافظ ابن یمین کے ہاں پہونچے اور ابن یمین نے .... ان کی پزیرائی کی۔ پھر یہ وہاں مدتوں ایک محبوب مہماں کی حیثیت سے مقیم رہے .... یہ زمانہ ابن یمین کی شاعری کا آخری زمانہ تھا۔ وہ نکات تصوف کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کر کے داد حاصل کر چکے تھے کہ حافظ پہونچے .... اس لئے نتیجہ یہی ہونا تھا۔ کہ کہ ابن یمین خود ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے۔ یا خود حافظ ان کی نقل و پیروی کرنے لگ جاتے بہرصورت حافظ کی صوفیانہ شاعری ان کی ذاتی شاعری نہیں کہی جاسکتی وہ کسی صورت سے بھی ہو صرف ابن یمین کی تقلید و نقل ہے .... دیوان ابن یمین کا نہایت قدیم نسخہ میری نگاہ سے گزرا ہے اور اسی کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھپر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری یکسر ابن یمین کے دیوان سے ماخوذ ہے......

ابن یمین کا دیوان ان کی وفات سے چند سال پیشتر گم ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ ابن یمین کے یار نگار بنے ہوئے ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ پھر اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ممکن ہے یہ گم شدہ کلام حافظ کے ہاتھ لگا ہو اور اس میں رد و بدل کر کے حافظ نے "اپنا لیا" ہو (علی الخصوص اس وقت جب کہ ان کی غزل گوئی کا شہرہ اس واقعہ کے بعد ہوا ہے) تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ حافظ کا تصوفانہ رنگ یکسر ابن یمین سے ماخوذ ہے ...."

دیکھئے ایک چھوٹی سی غلطی سے کتنی اور خطرناک غلطیاں پیدا ہوئیں۔ اور آرگس صاحب نے ہوا میں بنیاد قائم کر کے کتنے عالی شان محل تیار کر لئے۔ قیاس پر قیاس کرتے چلے گئے۔ اور آخر کار خواجہ صاحب کی دیانت اور ان کی شاعری پر ایک نہایت بے باکانہ حملہ کر کے دم لیا اور دبے الفاظ میں خواجہ صاحب پر دیوان ابن یمین کی چوری اور ابن یمین کی غزلیات کے سرقہ کا الزام لگا دیا آج کل علمی دنیا میں ریسرچ کا زور و شور ہے اور یہ زور و شور بسا اوقات دیوانگی کی سرحد تک جا پہونچتا ہے انہی ریسرچ والوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہی نام ہے دنیا میں کبھی ان کا وجود نہیں ہوا۔ ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو کہا تھا کہ محض افسانہ ہے۔ انہی بزرگوں نے یورپ کے مشہور ترین ڈرامے نویس شیکسپیر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی ہستی بھی ایک من گھڑت کہانی ہے اور یہ تمام ڈرامے اور لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ اسی فرقہ کے ایک حضرت نے فرمایا تھا کہ عمر خیام ایک فرضی نام ہے اور رباعیات عمر خیام مختلف شعرا کی رباعیات کے ایک مجموعہ کا نام ہے جن کو کسی بیاض نویس نے اکٹھا کر کے مرتب کیا اور ایک فرضی آدمی کے نام پر مشہور کر دیا آج دنیائے ادب میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ دیوان حافظ ابن یمین کا گم شدہ دیوان ہے جسے حافظ نے رد و بدل کر کے اپنا نام مشہور کر دیا۔ کتنا ظلم ہے کتنی بے انصافی ہے اور کتنا بڑا بے باک اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ آرگس صاحب اگر انصاف کرتے مبالغہ نہ کرتے میانہ روی اختیار کرتے اور خواجہ حافظ اور ابن یمین کے ہم خیال اشعار بالمقابل پیش کر کے ان پر تنقید کرتے تو یہ مقالہ ایک نہایت مفید چیز ہوتی۔ لیکن انھیں ضروری معلوم ہوا کہ ایک حیرت انگیز

انکشاف کے عنوان کے نیچے حیرت انگیز باتیں ہی بیاں کی جائیں۔

آپ نے آگے چل کر خواجہ حافظ اور ابن یمین کے دیوانوں سے بالمقابل غزلیں اور شعر پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض جگہ تو حافظ نے پوری کی پوری غزلیں ہی چرالی ہیں اور بعض جگہ ابن یمین کا صرف خیال لے کر اپنا یا ہے اور اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ پہلے دونوں دیوانوں سے یہ دو غزلیں مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔

ابن یمین

ساقی بریز جرعۂ وصلت بجام ما — کز شربت فراق تو تلخ است کام ما
اے باد اگر بکوئے نگارم گزر کنی — زنہار عرضہ دہ بہ سگانش سلام ما
مستیم جاودان ز لب لعل آن نگار — زاہد خبر نیافت ز عیش مدام ما
شاید برابری نکند در دم حساب — مال حلال زاہد و آب حرام ما

حافظ

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
اے باد اگر بگلشن احباب بگزری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

یہ دونوں غزلیں لکھ کر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں :۔

"دونوں کے مطلع تقریباً ایک ہیں۔ دوسرے شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ابن یمین کا چونکہ خاص رنگ یہ ہے کہ وہ آداب حسن و عشق کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے (بہ سگانش سلام ما) کہا مگر حافظ نے (بر جاناں پیام ما) کہدیا حالانکہ یہ کسی طرح اس ٹکڑے سے اچھا نہیں۔ ابن یمین نے آداب عشق کو ملحوظ رکھا ہے ....
حافظ کی شوخ مزاجی نے شعر کے مفہوم کو گرا دیا تیسرے شعر میں گو حافظ کا شعر چسپت معلوم ہوتا ہے۔ مگر در اصل جس قدر لطیف خیال ابن یمین نے ظاہر کیا ہے وہ حافظ کے تصرف سے برباد ہو گیا ....
پیالہ میں عکس رخ یار دیکھنا ایک دور کی بات ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بھی ابن یمین ہی کا ہے چوتھا شعر بالکل ایک ہے ابن یمین کے یہاں مال ہے اور حافظ کے یہاں نان۔ ممکن ہے کہ کاتبوں کی تحریف سے نان کا نقطہ مال بن گیا ہو"

ان دونو غزلوں کو دیکھ کر سخن شناس آنکھیں فوراً پہچان لیتی ہیں کہ اصل مال کس کا ہے۔ کاتبوں کی تحریف سے تو آرگس صاحب آشنا معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ کاتبوں کی اس سے بڑھ کر ستم ظریفیوں سے بھی ناآشنا نہ ہوں گے۔ کوئی پرانی کتاب نہیں جس میں الحاقی حصے نہ ہوں کسی پرانے شاعر کے دیوان کو دیکھئے دوسرے شاعروں کی غزلیں اور شعر ضرور وہاں موجود ہوں گے جس زمانے میں طباعت کا انتظام نہ تھا۔ لوگ مختلف بیاضوں سے مختلف مسودوں سے اور مختلف لوگوں کی زبانی سن کر دیوان مرتب کیا کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ اکثر ادھر ادھر کی غزلیں اور شعر خلط ملط ہو جاتے تھے۔ موجودہ مثال میں بھی صاف صاف نظر آرہا ہے کہ وہی خواجہ

حافظ کی غزل ہے جو مسخ ہو کر دیوان ابن یمین میں درج ہوگئی۔ ایران سے خراسان پہونچتے پہونچتے درمیانی راویوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غزل بگڑتی چلی گئی۔ موجودہ صورت میں کسی بیاض نویس کے پاس پہونچی اور حافظ کی نہیں بلکہ ابن یمین کی بیان ہوئی، اور ان کے دیوان میں درج ہوگئی۔ دونو غزلیں غور سے دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن یمین کی غزل کسی شاگرد کی غزل ہے جسے کسی پختہ کار استاد کے قلم نے فرش سے عرش پر پہونچا دیا ہے۔

برعکس اس کے آرگس صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن یمین کی غزل کو حافظ نے اپنایا ہے اور بگاڑ دیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ مطلع دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابن یمین کا جرعۂ وصل اور شربت فراق بہی پرانی پامال اور بے لطف ترکیبیں ہیں جسے درجہ دوم کے شاعر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ کا مطلع اس قدر روشن اس قدر تازہ اور اس قدر پر جوش ہے کہ انسان پڑھتے ہی جھومنے لگ جاتا ہے۔ ساقی اور مطرب کو ایک ہی وقت بر سر کار لاکر خواجہ صاحب نے محفل کو اتنا گرم کر دیا ہے کہ ہوش و تمکنت الامان الامان کہنے لگ جاتے ہیں دوسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ ابن یمین نے آداب حسن و عشق کا لحاظ رکھا ہے اور حافظ نے شوخ مزاجی سے شعر کے مفہوم کو گرا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی پاس ادب نے شعر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کوئے جانان کے کتوں کی پابوسی خواجہ حافظ سے تو نہ ہوسکتی تھی نہ کبھی ہوئی۔ حسن و عشق کا ماجرا بیان کرنے والا ایک غزل گو شاعر۔ پھر پاس ادب ملحوظ۔ ایسی باتیں ہیں جو خیال میں نہیں آسکتیں۔

موسیا آداب داناں دیگر اند　　سوختہ جان و رواناں دیگر اند

مصرع زنہار عرضہ دہ بسگانش سلام ما۔ کہنا تو درکنار حافظ کتے کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ شیخ فیضی فرماتے ہیں۔

منم فیضی کہ در میدان معنی　　چو من چابک سوارے تیز تک نیست

بجلد شعر من از پوست تا مغز　　بجائے مردم ناپاک رگ نیست

بداں مے ماند ایں پاکیزہ گفتار　　کہ در دیوان حافظ نام سگ نیست

موجودہ دیوان حافظ کے نسخوں میں صرف ایک جگہ لفظ سگ آیا ہے اس کے متعلق بھی مولانا آزاد بلگرامی کہتے ہیں۔ کہ بعض دیوانوں میں یہاں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔

تیسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ پیالہ میں عکس رخ یار دیکھنا ایک دور کی بات ہے اور پھر یہ مضمون بھی ابن یمین ہی کا ہے۔ بہرحال دونو شعروں کو پڑھیئے اور انصاف سے کہئے کہ حافظ کا شعر کتنا بلند کتنا شوخ اور کتنا دلنشین ہے۔

آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ یہ خیال بھی ابن یمین کا ہے۔ اور اس کی سند میں یہ شعر کہا ہے

زلالہ زار جہاں یک پیالہ چوں خوردیم　　نمود طلعت ساقی درون این قدح

اب فرمائے کہ اس شعر کو خواجہ حافظ کے اس شعر سے کیا نسبت ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر کس قدر شیریں رواں اور لطیف ہے اور ابن یمین کا شعر ثقل محض ایک ہی خیال کو مختلف شاعر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ طرز بیان کس کا زیادہ پر لطف ہے ورنہ کسی شاعر کا کوئی شعر لیجئے ضرور اس کے ہم خیال شعر اور کئی شاعروں کے دیوانوں میں بھی موجود ہوں گے۔ مثلاً اسی خیال کو لیجئے سلمان ساؤجی نے کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

در ازل عکسِ لبِ لعل تو در جام فتاد　　عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

چوتھا شعر بھی حافظ کا کس قدر عالی شان ہے اور بگڑ کر کیا بن گیا ہے۔ (ترسم کہ صرفۂ نہ برد ژم کہاں اور (شاید برابری نہ کند) کہاں حافظ کا انداز بیان بہت پُر زور ہے اور نہایت لطیف طعن کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ پھر ان کو مال بنا کر شعر کی ساری خوبی ضائع کر دی گئی ہے لیکن ظلم ہے کہ آرگس صاحب حافظ کی مسخ شدہ غزل کو دیوان ابن یمین میں دیکھ کر الٹے حافظ کو چور بنا گئے۔ اس الحاق کی مثالیں دیوانوں میں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ شاید ان کا بیان کرنا چنداں مفید کار نہ ہو۔ عوام کے لئے یہ الحاق خطرناک غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ لیکن سخن شناس حضرات الحاقی غزلوں اور شعروں کو دیکھتے ہی اصلیت معلوم کر لیتے ہیں اور متاع سخن کو اس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح کسی مال پر ٹریڈ مارک لگا ہو۔

آگے چل کر آرگس صاحب فرماتے ہیں۔

"حافظ کا یہ شعر بہت ہی مایۂ ناز شعر شمار کیا جاتا ہے اور زبان زد ہو کر ضرب المثل کے درجہ تک پہنچ گیا ہے حالانکہ فی الحقیقت یہ ابن یمین کا خیال تھا جس کو حافظ نے اپنا لیا۔ حافظ کا شعر ہے

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ابن یمین کہتا ہے۔

روز اول کہ بنام ہمہ کس قرعہ زدرز　　قرعۂ عشق بنام من مسکیں افتاد

حافظ نے اگرچہ چستی بندش سے شعر کو بہت کچھ آراستہ کیا ہے مگر اس میں طلسم بندی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے پہلے مصرع سے واقعہ کے اوپر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ کہ یہ کب ہوا۔ اور نہ قرعۂ فال سے کوئی خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ حافظ نے جس لفظ کو بدل کر دیوانہ رکھا ہے وہ بظاہر بہت چست ہے مگر اس میں یہ نقص ہے کہ دیوانہ کو کسی امر کا ذمہ دار نہیں بنایا جاتا اور وہ غیر مکلف ہوتا ہے جس شخص کے ذہن میں آیت (اناعرضنا الامانۃ) نہ ہو اس کا ذہن اس واقعہ کی طرف منتقل ہونا غیر ممکن ہے۔ برعکس اس کے ابن یمین نے پہلے واقعہ کا وقت بتایا حالات کا اظہار کیا کہ اس وقت سب موجود تھے۔ پھر مسکین کے لفظ سے لفظ انسانی

بموجب آیہ (ظلوماً جہولا) پوری پوری تفسیر کر دی۔ حافظ کے یہاں یہ کچھ بھی نہیں ہے"

یہ شعر فہمی اس شعر فہمئ عالم بالا سے کسی طرح کم نہیں جس کا گلہ ایک مظلوم شاعر نے کیا تھا حافظ اور ابن یمین کے ان دو شعروں میں سوائے لفظ (قرعہ) کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ نہ ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ نہ ایک خیال کا اظہار ہے نہ انداز بیان میں کسی قسم کی یگانگت ہے خواجہ حافظ نے قرآن کریم کی ایک آیت کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب بیان کئے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں کہ اس سے بہتر صورت خیال میں نہیں آسکتی۔ ابن یمین نے جو کچھ کہا ہے اس کا مفہوم اردو کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

آرگس صاحب کو حافظ کے شعر میں سوائے لفظی طلسم کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا عجیب معقول اعتراض ہے کہ پہلے مصرع سے واقعہ کے اوپر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ یہ کب ہوا۔ حافظ کوئی تاریخ نہیں لکھ رہے تھے کہ واقعات کو سنہ وار بیان کرتے لفظ دیوانہ پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ دیوانہ مکلف نہیں ہوتا۔ یہ قانونی اعتراض بھی قابل داد ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے ذہن میں یہ آیت نہ ہو اس کے لئے اس شعر کا سمجھنا ناممکن ہے یہ تو آپ نے سچ فرمایا۔ لیکن جس شخص کا ذہن اس شعر کو پڑھ کر فوراً اس آیت کی طرف منتقل نہ ہو وہ پھر حافظ کے دیوان کو کیوں پڑھے اور "اس کی گلی میں جائے کیوں" آسمان۔ بار امانت اور دیوانہ کے الفاظ سے فوراً آیت یاد نہ آجائے تو اس میں حافظ کا کیا قصور ہے کیا آپ خواجہ صاحب سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ شعر میں سورۃ اور آیہ کا نمبر بھی لکھ دیتے۔ سب سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ کہ آپ نے لفظ مسکین کو ظلوماً جہولا کی پوری تفسیر کہہ دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں لفظ دیوانہ کو بے محل قرار دیا ہے معلوم نہیں کہ لفظ مسکین کو ظلوم وجہول سے وہ کون سی نزدیکی کی نسبت ہے جو لفظ دیوانہ کو نہیں۔

آرگس صاحب نے اس شعر کے علاوہ اسی مضمون پر ابن یمین کے اور شعر بھی تلاش کر کے لکھے ہیں۔

روز اول ز حوادث کہ قضا غم زدہ بود قرعۂ عاشق بیدل ہمہ برغم زدہ بود
برائے قتل اسیراں کہ قرعہ افگندند بنام ہیچو من بے گناہ بر دل شد
بنام کسے حال برزدی نہ بر آید این قرعہ بنام من باک تواں زد

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ

"اتنے شعروں کے لکھنے کے بعد یہ کہنا ایک فضول اور دور از کار بات ہے کہ یہ مضمون صرف ابن یمین کے دماغ سے نکل سکتا تھا اور حافظ نے اس کو لیا بھی تو اس صورت سے ادا نہ کر سکے جیسا کہ چاہئے تھا"

مجھے معلوم نہیں کہ ابن یمین کے ان شعروں کا خواجہ صاحب کے اس شعر سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر کچھ تعلق ہے بھی تو خواجہ صاحب کا

شعر ابن یمین کے شعروں سے کیوں پست ہے۔ البتہ۔ البتہ قوانین شریعت اور منطق کے قواعد کے مطابق اگر شعروں پر جرح کی جائے تو پھر شعر میں باقی کچھ نہیں رہ جاتا۔

—— ابن یمین کے اس مضمون پر سلمان ساوجی کا شعر بھی ملاحظہ ہو۔

عشق بر گشتن عشاق تغافل مے کرد   اولین قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد

اس کے بعد آرگس صاحب نے ابن یمین اور حافظ کے بعض ہم خیال شعر چن کر بالمقابل رکھ کر دکھائے ہیں۔ لیکن اس تقابل سے خواجہ صاحب کی فوقیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ برعکس اور ہم خیال شعر تو ہر شاعر کے مقابلے میں دوسرے شاعروں کے موجود ہیں۔ اس سے تقلید یا نقل یا اخذ ثابت نہیں ہوتا۔ آرگس صاحب نے اکثر صرف ایک دو لفظوں کے مشترک ہونے سے شعر بالمقابل لکھ کر رکھ دئے ہیں۔ مثلاً:-

حافظ		ابن یمین	
من از آن حسن روز افزون کہ یوسف داشتم	کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را	حسن زیبائے تو آندم کہ تجلی می کرد	سروسامان مرا عشق تو برہم زدہ بود
بنوش بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند	چنان نماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند	بنوش بادہ کہ وقت بہار می گزرد	پیالہ گیر دلا لالہ زار مے گزرد
دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم	با من چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من	عمرے ست تا کہ حسن رخ یار دیدہ ایم	حیران اوست دیدۂ معشوقہ باز ما
نقشے بر آب مے زنم از گریہ حالیا	تا کے شود قرین حقیقت مجاز ما	ابن یمین ز عشق بتاں منع کی تواں	چون گشتہ است عین حقیقت مجاز ما

جائے انصاف ہے کہ ان شعروں میں کون سی ایسی بات مشترک ہے جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ حافظ نے ابن یمین کے خیالات لئے اور انھیں "اپنا لیا" ہے

اس کے بعد آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن یمین کی ہم طرح غزلیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے پس پردہ ابن یمین بول رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزلوں کو دیکھ کر ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دعوی کہاں تک درست ہے:-

حافظ		ابن یمین	
در خرابات مغاں نور خدا می بینم	وین عجب بین کہ چہ نورے ز کجا می بینم	تا کہ من چہرۂ آن ماہ لقا می بینم	نا مسلمانم اگر جز بخدا می بینم
جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو	خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم	ہر کجا مے شنوم بوے ترا می شنوم	ہر طرف مے نگرم روے ترا می بینم
سوز دل اشک روان آہ سحر نالۂ شب	این ہمہ از اثر لطف شما می بینم	ہیچکس نیست کہ از زلف تو بوی آرد	مگر این خاصیت از باد صبا می بینم
خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن	فکر دور است ہمانا کہ خطا می بینم	مشکل است اے دل من جان بسلامت بردن	من کہ آن چشم پر از عین بلا می بینم
کس ندیدست ز مشک ختن و نافۂ چین	آنچہ من ہر سحر از باد صبا می بینم	بوسۂ کرد غمش ابن یمین جان مرا	طرفہ شاہے کہ در احسان گدا می بینم

—— حافظ کے تصوف اور ابن یمین کے تصوف کا مقابلہ کرتے ہوئے آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ:-

معاحافظ کا تصوف بالکل ابن یمین کا تصوف ہے اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ ابن یمین تصوف کو تصوف کے حدود میں رکھتے ہیں اور حافظ چونکہ وہ قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے یہاں حقیقت و مجاز اور پارسائی و رندی دونوں مخلوط ہوگئے ہیں۔ ابن یمین جس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں وہ عین حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور شاعرانہ خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ حافظ کہیں ان کی نقل میں کامیاب ہوتے ہیں کہیں محض لطف شاعری رہ جاتا ہے اور اصل مسئلہ میں کوئی جان باقی نہیں رہجاتی۔ الغرض حافظ کا تصوف ابن یمین کی نقل ہے جو بعض دفع مطابق اصل ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ حافظ کو تصوف سے صرف مقالاتی نسبت تھی ......"

اس بحث پر پہلے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بتایا جاچکا ہے کہ جس بات سے ابن یمین کی خواجہ صاحب پر فوقیت ظاہر کی گئی ہے وہی بات ابن یمین کی غزلیات کی ناکامیابی کا باعث ہے اور یہی حقیقت و مجاز اور رندی و پارسائی کا باہم مخلوط ہونا جو حافظ کے تصوف کا نقص بیان ہوا ہے۔ حافظ کی شاعری کے لئے کیمیا کا اثر رکھتا ہے۔

ذرا اور آگے چل کر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ حافظ کی شراب وہی معمولی تلخ اور بدبودار پانی ہے۔ برعکس اس کے ابن یمین جب اس رنگ میں کہتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے مثال کے طور پر چند شعر بھی پیش کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

از دستِ یار ساغر وحدت کشیدہ ایم — در بزم لامکاں ز مکین و مکاں جدا

بادہ رندان ما در ساغر و پیمانہ نیست — مستی ایں مے پرستاں از خم و خمخانہ نیست

ز چشم مست تو عشاق مے پرست شدند — ہمہ سبو کش بزم مے الست شدند

حریفے کو شراب عشق نوشد — دو عالم را بیک جرعہ فروشد

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ رنگ ابن یمین کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اسوقت کے اور شاعر بھی اکثر اس رنگ کے دلدادہ تھے اسی مضمون پر سلمان ساوجی کے چند شعر بھی دیکھئے

عجب آنکس کہ بدور لب تو مست مے ہست — مگر از بادۂ لعل لب تو بے خبر است

سلماں ترے جام الست ہست چنیں مست — تا ظن نبری کز خم و خمخانہ خراب است

در سر ز استماع الست ہست مستئ — مارا کہ احتیاج شراب و سماع نیست

دلم ز بادۂ روز الست رنگے یافت — ہنوز بوئے از ان بادہ در مشام من است

وغیرہ وغیرہ۔

مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ جو نشہ حافظ کے معمولی تلخ اور بدبودار پانی میں ہے وہ کسی دوسری شراب میں نہیں ہے

مضمون کے اختتام پر آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ ابن یمین اور حافظ کی یکجائی کا زمانہ چھ سات سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتا حافظ ابن یمین کے سامنے یا ان کے انتقال کے بعد شیراز پھر واپس آئے ہونگے۔ چونکہ ابن یمین موجود نہ تھے اور ان کو اسی زور و شور کے ساتھ شاعری کرنی تھی اور اب غالباً انکی کافی شہرت ہوچکی تھی لہذا انھوں نے سعدی اور خواجو اور سلمان ساوجی کے کلام کو اپنا رہبر بنایا اور اسی رنگ میں کہنے لگے"

بہر حال آرگس صاحب یہ ماننے پر ہرگز تیار نہیں کہ حافظ نے خود اپنی طبیعت سے بھی کچھ کام لیا آپ حافظ کے سارے دیوان کو اخذ و اتباع اور نقل و سرقہ کا ایک مجموعہ ہی کہہ سکتے ہیں زیادہ کچھ نہیں۔ سعدی سلمان ساوجی اور خواجو اور خواجہ حافظ کے متعلق تو بہت لوگ پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور میں بھی لسان الغیب میں ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لہذا اسی مضمون پر اور کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ابن یمین کا دیوان چونکہ نایاب تھا۔ اور اس دستیابی پر آرگس صاحب نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے اس لئے ان کے اس انکشاف پر کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوا۔

(**نوٹ**) میں یہ مضمون لکھنے لگا تھا کہ میرے ایک فاضل سخن شناس اور ادبیات فارسی سے گہری دلچسپی رکھنے والے دوست (ایم عبداللطیف خاں صاحب سب جج ایبٹ آباد) نے فرمایا کہ میں نے ایک نسخہ دیوان ابن یمین کا پشاور میں ایک دوست کے پاس دیکھا ہے چنانچہ انھوں نے میری درخواست پر وہ نسخہ منگوا لیا۔ جو آج میرے پاس ہے۔ دیوان ابن یمین کے متعلق بغیر اسے دیکھنے کے جو رائے میں نے ظاہر کی ہے دیوان کے مطالعہ سے اس کی پوری پوری تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ مضمون چونکہ پورا ہوچکا ہے اس لئے ابن یمین کے متعلق ایک مکمل اور مفصل بیان میں کسی آئندہ فرصت پر چھوڑتا ہوں

ابن یمین کے جس شعر سے آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن یمین کی ملاقات ثابت کی ہے اس کے متعلق میں اپنے شکوک پہلے ہی ظاہر کرچکا ہوں میرے پاس جو نسخہ دیوان کا پہونچا ہے اس میں بجائے لفظ حافظ کے لفظ خط لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ لفظ غلط ہے لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہاں کوئی اور لفظ تھا۔ جسے کسی نے حافظ بنایا کسی نے خط اور کسی نے کچھ اور۔ کاتبوں کی تحریف پر جو خدا جانے بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ ردیف الف میں میں نے ایک اور شعر اسی قبیل کا دیکھا ہے

بعد ازین ابن یمین از طعنہ دشمن چہ باک　　مثل او چوں بادشاہ محتشم داریم ما

آرگس صاحب نے طعنہ اغیار سے جو دلآویز نتیجے نکالے ہیں۔ اس دوسرے شعر کے دیکھنے سے ان کی حقیقت روشن ہوجاتی ہے۔

میر ولی اللہ

(افسانہ)

(۱)

مرادؔ نے سات سال کے اندر نہ صرف اپنی ساری جائداد تلف کی بلکہ آمنہ کے پاس بھی جو کچھ تھا اسکو بھی صہبا و "منزامیر" کی نذر کر دیا اور اسکی رندی و ہوسناکی بدستور قائم رہی۔ "مے ومعشوق" نے اس کو یہاں تک رسوا کیا کہ آخرکار وہ اپنے ممتاز عہدہ سے برطرف کر دیا گیا اسپر بھی اس کے حواس بجا نہ ہوئے، اور ہوتے کیسے؟ مرادؔ اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں کچھ ایسا مٹ چکا تھا کہ اب اس میں غیرت وخودداری کا احساس بھی باقی نہ تھا۔ دنیا ومافیہا کے ساتھ ساتھ وہ روز بروز اپنی ذات کو بھولتا چلا جاتا تھا۔ ہاں اگر کبھی کبھی کوئی خیال اس کے دل میں خلش پیدا کر دیتا تھا تو وہ یہ تھا کہ اپنے ساتھ اپنی بیوی کی زندگی بھی غارت کر رہا ہے۔ بعض اوقات تو یہ خیال اسپر اس طرح قابو پالیتا تھا کہ وہ پہروں رویا کرتا تھا۔ اسوقت شراب وکباب یا رقص وسرود بھی اس کی تلخیوں کے احساس کو دور نہ کر سکتے تھے اور وہ اپنے کرب واضطراب سے بے بس ہو کر زندگی کا خاتمہ کر لینا چاہتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مراد کی طبیعت میں فطرتاً جو لطیف عناصر موجود تھے وہ کبھی کبھی اسکو ابھار کر سطح عام سے بلند کر دیتے تھے۔

مرادؔ فیض آباد کے ایک سربرآوردہ خاندان کا لڑکا تھا۔ اس کی تعلیم وتربیت بڑے بڑے ارمانوں سے ہوئی تھی۔ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بھی پختہ مغز بنا دیا گیا تھا اور اس کی طبیعت قدیم وجدید کے اختلاط کی بہترین مثال تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا اس میں ان کمزوریوں کا شائبہ بھی نہ تھا جو عموماً بڑھے ہوئے لاڈ پیار کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ دور ونزدیک مراد حسن سیرت کے لحاظ سے ایک قابل تقلید نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہونہار لڑکا تھا اور گھر والوں کی بڑی بڑی امیدیں اُس سے وابستہ تھیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندانی اقبال کا ستارہ اور بھی چمک اُٹھیگا۔

ہاجرہ مراد کی پھوپھی کی لڑکی تھی۔ وہ اس کا بچپن سے دلدادہ تھا۔ ہاجرہ اور مرادؔ نے ایک ہی گھر میں پرورش پائی تھی۔ مذاق کی یکرنگی اور طبیعت کی ہم آہنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا گردیدہ بنا دیا اور گرویدگی آہستہ آہستہ اس حد تک پہنچ گئی جہاں سے پلٹنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے اب نہ ہاجرہ مرادؔ کو بھول سکتی تھی نہ مرادؔ ہاجرہ کو۔ دونوں کی وابستگی کا یہ انداز دیکھکر خاندان میں یہ طے پاچکا تھا کہ آگے چلکر وہ ایک دوسرے کے رفیق زندگی بنائے جائینگے۔ مرادؔ اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب انٹرنس کے بعد اسکو

لکھنؤ جانا پڑا تو اس کا سرمایۂ تسکین صرف یہ خیال تھا کہ ہاجرہ بہت جلد اس کا ایک اپنا گھر بسانیوالی ہے۔ ہاجرہ بھی اُسکو اپنا سرتاج مان چکی تھی اور بے صبری کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب اس کے اور مراد کے درمیان کوئی حد فاصل نہ ہوگی۔ لکھنؤ سے بی اے کرنے کے بعد مراد آئی۔سی۔ایس کرنے کی غرض سے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا بیوہ ماں کے جینے کا سہارا اب صرف یہ اُمید تھی کہ اس کا مراد فارغ التحصیل ہو کر بہت جلد لوٹنے والا ہے اور اس کے سر سہرا بندھنے والا ہے۔ مراد لوٹا اور اپنی خدمت پر مامور ہو گیا —————— شادی کو تقریباً دو مہینے رہ گئے تھے سرو سامان مہیا کئے جا رہے تھے۔ ہاجرہ کے لئے مکان میں ایک نئے حصہ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مراد اپنی آئندہ زندگی کے نقشے درست کر رہا تھا۔ دفعتاً ہاجرہ کو ایک روز شام کو شدید تپ چڑھی چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ ذات الریہ ہے۔ مراد اسوقت بارہ بنکی میں تھا۔ اسکو اطلاع ملی تو ایک دفعہ تو اُسکو چکر آ گیا مگر اس نے اپنے کو سنبھالا اور دل کو یہ تسلی دیتا ہوا کہ شاید خدا اسکی معصومیت اور بے گناہی کے صلہ میں اب بھی اسکی ہاجرہ کو بچائے۔ وہ فیض آباد چل کھڑا ہوا یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسکی لکشمی اس کی زندگی کو معمور کرنے سے پہلے مٹا کر چلی گئی ہے۔ ہاجرہ سپرد خاک ہو چکی تھی۔ مراد پر آسمان ٹوٹ پڑا اور کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے دنیا اندھیری ہو گئی جو فضا ابھی تک صاف و شفاف تھی یکایک گرد و غبار سے اٹ گئی اور مراد کی زندگی کے اوراق یہیں سے سیاہ ہونے لگے

انسان کے بننے بگڑنے کے لئے ایک اشارہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ صرف چند لمحے ہوتے ہیں جو قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بس ایک بہانہ چاہیئے اور زمین آسمان اور آسمان زمین ہو جاتا ہے۔ اس جانکاہ واقعہ کے بعد ایک دور تو عجیب انتشار میں گزرا یعنی اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کس طرح اپنا جی بہلائے۔ مگر آخر کار اُس نے "مے و مینا" سے شغل شروع کیا اور جن آزمائشوں سے وہ یورپ کی فضا میں بھی متاثر نہ ہوا تھا اب اپنے کو اکدم ان کے حوالہ کر دیا۔ اس سے واقعی وہ اپنے درد کے احساس کو بھولا یا نہیں اس کا جواب خود اس کی آئندہ زندگی دیگی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے اپنے دنیا کی تمام آزمائشوں کے ہنگامہ میں چھوڑ کر دنیا کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کر لی شراب کو "ام الخبائث" کہا گیا ہے۔ مراد نے اس کو منہ لگا کر گویا ہر برائی اپنے لئے جائز کر لی۔ شب و روز وہ تھیٹر یا کسی "نازنین" کے پہلو میں بسر کرنے لگا لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے پردے ہٹ جاتے تھے اور وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ یہ سب خود فریبی ہے ورنہ صلیت یہ ہے کہ اس کا درد بدستور قائم ہے"۔

ہاجرہ کی موت کے سال بھر بعد لوگوں نے تحریک شروع کی کہ مراد شادی کر لے۔ مراد کو بھی خیال ہوا کہ شاید اس طرح وہ اپنی گمراہی کو بھول جائے اور ایک عورت کے ہاتھوں ممکن ہے اس کی نجات ہو جائے۔ چنانچہ بڑی جستجو کے بعد اس نے آمنہ کے ساتھ شادی کر لی جو بریلی کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی تھی۔

---

(۲)

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ تاہل کی زندگی پچاس فیصدی صرف اس لئے بدمزہ رہتی ہے کہ فریقین میں سے کسی نہ کسی کو پہلے سے محبت میں ناکامی ہوچکی ہے ۔میرے دوست کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط مگر یہ واقعہ کہ یہاں مراد اور آمنہ دونوں محبت کی لذتوں سے آشنا ہوچکے تھے ۔شاہد آمنہ کا رشتہ دار تھا اور اس سے دو سال عمر میں چھوٹا تھا۔بچپن سے آمنہ کی تصویر اس کے دل پر اس طرح اتر گئی تھی کہ اب مٹائے نہ مٹ سکتی تھی جس سال آمنہ کی شادی ہوئی ہے اسی سال شاہد۔ایم۔اے کرکے لاہور میں فلسفہ کا پروفیسر ہوگیا تھا۔آمنہ کی شادی کا علم اسکو ہوا تو اس کی کیا حالت ہوئی اس کا صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا۔اس کے تیور سے اس کے جذبات کا کوئی اظہار نہ ہوتا تھا۔وہ فلسفی اور شاعر تھا اور طبعاً خاموش اور سنجیدہ۔وہ اپنی مایوسیوں کو قابل احترام سمجھتا تھا اور ان کو رسوا کرنا نہ چاہتا تھا۔وہ آمنہ کی محبت کرتا تھا اور اسی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا تھا۔اس کو اسکی بھی فکر نہ تھی کہ آمنہ ممکن ہے اپنی نئی مصروفیتوں میں اسکو بھول جائے۔وہ خود آمنہ کو پوجتا تھا۔اور اس کا ایمان یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کر رہا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ دنیا کی ساری کتابیں ہضم کرجانے سے اس کو وہ چیز نصیب نہیں ہوگی جو آمنہ کی محبت سے نصیب ہوئی ہے۔بہرحال شاہد پر "شکست آرزو" کا اثنا اثر ہوا اور آمنہ کو اور بھی محویت اور یکسوئی کے ساتھ چاہنے لگا۔وہ خود مراد کے مقابلہ میں غریب تھا اسکو قوی امید تھی کہ مراد آمنہ کی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنا سکیگا اور وہ اس خیال سے بہت خوش تھا۔

ہندوستان کی عورت صرف شوہر پرستی کے لئے بنائی گئی "پتی بھگتی" کا تخیل یہاں عملی صورت میں پیش کیا گیا ہے دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ہندوستان کی آب و ہوا بھی کچھ اس کے لئے موافق ثابت ہوئی۔زمانہ نے کروٹوں پر کروٹیں بدلیں۔انقلاب پر انقلاب ہوتے رہے۔مگر ہندوستان عورتوں کے معاملہ میں جہاں تھا وہیں رہا۔البتہ موجودہ صدی نے طبقۂ اناث میں چند ایسی ہستیاں پیدا کردی ہیں جو "روایات قدیم" کے قیود سے عورتوں کو آزاد کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کی صدائے احتجاج "نقار خانہ میں طوطی کی آواز" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

آمنہ یوں تو کہنے کے لئے نئی روشنی میں پلی تھی لیکن تھی آخر ہندوستان کی عورت۔اس نے ایک سال کی قلیل مدت میں نہ صرف شاہد کو اپنے دل سے بھلایا بلکہ مراد کے ساتھ ایسی موانست اور یکجہتی پیدا کرلی جس پر محبت کا گمان ہوتا تھا۔لیکن در اصل ایسے لگاؤ کو قلب و روح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔شادی کے بعد عورت کی انفرادیت عموماً فنا ہوجاتی ہے۔آمنہ پہلے سمجھتی تھی کہ مراد کو سدھا لیگی لیکن اس کی یہ اُمید وہم سے زیادہ نہیں ثابت ہوئی۔اس کے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا اور مراد کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہوا۔وہ اپنی گندی زندگی کا خوگر ہوگیا تھا جب انسان سمجھ بوجھ کر اپنے کو دھوکہ دینے لگتا ہے تو کوئی قوت اس کو راہ راست پر نہیں لاسکتی یہی حالت مراد کی تھی۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ روز بروز اس کی پراگندگی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے پھر بھی اپنی بے اعتدالیوں سے منہ نہ موڑ سکتا تھا

"تردامنی" اس کے جینے کا بہانہ تھی ورنہ وہ ابتک خودکشی کرچکا ہوتا۔

مراد کو بہت جلد اپنی نئی غلطی کا علم ہوگیا۔ آمنہ سے شادی کرکے وہ تازہ آفت میں گرفتار ہوگیا اس کو یہ خیال ستانے لگا کہ اپنے ساتھ وہ اپنی بیوی کو بھی برباد کررہا ہے اور اس کو وہ ایسا گناہ سمجھ رہا تھا جس کا کوئی کفارہ نہیں۔ جائداد کا جو حصہ باقی رہگیا تھا اسکے اس نے آمنہ کے نام لکھدیا تھا۔ مگر آمنہ نے رفتہ رفتہ پھر اسکو مراد کی نذر کردیا۔ یہی نہیں بلکہ میکہ سے جو کچھ لائی تھی اُسے بھی حوالہ کردیا اور اب اس کی عسرت سے بسر ہورہی تھی۔ شوہر کی خوشنودی کا جہاں یہ معیار ہو وہاں محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آمنہ صدمے پر صدمے اور کوفت پر کوفت اٹھا رہی تھی مگر زبان سے اف نہ کرتی تھی۔ مراد کو خود اس کا دکھ تھا لیکن کوئی چارہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آمنہ کے والدین نے اکثر چاہا کہ دونوں میں جدائی کرادیں مگر آمنہ اس کی روادار نہ تھی۔

جب مراد ایک نہایت کمینہ جرم کی سزا میں اپنی ملازمت سے برخاست کردیا گیا تو خود اس نے طے کرلیا کہ اب آمنہ کو آزاد کردے گا اور خوامخواہ اس کی زندگی تلخ نہ کرے گا۔ اس نے رو کر آمنہ سے کہا "دیکھو آمنہ میں نے بہت چاہا کہ تمھارے لئے اپنے کو پستی سے ابھار دوں خود تم نے اس معاملہ میں اپنا پورا زور لگایا مگر تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میری اصلاح ناممکن ہے اور میرے ساتھ رہکر تمھاری بربادی لازمی ہے میں اب اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ سیاہ قلب ہونے کے باوجود ابھی مجھ میں اچھا برا سوچنے کی قوت باقی ہے میں اس قابل نہیں کہ تمھارے حسن اور تمھاری محبت سے اپنی زندگی کو پرکیف بنا سکوں۔ میں اب جاتا ہوں اور کہیں اپنی شرمناک ہستی کو اس طرح چھپاتا ہوں کہ کسی کو یہ بھی علم نہ ہوگا کہ زندہ ہوں یا مرگیا۔ تم للہ اپنے لئے دوسری دلچسپیاں مہیا کرلو میں امید کرتا ہوں کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ شاہد اب بھی موجود ہیں۔ اس کو بھول جاؤ کہ مجھ جیسی ناپاک ہستی سے کبھی تمھارا دامن باندھا گیا۔ پھر تم سکون واطمانیت کے سانس لے سکوگی۔ میں جس گرداب میں بہ رہا ہوں بہنے دو۔ اس زندگی میں میری نجات ہونیوالی نہیں خوامخواہ کوفت نہ اُٹھاؤ میں نے اس سے پہلے بھی بارہا یہی چاہا تھا لیکن اس خیال سے کچھ کر نہ سکا کہ تم کو ملال ہوگا"۔

مراد اس کے بعد بڑی دیر تک روتا رہا۔ آمنہ بھی اس کے جسم سے لگی ہوئی رو رہی تھی۔ آج اس کو اپنا غبار نکالنے کے لئے کافی موقع ملگیا تھا۔ مراد نے شاہد کا نام لیکر اس کی رگوں میں ہلکا سا ہیجان پیدا کردیا تھا اور اب اس کے جذبات مخلوط تھے۔

آمنہ نے خوشامدیں کیں۔ ہاتھ جوڑے قسمیں دلائیں۔ مراد نے ایک نہ سنی اس کا دل پتھر کا ہوگیا تھا وہ اسی میں آمنہ کی بہبود سمجھتا تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے۔ اس کے پاس اب بھی کچھ روپے موجود تھے اس میں سے نصف آمنہ کے نام بنیک میں جمع کرکے اور نصف اپنے گزر اوقات کے لئے لیکر بمبئی چلا گیا اور ایک مختصر سا مکان لیکر رہنے لگا۔ اب وہ ایسا محسوس کررہا تھا کہ اس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے اس کے بعد اس نے پھر کبھی آمنہ کی صورت نہیں دیکھی۔ اس نے بمبئی میں ایک سیٹھ کے وہاں ڈیڑھ سو ماہوار کی نوکری بھی کرلی تھی جس سے وہ اپنی رکیک خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا سکتا تھا۔

(۳)

کچھ دنوں بعد آمنہ کو اس کے میکہ والوں نے بلالیا۔ اب ان کو فکر تھی کہ کسی طرح مراد کو مجبور کیا جائے آمنہ کو طلاق دلوادیں اور پھر شاہد کے ساتھ شادی کردیں۔ چنانچہ مراد کا پتہ لگایا گیا اور اسکو اس کی بابت لکھا گیا۔ اس نے مختصراً جواب میں لکھدیا کہ بہت جلد اس کا انتظام کرونگا۔ اور خاموش ہو رہا۔

اب آمنہ کی دلبستگی کا اگر کوئی ساماں تھا تو اس کا لڑکا تھا جس کی عمر تین سال کی تھی۔ اس کی انتہا مسرت اسی بچہ کی دیکھ بھال تھی۔ آمنہ اپنے کو اس قابل بھی نہ پاتی تھی کہ شاہد سے کسی قسم کی امید لگائے۔ اس کا وہ اپنے کو حقدار نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اب بھی اسی کو غنیمت سمجھتی تھی کہ مراد اس کے پاس واپس آئے اور اپنی روش کو بدل کر سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزاردے اس نے مراد کو خط پر خط روانہ کئے لیکن مراد نے کسی کا جواب نہ دیا۔ آمنہ ہر طرح سے مایوس ہو گئی۔ جب وہ گھر میں شاہد کا ذکر سنتی تو اس کو بڑا صدمہ پہنچتا اور وہ اٹھکر چلی جاتی تھی۔ شاہد کے نام سے وہ گھبرانے لگی تھی۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے جس آزمائش سے آمنہ اتنا بچنا چاہتی تھی اسی کا مجبوراً سامنا کرنا پڑا جس نے آخر میں سارا نقشہ ہی بدل کر رکھدیا۔ اس کا بچہ بیمار پڑا اور حالت خطرناک ہونے لگی۔ آمنہ کی آخری مسرت بھی اس سے چھن رہی تھی اس کو ہر چہار طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آرہی تھی۔ اور اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ جینا اس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا ایسے وقت میں شاہد غیر اختیاری طور پر جو کام کر گیا اس نے آمنہ کو اور بھی متفکر کردیا۔

شاہد گرمیوں کی چھٹیوں میں بریلی آیا ہوا تھا۔ آمنہ کی حسرتناک زندگی کا علم اس کو پہلے سے تھا اور وہ اندر ہی اندر اس فکر میں گھل رہا تھا۔ مگر یہاں آکر اس کو جو دھکا لگا اس کا اسے کبھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ آمنہ اب وہ آمنہ نہ تھی۔ وہ پھول سا چہرہ اب سوکھ کر بالکل بے رنگ ہو گیا تھا۔ جو آمنہ کبھی بغیر مسکرائے ہوئے بات نہ کرتی تھی اب پہروں گزر جاتے تھے چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اور مسکرانا تو گویا اس نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ جو آنکھیں صرف حکومت کے لئے بنائی گئی تھیں اب رحم و تلطف کی طالب معلوم ہوتی تھیں یہ سب کچھ تھا لیکن شاہد نے ایک نامعلوم ادا اب بھی اس میں ایسی پائی جو اس سے خراج پرستش وصول کرنے کے لئے کافی تھی وہ آمنہ کو اب بھی منسردا ماننے پر مجبور تھا۔

آمنہ کوشش کرکے شاہد سے پہلو بچارہی تھی اور شاہد بھی اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا چنانچہ وہ خود آمنہ سے الگ الگ رہتا تھا آمنہ کے ماں باپ البتہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح شاہد سے آمنہ بہل جائے اور اپنی کلفتوں کی یاد دل سے مٹادے۔ لیکن نہ آمنہ اسکا موقع دیتی تھی نہ شاہد کوئی تحریک کرتا تھا اسی طرح پندرہ بیس دن گزرے ہوں گے کہ دفعتاً آمنہ کا لڑکا بیمار ہوا اور یہ دھوکہ کا حجاب ہٹ گیا۔

شاہد آمنہ کی سراسیمگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اُس نے بلا آپس کی گزشتہ زندگی کی طرف کوئی اشارہ کئے ہوئے بچہ کی تیارداری کرنی شروع کی۔ اُس نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اور ایک دھن کے ساتھ بچہ کی خدمت لگا رہا۔ آمنہ کا خدا اسید ھا تھا۔ اس کا ظفر بائیسویں روز اچھا ہوگیا اور اب آمنہ کو سوچنے کا موقع ملا۔

شاہد کے طرز عمل کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ نہ تو وہ اسکو احسان سمجھنا چاہتی تھی نہ محبت۔ شاہد نے پھر تکلف شروع کر دیا تھا اور آمنہ اب اس سے کچھ گفتگو کرکے اپنی طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن دونوں تنہائی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہد سگریٹ پیتا جاتا تھا اور اخبار پڑھتا جاتا تھا۔ آمنہ پر اسکی اس ادا نے گہرا نقش کیا۔ اُس نے تھوڑی دیر غور کیا پھر ایک عجیب اندوھناک لہجہ میں شاہد کو مخاطب کرکے پوچھا

"کیوں شاہد کیا تم مجھ سے کچھ کشیدہ ہو؟"

"شاہد کو یہ سوال ناگوار گزرا مگر اُس کی آواز اسوقت ایسی دکھ بھری تھی کہ اُسکا دل تڑپ گیا اور اُس نے پوچھا" کیوں؟ تم کو یہ خیال کیوں ہوا؟

"کچھ نہیں۔ یونہی تمھاری ہر وقت کی خاموشی سے مجھے گمان ہوا کہ شاید مجھ سے کچھ مکدر رہو" آمنہ نے جواب دیا اور کسی سوچ میں پڑگئی شاہد نے اخبار کو رکھ دیا اور آمنہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ منتظر تھا کہ آمنہ ابھی کچھ اور کہیگی مگر آمنہ کی گویائی اب کام نہیں دیتی تھی۔ وہ آنکھیں جھکائے ہوئے اسی طرح سوچتی رہی آخرکار شاہد نے کہا "سنو آمنہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو میں جو اتبک تم سے کھل کر نہیں ملا اُس کی وجہ یہ تھی کہ تم خود مجھ سے بچتی رہی ہو۔ تمھاری حالت اسوقت ایسی ہے کہ خفیف سے خفیف بہانہ تمھارے دل کو اور بھی مجروح کر سکتا ہے اس لئے میں بھی تم سے گریز کرتا رہا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک تم سے کبھی غافل رہا ہوں اور نہ ہو سکتا ہوں تمھاری محبت میرے لئے نت نئی کیفیتوں کا باعث رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ مجھے اس کا بھی ملال نہیں کہ تمھاری شادی دوسرے کے ساتھ ہوگئی ہے۔ ہاں تمھاری المناک زندگی پر البتہ میرا بال بال روتا ہے" شاہد اتنا کہکر چپ ہو رہا۔ اب اس کی رگوں میں ایک شورش نمودار ہو چلی تھی۔

آمنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر زار زار رونے لگی۔ جب خوب جی کھول کر رو چکی تو شاہد کے پہلو میں کرسی کھینچکر کہنے لگی "ہاں شاہد میں جانتی تھی کہ تم دھن کے پکے ہو تمھاری طبیعت کا رنگ ہمیشہ سے پختہ تھا۔ تم مجھے نہیں بھولے یہ میرے لئے مرمٹنے کی بات ہے۔ لیکن دیکھتے ہو خود زمانہ مجھے مٹا رہا ہے میں بھی تم کو چاہتی تھی اور مجھے شادی بے انتہا گراں گزر رہی تھی جب اپنا بس نہ چلا اور مراد کے ساتھ میرا نکاح ہوگیا تو میں نے اپنے مقدر سے موافقت پیدا کرلی اور تم کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئی یا نہیں؟ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ صرف کوشش کرکے تمھاری گنہگار ہو چکی اور اب مجھے اس کا کوئی حق نہیں کہ تم سے محبت کی امید کروں بلکہ اب تو مجھے اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ تم اب تک مجھے اسی طرح

چاہتے ہو۔ ہاں تو میں نے بہت چاہا کہ مراد کو تباہی سے بچا کر اپنی قسمت کا پانسہ پلٹ لوں لیکن سب بے سود۔ مراد پر دہ جن سوار تھا جو کسی کے نہیں اتر سکتا تھا۔ وہ اپنی پہلی محبت میں تلخکام ہو چکا تھا اور اب اس کے لئے ناممکن تھا کہ کسی چیز سے لذت حاصل کر سکے۔ باقی حالات تم کو معلوم ہوں گے۔ اب میرے خیر خواہوں کو پھر یہ فکر ہے کہ تمھارے ساتھ از سر نو زندگی شروع کر دوں۔ مگر شاہد میں تمھارے قابل نہیں مجھ میں کسی کے لئے کوئی دلفریبی نہیں ہو سکتی لوگوں نے مراد کو لکھا ہے کہ وہ مجھے طلاق نامہ بھیجدے۔ میں اس کو پسند نہیں کرتی مجھ اس لئے نہیں کہ مراد سے مجھے اس قدر محبت ہے بلکہ اس لئے کہ میں پامالی سے بچنا نہیں چاہتی۔ میں زندگی سے عاجز ہو چکی ہوں میں جانتی ہوں کہ تم میری ہمیشہ محبت کرتے رہے اور اس معاملہ میں میں کبھی تم سے آنکھ نہ ملا سکوں گی۔ لیکن ذرا سوچو تو مجھے اپنی شریک زندگی بنا کر کیا کرو گے؟ مطلقہ عورت کس کام کی؟ تم اگر واقعی مجھے چاہتے ہو تو جو میں کہوں وہ کرو۔ بمبئی جاؤ اور مراد سے ملو۔ میرے برباد کرنے والے کو بلا لاؤ۔ اُس سے کہو کہ "آمنہ جھونپڑوں میں تیرے ساتھ گلی گلی کی خاک خوشی سے چھاننے کے لئے تیار ہے تو تنہا کیوں مٹ رہا ہے کوئی اور بھی مٹنے کے لئے تیری راہ دیکھ رہا ہے۔ تجھ جو کچھ کرنا ہے وہ آمنہ کے سامنے کر وہ تیرے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کریگی بلکہ خود بھی تیری ہم آواز ہو کر بربادی کو لبیک کہیگی" جاؤ شاہد تمھیں اگر میری محبت ہے تو میرا یہ کام کر دو۔ اگر اب بھی مجھے اپنی دیوی مانتے ہو تو مراد کو بلا لاؤ۔ میں اسی کے لائق رہگئی ہوں تم صحیح مذاق رکھتے ہو اس لئے جو کچھ میں نے کہا اس کا تم کو صدمہ نہ ہونا چاہئے جس طرح ابتک میری یاد سے دل خوش کرتے رہے اب بھی کرو۔ مجھ سے میری یاد ہی بہتر ہے کیونکہ وہ آلودگیوں سے یکسر پاک ہے سمجھو کہ میں مٹی میں مل گئی۔۔۔۔ تو بولو بمبئی جاؤگے؟"

شاہد چند منٹ تک تو آمنہ کا منہ تکتا رہا۔ اس کو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ آمنہ جذبات کی رو میں اس طرح طوفاں برپا کر سکتی ہے اس قیامت خیز منظر کا اسپر یہ اثر ہوا کہ اُس نے سوا اس کے ایک حرف نہیں کہا کہ "ہاں ضرور جاؤں گا اور جہاں تک ہو سکے گا تمھاری مدد کرونگا"

شاہد کا اعتقاد یہ تھا کہ آمنہ کے حسب منشاء کام کر کے وہ اپنی محبت کو غیر فانی بنا سکتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی آمنہ نے کسی خواہش کا اظہار کیا اس نے بلا چون وچرا کے اس کے مطابق عمل کیا۔ وہ اس راز کو جانتا تھا کہ اس جگہ فلسفہ و منطق کو کوئی دخل نہیں۔ ذوق و وجدان کو وہ عقل کے ہاتھوں گندا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تین دن بعد اس نے بمبئی جانے کے لئے سامان کیا اور آمنہ کو دلاسا دے کر روانہ ہو گیا۔ آمنہ نے پھر غور کیا تو شاہد کی یہ ادا اس کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اپنی ذات سے شرمانے لگی۔ اس دن سے شاہد کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ذہن سے نہیں ٹلا۔ شاہد واقعی فرشتہ تھا۔

---

(۴)

مراد بمبئی پہنچکر اور بھی بے لگام ہوگیا تھا۔ شراب اور عورت کے سوا اسکو معلوم بھی نہ تھا کہ دنیا میں کوئی اور چیز بھی ہے۔ وہ سرمستی اور بیخودی کے عالم میں اپنے دن کاٹ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی اس زندگی سے بیزار تھا اور ناکامی کے روح فرسا احساس کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ دن رات کی شراب نے اس کی صورت کو مسخ کردیا تھا۔ اس کو اسکی فکر نہ تھی۔ اس کو ہوش بھی نہ تھا کہ صبح کب ہوتی ہے اور شام کب۔ اسی عالم بے حسی میں اس کو آمنہ کے والدین کی تحریر ملی جسمیں آمنہ کے لئے اس سے طلاق مانگا گیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ وہ سب کچھ طے کرچکا ہے اور اس کو اک گونہ یکسوئی تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ جب تک وہ آمنہ کو بھی اپنے ساتھ منظر عام پر لاکر ذلیل ورسوا نہ کریگا دنیا اسے چین نہ لینے دیگی اس کی بے چینیوں کا دورہ پھر شروع ہوا اور اس کی عقل کام نہ دیتی تھی کہ کیا کرے۔ اس کی تندرستی روز بروز سرعت کے ساتھ خراب ہورہی تھی اور اپنی وہ موت کا بے صبری کے ساتھ انتظار کررہا تھا۔ مگر جس بات کا کوئی وقت متعین ہو اس کا انتظار ہی کیا۔ مراد نے بریلی لکھنے کو تو لکھدیا کہ میں انتظار کررہا ہوں کہ آمنہ کو تاتونا آزاد کردوں۔ لیکن دراصل کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا

مراد اسی اُدھیڑبن میں پڑا تھا کہ شاہد پہنچا۔ مراد کی خلش اور بڑھ گئی جسوقت شاہد مکان میں داخل ہوا۔ مراد نشہ میں چور پڑا تھا اور مینا ہارمونیم پر کچھ گاکر اس کو سنا رہی تھی۔ بمبئی میں مراد نے کئی عورتوں سے مراسم پیدا کئے اور چھوڑ دیے تھے۔ اب اسکو مینا کے ساتھ انہماک تھا جو ایک مشہور تھیٹر میں ایکٹرس تھی اور گانے کی ماہر تھی اس کی آواز میں ایسا لوچ تھا جس نے سارے شہر کو مبہوت کررکھا تھا۔ نہ جانے کتنے کروڑپتی اس کے "آستان ناز" پر زمین بوس ہونے کے آرزومند تھے لیکن مینا کے استغنا اور انداز بے نیازی نے انکی آرزوؤں کو دل ہی دل میں پامال کردیا۔ ہاں اگر وہ خود کسی کی تمنائی تھی تو مراد کی۔ مراد تو اول اول یہ سمجھا تھا کہ اس سے بھی چندروز ربط رہیگا لیکن وہ اب تک اس سے تعلق قطع نہ کرسکا تھا اور بظاہر مینا کے ساتھ اسکی مصروفیت دیرپا اور مستقل معلوم ہوتی تھی۔

شاہد کو یہ دیکھکر مراد کسی قدر گھبرا گیا مگر پھر اپنے کو سنبھال کر اُٹھا اور آگے بڑھ کر تپاک کے ساتھ بغلگیر ہوا شاہد نے ایک ہی نگاہ میں جان لیا کہ زندگی اس کے لئے ایک عذاب ہوکر رہگئی ہے جسکو وہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکیگا اس کا مخبوط چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ اپنے کو صرف دھوکہ دے رہا ہے ورنہ حقیقتاً وہ دنیا کی کسی چیز سے لطف حاصل کرنے کی صلاحیت بھی کھوچکا ہے

مراد نے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر مینا کی طرف اشارہ کرکے کہا "شاہد میں ان کا تعارف کرانا چاہتا ہوں یہ بمبئی کی ایک مشہور ایکٹرس ہیں اور گانے میں شاید سرسوتی یا آرفیوس ان کا مقابلہ کرسکے تو کرسکے۔ آج کل میرے جینے کا بہانہ صرف ان کی ذات ہے اس سے زیادہ تم خود تھوڑی دیر میں معلوم کرلوگے" یہ کہکر اس نے مینا سے کچھ گانے کی فرمایش کی۔

مینا نے نہایت متانت کے ساتھ اپنی سفید ریشمی ساری کا آنچل برابر کرکے گانا شروع کیا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم بالا کھینچکر اس دنیا کی طرف چلا آرہا ہے۔ سارا کمرہ ایک ایسی نئی فضا سے معمور ہوگیا تھا جو اس دنیا کی چیز نہ تھی۔ خود شاہد اپنی رگوں میں ایک

لہر محسوس کر رہا تھا۔

جاڑے کی رات تھی۔ ۹ بجگئے تھے۔ شاہد اپنا پیغام سنانے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا لیکن اس رات کو وہ مراد سے کوئی کام کی بات نہ کر سکا۔ مراد نے اس کے دیکھتے دیکھتے "کاگ نیگ" کے ساتھ گلاس خالی کر دئے تھے اور اب وہ بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ کچھ دیر تک اس نے مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے انسان کے اعمال پر اور ان کے مکافات پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ درمیاں میں اپنی بدکرداریوں پر کئی بار رویا بھی۔ آخر کار جب اتنی تاب بھی نہ رہی تو لڑکھڑاتا ہوا آرام کرسی سے اٹھا اور بلا کچھ کہے جا کر پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ مینا نے مراد پر ایک حسرتناک نگاہ ڈال کر شاہد سے کہا "مجھے بڑی فکر رہتی ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ میں اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر چکی ہوں کہ انکی یہ گری ہوئی حالت سنبھل جائے۔ مگر یہ خود زندگی سے کچھ ایسا بیزار معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کی کوئی تدبیر نہیں چل پاتی۔ مجھے نہ جانے ان کے ساتھ کیوں محبت ہوگئی ہے حالانکہ یہ محبت کی چیز نہ تھے۔ مجھے ان کا بڑا دکھ ہے۔" مینا کے ایک لفظ سے بوئے خلوص آرہی ہے جس کی اس قماش کی عورتوں سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ شاہد نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا اپنی سعی ناکام کا آپ ہی کو غم نہیں ہے اس سے بیشتر وہ ہستی ان کو سیدھی راہ دکھانے کی کوشش میں مایوسی اٹھا چکی ہے جس کو انکی صلاح کا دعویٰ کرنے کا واقعی حق تھا مگر اب خدا ہی انپر رحم کرے" اس کے بعد مینا شاہد کو کھانا کھلانے لگی۔

رات بھر شاہد نے خیالات کے تلاطم میں گزار دی۔ اُس کو مراد کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ اور آمنہ کی خستہ حالی پر تو اس کا دل ہی خون ہو رہا تھا۔ اور اسپر مستزاد اس کے اپنے جذبات جو آمنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ غرضکہ شاہد کی رات عجیب خلفشار میں کٹی۔

صبح ہوتے ہوتے شاہد کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ کسی کے قدموں کے چاپ سے اسکی نیند اچٹ گئی۔ مراد نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "شاہد مجھے معاف کرنا میری رات کی حالت نے شاید تمھیں بے کیف کر دیا ہو لیکن میری گزشتہ نو دس سال کی زندگی پر غور کرتے ہوئے مجھ روسیاہ کو معاف کر دو۔ میں نے اس وقت تمھارے آرام میں خلل ڈالا ہے۔ مگر وہ اس لئے کہ تم سے پھر تنہائی میں اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملیگا۔ ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں مینا ناشتہ وغیرہ تیار کر کے ہماری صحبت میں شریک ہو جائیگی اور اس کے بعد میں سر کھپانے دفتر چلا جاؤنگا۔ اور شام کو پھر وہی پروگرام رہیگا جو کل تم دیکھ چکے ہو اس لئے ابھی جو کچھ باتیں کرنا ہو کر لو پہلے یہ بتاؤ تمھارا یہاں آنا کس غرض سے ہوا؟" یہ کہکر اس نے شاہد کو ایسی مترحم نگاہ سے دیکھا گویا خوب جانتا تھا کہ اس کے آنیکی تقریب کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خمارِ شب کے آثار باقی تھے اور وہ صورت سے مخبوط معلوم ہوتا تھا۔

شاہد نے متین اور سنجیدہ تیوروں سے چند منٹ تک دیکھا اور مراد کے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیکر آمنہ کا پیغام اُس کی زبان میں سنا دیا اور پھر اُسکی زار و زبوں حالت کا نقشہ کھینچکر کہا "اگر تم اس کی بہتری کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کرو" شاہد کا لب و لہجہ کسی قدر خشک تھا۔

مراد کو بھولی ہوئی الفاکیاں یاد آگئیں۔ اس نے چند منٹ محویت کے عالم میں گزارے۔ پھر شاہد سے کہنے لگا "میں جانتا تھا کہ تم اسی لئے آئے ہو۔ مگر صرف ایک امید موہوم تھی کہ شاید تمھاری کوئی اپنی غرض تم کو لے آئی ہو۔ یعنی میں فیصلہ کن لمحہ سے بچنا چاہتا تھا۔ خیر انسان اپنی زندگی میں دنیائے واقعات سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے مگر خدا کے لئے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسکو غور سے سنو اور انصاف سے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی یعنی آمنہ کے ساتھ شادی کرلی مجھے اُمید تھی کہ میں ایک خوبصورت اور خوش سلیقہ بیوی کے ہاتھوں بن سکتا ہوں اس میں بڑا دھوکا ہوا۔ لیکن جب اس غلطی کو درست کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خوامخواہ نباہتا رہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آمنہ کی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم پھر دھوکہ میں ہو" شاہد نے بات کاٹ کر کہا "اسکی بگڑی ہوئی حالت کا تم کو کوئی اندازہ نہیں۔ وہ خود اپنی زندگی کو بنانا نہیں چاہتی۔ وہ تمھارے ساتھ گلی گلی سرگرداں پھرنے کے لئے طیار ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں تمھاری "شریکِ زندگی" بننا چاہتی ہے اسپر ترس کھاؤ اور واپس چلکر صورت حال کو بدلنے کی ایک دفعہ پھر کوشش کرو"

"ٹھہرو" مراد نے جواب دیا میری پوری بات سن لو پھر اپنی کہنا۔ آمنہ ایک فرض شناس عورت ضرور ہے لیکن ایسی حالت میں میرے ساتھ اس کے فرائض کیا ہو سکتے ہیں جبکہ میں خود اپنے واجبات سے پہلوتہی کر رہا ہوں۔ آمنہ کی بیدلی اور بیزاری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ اس کو سہارے کی ضرورت ہے اور شاہد کہنے کی اجازت دو میری امیدیں تم سے ہیں۔ تم ایسے بُرے وقت میں اس کے کام آؤ وہ گرنا چاہتی ہے۔ اسے گرنے نہ دو۔ سنبھال لو" مراد جس بات کا کہنا سب سے زیادہ دشوار سمجھ رہا تھا اسے نہایت کامیابی کے ساتھ کہہ گیا۔ شاہد گھبرا گیا۔ اس کے چہرے پر رنگ آنے لگا۔ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں مراد نے سلسلہ پھر شروع کیا "میں نے جو کچھ کہا وہ بغیر سوچے سمجھے نہیں کہا ہے۔ میں اگر انساں ہوں تو تم فرشتہ ورنہ تم انسان ہو اور میں ذلیل ترین کیڑا۔ میں ہرگز آمنہ کی جان نثاریوں کا مستحق نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی محبت بچپن سے کرتے رہے ہو میں نے خوامخواہ تم کو اس سے محروم کر دیا تھا۔ جاؤ اس کا دل ہاتھ میں لو۔ وہ تم سے بہل جائیگی اور اپنی اگلی مصیبتوں کو بھول جائیگی وہ بھی تمکو دل وجان سے چاہتی رہی ہے۔ جب وہ بیاہ کر آئی ہے تو مدتوں خواب میں تم کو یاد کرتی رہی ہے۔ وہ تم سے معافی مانگا کرتی تھی۔ شاہد یہ نہ سمجھنا کہ مجھے رشک ورقابت کا احساس ہوتا تھا مجھے نہ اس کا کوئی حق تھا نہ کوئی وجہ بلکہ برعکس مجھے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ آمنہ بھی کسی کو چاہتی ہے جس کی سپردگی میں اس کو دیا جا سکتا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ تم آمنہ کے ذمہ دار بنو۔ مختصر یہ کہ مجھ سیہ کار سے بازگشت کی اُمید نہ رکھو" مراد کا دم پھولنے لگا تھا اس کی مخمور آنکھوں میں ہیجان تھا اور اب وہ چپ تھا شاہد دنگ تھا۔ اس کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مراد ایسے جذبات کے اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ مراد ایسی آلودگیوں میں ایسے لطیف خیالات کہاں سے پیدا کر سکا۔ شاہد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کہے۔

آخرکار اس نے سوال کیا "کیوں مراد تم اس طرح پامال وخاک بسر ہوکر اپنے کو کیوں خراب کر رہے ہو؟ کیا اب یہ ناممکن ہے کہ اس روش سے باز آؤ اور زندگی کا ایک نیا دور شروع کرو؟"

مراد کا دل اس سوال سے تڑپ گیا اور اس نے کہا "بجائے اس کے کہ تم کو کوئی جواب دوں میں اپنی ابتک کی زندگی پر ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہرچند کہ یہ میرے لئے ایک بڑی آزمائش کا کام ہے پے بہ پے تجربات نے بتا دیا ہے کہ دنیا میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں زندگی میرے لئے ایک قید بے زنجیر ہے کہنے کو یوں تو قسمت نے مجھے خراب کیا۔ میری افتادگیوں کی بانی ہاجرہ کی موت ہوئی مگر یقین مانو میں سیاہ دل اب اس قابل نہیں رہا کہ محبت جیسی لطیف چیز یا ہاجرہ جیسی پاک ہستی کو اپنے سے منسوب کروں۔ محبت اور اس کی کیفیتوں کا تصور بھی اب باقی نہیں۔ آہ!

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے لائے تھے یہاں دل حزیں ہم

اب میں یہ کہنے کا حق تو رکھتا نہیں کہ ہاجرہ کی یاد میں اپنے کو فنا کر رہا ہوں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میرے میں مجھے کوئی لذت نہیں ملتی۔ میں نے ہر ممکن ذریعہ آزمایا لیکن میری طبیعت بہل نہ سکی آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے مینا کے ساتھ عشق ہوگیا ہے۔ لیکن اس عشق کا بہتر علم مجھی کو ہے بس اس کے ساتھ وقت ضائع کر دینا چاہتا ہوں اور بس۔ البتہ مینا کو مجھ سے شدید محبت ہوگئی ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر دیکھئے وہ بھی مجھے گمراہیوں سے نہیں بچا سکتی۔ محبت کی قدر کرنے کی اہلیت مجھ سے چھن گئی ہے بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ "عرش نشین" بھی اگر اتر کر آئے تو میری اصلاح نہیں ہو سکتی اس حالت میں جو کوئی مجھ سے تعلق رکھیگا وہ بھی تباہ ہو جائیگا۔ چنانچہ مینا کا مستقبل مجھے اندوہناک نظر آرہا ہے۔ لیکن اس کو بچاؤں تو کیسے بچاؤں۔ فی الحال اس سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا اس لئے شاہد تم جاکر آمنہ کے دل کو دوسری طرف متوجہ کردو۔ میں اس کی بہبود کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب یہ تمھارا کام ہے ہاں بریلی سے کچھ عرصہ ہوا ایک تحریر آئی تھی کہ میں آمنہ کو طلاق نامہ لکھکر یکقلم آزاد کردو۔ اگرچہ میں اس کو آمنہ کی کھلی ہوئی رسوائی اور توہین سمجھتا ہوں مگر سوا اس کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ تم جاؤ میں جلد سے جلد اس کا انتظام کرتا ہوں۔ بس اب اس معاملہ میں مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ آمنہ اور ظفر کے ساتھ میری بہترین دعائیں ہیں" مراد نے گفتگو کو ختم کر دیا اتنے میں مینا چا وغیرہ تیار کر کے پہنچ گئی۔

شاہد کی پھر ہمت نہ ہوئی کہ مراد سے گھر واپس چلکر آمنہ کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے اصرار کرتا۔ مراد نے اسکی زبان بند کردی شام کو شاہد بمبئی سے ایک عجیب کشمکش میں روانہ ہوا۔

(۵)

شاہد کے چلے جانے کے بعد مراد کا انتشار بڑھ گیا۔ وہ سوچتا تھا کہ اور کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتا تھا۔ کبھی تو آمنہ کو طلاق نامہ لکھکر بھیجنے پر

آمادہ ہوجاتا ہے اور کبھی خودکشی کرکے اپنی شرمناک زندگی کا خاتمہ کرلینے کی ٹھان لیتا تھا ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور اس نے کچھ نہ کیا آخرکار ایک دن اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ زندگی کے پاپ سے اپنے کو آج چھڑا لیگا اور اس نیت سے اس نے ایک نہایت زود اثر اور مہلک زہر مہیا بھی کرلیا رات کو حسب معمول مینا تھیٹر میں کام کرنے چلی گئی اور چلتے چلتے مراد سے کہہ گئی "دیکھو خدا کے لئے شراب زیادہ نہ پینا اور دروازہ کھلا رکھنا میں دو بجے کے قریب آؤنگی" مراد نے اس کے جواب میں اس کا منہ اس طرح چوما جس نے مینا کو حیرت زدہ کردیا۔ مینا نے آج اس کے بوسہ میں ایک نئی لذت محسوس کی جس کی وہ توجیہ نہ کرسکی۔ اس کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر ملازمت سے مجبور تھی۔

مراد نے کمرہ بند کرلیا اور شراب کی بوتل سامنے رکھکر اور ایک گلاس پی کر خود بخود کہنے لگا "خدا کا قادر مطلق ہونا بھی انسانیت پر کتنا بڑا ظلم ہے! فطرت بھی کیسی ضدی اور خود سر ہے! انسان اس کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے جس کو وہ جس طرح چاہے رکھے یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے ۔۔۔۔۔۔! مگر نہیں خدا یا فطرت محض ایک بہانہ ہے انسان نے اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے کے لئے اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ایک ڈھکوسلہ پیدا کرلیا ہے میری بدنصیبیوں کا ذمہ دار خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں اگر اپنی زندگی کو سدھار نہیں سکتا تو خودکشی کیوں نہیں کرلیتا۔ یہ سراسر اپنی کمزوری ہے۔ بس اب کل ہی صبح مراد کی گندی سانسوں سے پاک ہوگی۔ آمنہ تجھے طلاق کی بھی ضرورت نہیں، مراد خود آزاد ہو رہا ہے اور تجھے بھی قید سے آزاد کر رہا ہے مجھے قوی اُمید ہے کہ دنیا اپنی بیشمار مصروفیتوں میں تجھکو بہلالیگی۔ ہاجرہ میں تیرا گنہگار ہوں تیری محبت کو میں نے نہ جانے کیسی کیسی غلاظتوں میں آلودہ کیا ہے۔ مجھے تجھ سے معافی کی توقع نہیں لیکن نہیں تو معاف کردیگی۔ تیرا دل عفو کا گنجینہ ہے البتہ مینا کی مجھے فکر ہونی چاہئے۔ وہ جب مجھے نہ پائیگی تو اس کا کیا حال ہوگا وہ بیچاری میری بُری طرح گرویدہ ہوگئی ہے میرے بغیر اس کا جینا محال ہوجائے گا۔ مگر دنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ مینا کا بھی کوئی نہ کوئی ٹھکانا نکل ہی آئیگا۔ میں اپنی دنیا تو اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ آنیوالی دنیا اپنا نظام آپ درست کرلیگی"۔ یہ کہکر اُس نے زہر کی پڑیہ جیب سے نکال لی اور ایک گلاس شراب میں گھول کر منہ تک لیگیا اور پھر ہٹالیا۔ اس کی قوتِ ارادی زائل ہوچکی تھی۔ وہ آج بھی زہر نہ کھا سکا اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد زہر آلود شراب کو پھینک دیا۔ اسی کے ساتھ اسکی آشفتگی پھر بڑھنے لگی۔ وہی انتشار پھر شروع ہوا۔ اس نے اس کا علاج یوں کیا کہ شراب کی پوری بوتل خالی کردی اور جاکر لیٹ رہا۔ مینا جب واپس ہوئی تو اُس نے مراد کو سوتا پایا اُسکو بڑا اطمینان ہوا اس لئے کہ باوجود کثرت شراب نوشی کے مراد کو بے خبری کی نیند بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ مینا خود بھی کپڑے اُتار کر سو رہی۔

سورج اپنی پوری آب و تاب سے نکل آیا اور مراد سوتا رہا۔ چار کا وقت گزر گیا اور مراد سوتا رہا۔ مینا نے اُس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب نو بجگئے اور دفتر جانے کا وقت قریب آگیا تو مینا نے مراد کو جگانا چاہا۔ مراد نے جنبش تک نہ کی مینا نے لحاف کھینچکر الگ پھینک دیا۔ مراد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مینا نے غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کا عجیب رنگ تھا کئی بار نام لیکر

پکارا۔ مگر مراد نے حرکت بھی نہ کی۔ مینا کو تشویش ہونے لگی اتنے میں اُسکو معلوم ہوا کہ مراد سانس نہیں لے رہا ہے مینا ایک چیخ مارکر اُسکی چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹروں نے آکر دیکھا تو پہلے اُن کو خیال ہوا کہ مراد نے زہر کھا لیا ہے۔ مگر لاش چیرنے کے بعد کسی قسم کے زہر کا پتہ نہ لگ سکا اور اب یہ رائے قائم کی گئی کہ موت قلب کی حرکت کے رُک جانے سے واقع ہوئی۔ سبب جو کچھ بھی ہوا ہو یہ واقعہ ہے کہ مراد زندگی کی قید سے رہا ہو گیا اور مینا بے یار و مددگار ہو گئی۔

(۶)

مراد نے سچ کہا تھا کہ آمنہ کو اگر کوئی سنبھالنے والا ملجائے تو وہ سنبھل جائیگی۔ وہ مٹ اس لئے رہی تھی کہ اُس کو کوئی اُبھارنے والا نہ تھا۔ شاہد بمبئی سے ارادہ کر کے چلا تھا کہ جس طرح سے بھی ہو سکیگا آمنہ کو بربادی سے بچائیگا۔ اسکو بریلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کو مراد کی حیرتناک موت کی خبر ملی اس کے راستہ میں جو ممکن رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں اُنکا اندیشہ بھی مٹ گیا۔

مراد کی موت کا آمنہ پر جو اثر ہوا ہو اس سے بحث نہیں اُسکو کتنا ہی بڑا صدمہ پہونچا ہو مگر اس کے اثرات دیرپا نہ تھے شاہد کی محبت ایسی نہ تھی جو آمنہ کو اپنا نہ بنا لیتی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی مصیبت بھولتی گئی۔ شاہد کامیابی کے ساتھ اس کے اندر ایک نئی روح پھونک رہا تھا اور آمنہ میں زندگی کی علامتیں نمودار ہو رہی تھیں شاہد کا سب سے بڑا منتر یہ تھا کہ اسکو آمنہ کے ظفر کے ساتھ شدید محبت تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن سچی اور کچھ دن رسمی سوگواری میں بسر کرنے کے بعد آمنہ شاہد کی بیوی ہو گئی اور اب یہ دونوں بہترین معیار کی زندگی بسر کر رہے ہیں

مینا البتہ خراب ہو گئی۔ مراد کے مرنے کے بعد چند ماہ اس نے اسی مکان میں کاٹے وہ اسٹیج سے کنارہ کش ہو گئی تھی اور مراد کی ایک چیز سے اپنے دل کو تسکین دیتی تھی مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے بمبئی چھوڑ دیا اور اب خبر نہیں کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے خدا جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

اکبر، آئین اکبری میں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

چونکہ ابوالفضل کی تحریر بادشاہ کے نظر سے اکثر گزرتی تھی اس لئے وہ اپنی تحریروں میں اکثر چھوٹی چھوٹی اخلاقی نصیحتیں لے آتا تھا تاکہ مزاج میں سنجیدگی پیدا ہو ایسے بہت سے فقرے ہیں لیکن میں صرف ایک فقرہ درج کرتا ہوں:-

ایک دانشمند فرمانروا محض افواہ پر دھوکا نہیں کھا سکتا بلکہ دوراندیشی اور احتیاط کو پیش نظر رکھکر مستعدی کے ساتھ ہر معاملہ کی تحقیق کرتا ہے کیونکہ سچائی کمیاب اور جھوٹ عام ہے۔ اس کو لازم ہے کہ ان لوگوں کے خلاف جنھیں اس نے کسی خاص سبب سے اونچا بخشا ہے شیشہ میں نہ پڑجائے کیونکہ عموماً بلا سبب ایک زمانہ اون سے عداوت رکھنے لگا تھا اور بدطینت لوگ اکثر نیکی کا جامہ پہنکر بیگناہوں کی تباہی اور پامالی کا سبب بنجاتے ہیں" اکبر اگرچہ جلد باز تھا پھر بھی دوستوں کے ساتھ اس کا برتاو سچا تھا اور اس کا وزیر ابوالفضل تو خاص طور پر مرتے دم تک اس کی مراعات سے مستفید ہوتا رہا یہانتک کہ اس کی وفات کے بعد اکبر نے نہایت خلوص کیساتھ اس کا ماتم بھی کیا ہے۔

اکبر کے اخلاق کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے:-

"بادشاہ کی یہ ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ لوگوں کے قلوب مسخر کریں اور اُن کی پاسداری فرمائیں، باوجود ہزاروں اشغال کے اس کے آئینہ خاطر پر غبار نہیں آنے پاتا بلکہ ہمیشہ شگفتہ دل رہتا ہے۔ وہ نہایت جانفشانی کے ساتھ حق کی رضاجوئی کرتا ہے اور اپنے دل کو ہر وقت دوراندیشی اور غور و خوض میں مستغرق رکھتا ہے۔ وہ ہر خورد و کلاں کی بات پر کان لگاتا ہے اور کبھی ایسا موقع نہیں آنے دیتا کہ غصہ سے غضبناک ہو جائے اور بادشاہ قصہ گو مقرر کرتے ہیں تاکہ سرمایۂ غنودگی حاصل ہو برخلاف اس کے ہمارا بادشاہ انکی باتیں اس لئے سنتا ہے کہ بیدار رہے وہ اپنے اوپر ریاضت صوری و معنوی دونوں لازم کئے ہوئے ہے اور اعتراضات سے بچنے کی خاطر ظاہری ارکان کی بجا آوری کرتا ہے وہ نہ کسی مذہب کی تضحیک کرتا ہے نہ اُنپر زبان طنز کھولتا ہے، وہ اپنے فرائض کی بجا آوری سے غفلت نہیں کرتا وہ ہمیشہ سرگرمی کیساتھ خدا کی سپاس گزاری اور اپنے اعمال کا احتساب کرتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ مجرموں کی جان بخشی کرتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ اپنی تمام رعایا پر خوشحالی وقف کر دے بادشاہ کو چوبیس گھنٹے کے وقفہ میں ہر شخص دو مرتبہ دیکھ سکتا ہے وہ اکثر چھجہ پر آکر بیٹھتا ہے اور وہیں بلا کسی اور توسط کے خود عرضیاں لیتا ہے وہ اپنی تمام رعایا پر انصاف اور آسودگی کی تقسیم، خود اپنی خوشی و فرحت کے لئے نہایت ضروری جانتا ہے"

اس میں شک نہیں کہ اکبر کا معیار حکومت اعلیٰ درجہ کا تھا اور شاید مرقس اریلیس[۱] کے سوا اکبر سے پہلے کوئی بادشاہ ایسا بلند خیال پیدا

---

[۱] مرقس اریلیس پیدائش ۱۲۱ء وفات ۱۸۰ء انٹانی نس پیس کا متبنیٰ بیٹا ۱۶۱ء میں بجائے اسکے روم کا شہنشاہ ہوا بڑا فاضل اور زبردست فلاسفر تھا اسکی تصانیف میڈی ٹیشن (ذکر و فکر) کے نام سے مشہور ہیں اور بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوگئی ہیں اور دنیا کے بہت بڑے حصہ میں نہایت شوق کیساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ

نہ ہوتا تھا اکبر کی قوانین حکومت عملی طور پر بالکل ایسے ہی ہیں جیسا کہ تیمور کے منضبط قواعد اس نے زمین کی پیمائش کرا کے اسے قسم وار قرار دیا۔
اس نے ٹیکسوں میں ترمیم کی۔ قحط اور گرانی کے زمانہ میں جزو یا کل معاف کر دیا اُس نے کل حربی محاصل معاف کر دئے اُس نے ناپنے کیواسطے پیمانے مقرر کر دئے جن کے ذریعہ سے زمین کی مالیت اور حیثیت کا انداز ہ کرایا پھر اسپر مالگزاری تشخیص کی" ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں پر اُس نے نصف محصول کم کر دیا جو پانچ فیصدی رہگیا سرکاری ملازموں کے فیس کا پیچیدہ اور غیر منصفانہ طریقہ یا تو قطعاً موقوف کر دیا یا ان کی پیچیدگی رفع کر دیگئی ملازمین عام طور پر خزانہ شاہی سے تنخواہ پانے لگے نقشہ جات مرتب کئے گئے اور اسی لحاظ سے دہ سالہ محاصل کی تشخیص کی گئی غرض ہزاروں طریقہ سے معاملات ملکی قانونی پابندیوں سے منضبط کئے گئے۔ مختلف حاکموں اور سرداروں کے لئے جو ہدایات نافذ کی گئی تھیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:-

(نائب سلطنت) اس کو ہمیشہ رعایا کی آسودگی مدنظر رکھنی چاہئے کسی کی جان نہ لے گا جب تک کامل غور و خوض نہ کرے دادخواہوں کو انتظار کی تکلیف نہ دیگا۔ جو لوگ تصور سے نادم ہو کر خواستگار معافی ہوں ان کو معاف کرنا چاہئے۔ سڑکوں کو خطرات سے محفوظ رکھنا چاہئے اسکو یہ اپنا فرض منصبی سمجھنا چاہئے کہ زراعت پیشہ صناعوں کا ہمدرد ہو"۔

(قاضی) بلا خیال جانب داری و طمع اُسے بیداد گر اور ستم رسیدہ میں تمیز کرنی چاہئے اور پھر اسی کی موافق عملدر آمد کرنا چاہئے"۔

(کوتوال) اسکو سچا، راستباز اور ایماندار ہونا چاہئے اسے لازم ہے کہ بیکاروں کو کچھ تجارتی کام سیکھنے پر مجبور کرے، کم وزن سکوں کی عوض بھیک کمی کے لحاظ سے بٹہ لینا چاہئے تیز شراب کے پینے سے لوگوں کو منع کرنا چاہئے اسکو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لوگ چھپکر کیا کرتے ہیں وہ کسی بیوہ کو بلا اسکی دلی رغبت کے ستی نہ ہونے دیگا"۔

(کلکٹر) اس کو زراعت پیشہ لوگوں کی خبر رکھنی چاہئے، اس کو کسی درمیانی شخص کی ضرورت نہ ہونی چاہئے جن کاشتکاروں کو روپیہ پیسہ کی حاجت ہو قرض دے اور پھر مناسب میعاد کے اندر وصول کرے اسے عمدہ انتظامات پر انعام تقسیم کرنا چاہئے۔ اس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا مطالبہ قرار داد سے بڑھنے نہ پائے مالگزاری نرمی کے ساتھ وصول کرنی چاہئے۔ تکلیف دہ محاصل کا مطالبہ نہ ہونا چاہئے"۔

یہ اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں کی بعض اصل دستاویزات اب بھی موجود ہیں رہا یہ امر کہ ان پر عمل بھی ہوتا تھا یا نہیں سو اس کا یقین کرنے کے لئے کافی اسباب موجود ہیں۔ اکبر ہنوز تیرہ برس کا تھا کہ سریر آرای تخت سلطنت ہوا اُس وقت سے اٹھارہ برس کی عمر تک وہ اپنے اتالیق اور وزیر اعظم بیرم خان ایک بڑے معزز شریف کے زیر تربیت رہا اسی سے اکبر نے فن جنگ کی تعلیم پائی اور روزمرہ سلطنت کے معمولی کاموں کے عیب و ہنر کو دیکھتا رہا۔ اُسوقت کا طرز حکومت وہی تھا جو تیمور نے وضع کیا تھا۔ یہ واقعی تیموری کے اصول تھے۔ جن کی ہمایوں اور بابر ایسے دانشمند اور فیاض بادشاہوں کی بڑھی ہوئی شجاعت اور تربیت نے اصلاح کر دی تھی اس میں شبہہ نہیں ہے کہ اکبر کے دل پر ان اصولوں پر غور و فکر کرنے سے بڑا گہرا اثر پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اس کو ہندوستان میں حکومت کرنی ہے تو لازم ہے

کہ وہ بڑے بڑے ہندو راجاؤں سے صلح رکھے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ قدیم اصول حکومت زیادہ آزادانہ سے نہ برتے جاتے اسی خیال سے اکبر نے ملکی اور مذہبی آزادی جائز رکھی اور پرانے اصول میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی۔ ممکن ہے کہ بیرخان نے اس تجویز کی تائید نہ کی ہو لیکن بہرحال یہ یقینی ہے کہ حرم نے اس کے خلاف سازش کی۔ اٹھارویں برس اکبر نے بیرخاں کو اس کی باغیانہ تحریر یک معاف کر کے اور اس کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کر کے حج کی غرض سے مکہ معظمہ بھیجدیا اور عنان سلطنت بطور خود مختار بادشاہ کے اپنے ہاتھ میں لی جس کا آغاز ۱۵۶۰ء سے ہوتا ہے سنہ جلوس کے اٹھارویں سال ۱۵۷۰ء تک وہ بغاوتوں کے فرو کرنے یا جدید صوبہ جات کے فتح کرنے میں مصروف رہا اور یہ سلسلہ کم و بیش اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اُسکے وسیع مقبوضات پر اسکی باقاعدہ حکومت نہ قایم ہوگئی یہ ابتدائی زمانہ واقعی جنگ و جدال اور فوجی کارناموں سے پر ہے۔

ابوالفضل ۱۵۷۳ء میں یعنی اکبر کی حکومت کے پہلے دور کے اختتام پر دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ اس وقت تک اکبر اچھا خاصہ مسلمان تھا۔ زیارت کو جاتا اور بزرگان دین کی مزاروں پر طواف کرتا تھا۔ اس کی حکومت کا یہ دوسرا دور (۱۵۷۳ء سے ۱۶۰۵ء تک) اگرچہ لڑائیوں اور بغاوتوں سے خالی نہ تھا لیکن یہ زمانہ خاصکر اس لئے قابل یادگار ہے کہ اس نے صلح کے ساتھ بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ ایرانی لامذہبوں اور ہندوؤں کے ساتھ اس کا بے تعصبانہ برتاؤ خصوصاً سلطنت کے آخری زمانہ میں اس کی طرز حکومت کا ایک بڑا گر تھا جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مذہبی ایذا رسانی اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہتی ہے یہ انسان کو اپنی ذاتی رائے چھپانے پر مجبور کرتی ہے اور ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ مذہبی معاملات سے اس کی ابتدائی بے تعصبی نے بعد میں ایک عقلی مذہب کی بنیاد قائم کی جسمیں اکبر نے بالکل ویسا ہی جیسا کہ رومن بادشاہ کیا کرتے تھے خود اپنے کو بطور اوتار کے پیش کیا۔ آفتاب کو آسمانی طاقت کا مظہر مان کر بادشاہ روزانہ اوسکی پرستش کرتا اور لوگ بادشاہ کو زمین پر اس قدرت کا قائم مقام سمجھکر اس کی عبادت کرتے۔ ابوالفضل نے اکثر جگہ اس "دین الہی" یا "وحدانیت" کا جیسا کہ یہ نیا عقیدہ کہلایا جاتا تھا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

"انسانی تاریخ میں کوئی چیز اجرائے مذہب سے زیادہ عجیب تر نہیں ہے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک جدید مذہب تمام قدیم ادیان کا سختی کیساتھ بطلان کرے بلکہ موجودہ ضرورت کے مطابق ان میں رد و بدل کرنا چاہئے"۔ "دین الہی" نے اکبر کے زمانہ میں بہت مقبولیت حاصل اور اس کے جانشین کے عہد میں بھی کچھ دونوں جاری رہا لیکن زمانہ بادشاہ کی رفتار کیساتھ خود بخود اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ روزانہ چار بار یعنی علی الصباح، دوپہر، مغرب اور نصف شب کے وقت بادشاہ خدا کی عبادت کرتا تھا۔ اعتدال ربیع کے قریب سال میں ایکبار بلوری شیشہ کے ذریعہ سے آگ آسمان سے حاصل کیجاتی تھی اور اس آسمانی آگ کو مناسب اشخاص کے سپردگی میں دیدیا جاتا تھا (ابوالفضل خود ان لوگوں کا سردار تھا) اور جب سال آخر ہو جاتا تھا تو پھر تازہ آگ حاصل کرتے تھے۔ بڑے بڑے زرین و سیمیں لگنوں مین کافوری شمعیں رات کے وقت بادشاہ کے خیمہ میں روشن ہوتی تھیں اس کے ہر کام میں اس قدر سختی کے ساتھ قاعدہ کی

پابندی ہوتی تھی کہ محل میں مشعلوں کی تعداد میں چاند کی تاریخوں کیساتھ اضافہ ہوتا تھا۔ چاندرات کو آٹھ فتیلے روشن ہوتے تھے اور چوتھی سے دسویں تاریخ تک ہر رات میں ایک کم کرکے روشن ہوتے تھے تاکہ دسویں کو صرف ایک کافی رہے اور اسی طرح ہمیشہ چاندنی راتوں میں ہوا کرتا تھا۔ تیل اور پرانے کپڑے کی ٹھیک ٹھیک مقدار جو ہر فتیلہ کے لئے دی جاتی تھی بیان کی گئی ہے۔ پھر ابو الفضل روحانی ہدایت کے متعلق لکھتا ہے کہ "خدا نے انسان کی فطرت یہ رکھی ہے کہ وہ اپنے کام کی تعریف کرتا ہے اور دوسرے کے کاموں میں عیب نکالتا ہے، اس طرح مختلف لوگ مختلف عقیدے رکھتے ہیں اور اپنے اپنے خیالات و تاویلات میں مست رہتے ہیں" لیکن ایک وقت آتا ہے کہ انسان پر حق کا ظہور ہو جاتا ہے جب کوئی معمولی عام آدمی علم کے اس درجہ تک پہونچ جاتا ہے تو وہ آدمیوں کے خوف سے سکوت اختیار کئے رہتا ہے اور جب یہ نور کسی بادشاہ کو عطا ہوتا ہے جیسا کہ اکبر کو عطا ہوا تھا وہ موقع زبان کھولنے کا ہے۔ پھر بھی شہریار نے کچھ عرصہ تک اپنے اس اسرار پر پردہ ڈالا تاکہ بیگانوں کو اس علم نہ ہونے پاوے آخر کار اس نے اپنی ملکوتی صفات کا اعلان کیا اور اس کی روحانی کرامات کا مختلف طور پر اظہار کیا گیا۔ جو لوگ اسکی صحبت میں رہے ان کے علم میں ترقی ہوئی غربا اور حاجتمند اس سے محبت کرنے لگے اس نے پیشینگوئیاں کیں اور امراض کا دفعیہ بھی کیا، بادشاہ موقع اور محل پر دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کرتا ہے اور اکثر آدمی اپنی قابلیت کے لحاظ سے اسکی عمدہ تقریروں سے محفوظ ہوتے ہیں، آگے چلکر ابو الفضل لکھتا ہے "یہ مناسب موقع نہیں ہے کہ اُن طریقوں کی پوری تفصیل بیان کیجائے جس سے بادشاہ لوگوں کو ہدایت کرتا ہے ورنہ بہت سے خوارق عادات بیان کئے جاسکتے ہیں جو اس سے صادر ہوئے اگر میری زندگی نے کافی مہلت دی اور زمانہ نے فرصت دی تو میرا ارادہ ہے کہ میں ایک دفتر اس دلچسپ عنوان پر تصنیف کرونگا"

ظاہر ہے کہ بیکمزاج ابو الفضل اپنے اس موعودہ تصنیف کو ملتوی کرنے پر مجبور رہا اور یہ بھی عیاں ہے کہ "دین آلہی" میں درحقیقت اصلی روحانیت نام کو نہ تھی۔ اس مذہب کی بنیاد زیادہ تر دلائل پر مبنی تھی۔ کوئی زبردست خرق عادت اور ظاہری علامت ایسی نہ تھی جس پر بھروسہ کیا جاتا۔ "جو خرق عادات" اکبر کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ بہت معمولی ہے اس نے لکھا ہے عقیدہ اس چیز کا نام ہے جو سچ نہ ہو"۔ اکبر نے اپنے ہم مشرب لوگوں سے پورے طور پر ان کے عقاید کا احتساب نہیں کیا۔ وہ اس کی مرضی کے دلدادہ تھے اور اس کے مراعات سے علانیہ فائدہ اٹھاتے تھے اور اس کے منصفانہ اور عادلانہ حکومت میں خوشحال تھے۔ شاہی مذہب اکبر کی سرپرستی سے اس کے بعد اس کے جانشین کے عہد میں قائم رہا لیکن خود بادشاہوں نے اسپر کم توجہی کی اور جیسویٹ فرقہ کے عیسائیوں اور مسلمان ملاؤں کو اجازت دی کہ وہ ان کے روبرو مباحثہ کریں اور مذہبی اعتقاد کا فیصلہ جسمانی قوت پر منحصر کیا۔

ابو الفضل نے کشمیر کے ایک مندر کے لئے جو کتبہ تحریر کیا اسمیں اکبر کی بے تعصبی کو نہایت خوبی کے ساتھ مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے لکھتا ہے[۱] ۔ (اس صفحہ کا نوٹ صفحہ ۷۲ میں درج ہے)

اے میرے خدا میں ہر معبد میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو تجھکو دیکھتے ہیں اور ہر ایک زبان میں جو میں سنتا ہوں لوگ تیری حمد کرتے ہیں۔ شرک اور اسلام دونوں تیرے ہی جستجو میں ہیں ہر مذہب یہی کہتا ہے کہ تو واحد ہے اور بے ہمتا ہے۔ مسجد میں تیری ہی نماز پڑھی جاتی ہے اور عیسائی کلیسہ میں تیری ہی محبت میں گھنٹے بجاتے ہیں۔

کبھی میں کلیسا میں جا نکلتا ہوں کبھی مسجد میں جا کھڑا ہوتا ہوں مگر جہاں جاتا ہوں تیرے ہی تلاش میں ایک معبد سے دوسرے معبد میں جاتا ہوں۔ تیرے مقبول بندوں کو نہ مذہب سے مطلب نہ بیدینی سے غرض کیونکہ تیرے جمال عکس سے دونوں میں کوئی بھی محروم نہیں ہے ملحد کو الحاد مبارک، مومن کو ایمان مبارک، مگر آخر کار گلاب کی پتی عطار کے دل سے متعلق ہے۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں اپنے باپ اکبر کے حالات یوں بیان کرتا ہے:-

"والد بزرگوار ہر عقیدہ کے علماء سے گفتگو کیا کرتے تھے اور اگرچہ وہ خود لکھے پڑھے نہ تھے تاہم ہمیشہ علماء اور طباع لوگوں سے بات چیت کرتے کرتے ان کی زبان ایسی شستہ ہوگئی تھی کہ کوئی شخص انکی گفتگو سے یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ نہ تھے وہ نظم اور نثر دونوں کی لطافت کو ایسا اچھا سمجھتے تھے کہ ان پر کبھی کسی اور کو ترجیح دینا ناممکن ہے۔" میں نے اس بیان کو کئی بار پڑھا ہے اور میں اس قطعی جہالت کا اسکی اعلیٰ درجہ کی تنقیدانہ قابلیت سے مطابقت کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اکبر اپنے بچپن کا زمانہ جو خطرات، حوادثات، اور انقلابات سے پر تھا گزار کر تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ میر یحییٰ معصوم کی تاریخ کے ایک فقرہ سے (جس کا لڑکا سن جلوس کے دوسرے سال بطور معلم کے منتخب ہوا تھا) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسوقت تک شاہزادہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتا تھا "اسوقت تک" کا فقرہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعد میں پڑھ لکھ گیا تھا۔ اور جہانگیر کے بیان کا مطلب بھی شاید اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ اس کے باپ کی تعلیم بچپن کے زمانہ میں کچھ نہ ہوئی تھی جو ہمایوں کے آخری زمانہ کے تکلیفات کے لحاظ سے تعجب خیز نہیں ہے میر عبد اللطیف اکبر کا پہلا معلم تھا۔ سولہویں برس کی عمر میں اکبر کے لئے ایک دوسرا معلم مقرر ہوا جس سے اس نے وہ نظمیں پڑھیں جنمیں تصوف کے اصطلاحات تھے۔

(یہ نوٹ صفحہ ۷۱ کا ہے) لے محمد عسکری حسینی بلگرامی نے در المنثور میں اس کی نقل کی ہے وہو ہذا "الٰہی بہر خانہ کہ می نگرم جو یای تو اند و بہر زبان کہ می شنوم گویای تو۔ کفر و اسلام در رہت پویان + وحدہ لاشریک لہ گویان + اگر مسجد است بیاد تو نعرۂ قدوس میزنند و اگر کلیسا است بشوق تو ناقوس می جنبانند گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد + یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ + اگر خاصان ترا بکفر و اسلام کارے نیست ایں ہر دو را در پردۂ اسلام تو بارے نہ + کفر کافر را و دین دیندار را + ذرہ دردی دل عطار را + این خانہ بہ نیت ائتلاف قلوب موحداں ہندوستان و خصوصاً معبود پرستان عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ + بفرمان خدیو تخت و افسر + چراغ آفرینش شاہ اکبر + نظام اعتدال ہفت معدن + کمال امتزاج چار عنصر + ہر کہ نظر صدق نینداختہ این خانہ را خراب سازد باید کہ نخست معبد خود را بنید از وچہ اگر نظر بر دل است باہمہ ساختنی است و اگر چشم بر آب و گلی است ہمہ بر انداختنی۔ بیت

خداوندا چو دادکار دادی ٭ مدار کار بر نیت نہادی ٭ تو بر بارگاہ نیست آگاہ ٭ بہ پیش شاہ داری نیت شاہ

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

(زبیدہ)

جب ۷۵۰ء میں جنگ زاب نے حکومت بنی امیہ کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا اور بنو عباس کی طرف سے ابومسلم خراسانی کی تلوار خاندان بنی امیہ کے سروں پر چمکنے لگی، تاکہ ان کے ہر ہر فرد کے وجود سے دنیا کو پاک کر دیا جائے، تو ان ستمزدگان دولت حکومت میں سے ایک شخص اُس سے بچ کر نکلنے والا بھی تھا جس نے بنو عباس کے تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور اندلس پہنچکر ایک ایسی زبردست حکومت اسلامی قائم کی جس پر خاندان عباس نے ہمیشہ رشک کیا اس شخص کا نام عبدالرحمن الداخل تھا۔

اس وقت کا موضوع سخن یہ نہیں کہ عبدالرحمن کے اُن واقعات حیات سے بحث کی جائے جو تاریخ میں موجود ہیں اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس نے کیونکر اندلس میں دولت اسلامی قایم کی اور بلاد غرب میں اس کی ذات سے علم و ادب کو کس قدر فایدہ پہونچا کیونکہ اس کی تفصیل تمام تاریخی کتابوں میں ملتی ہے، بلکہ مقصود اس واقعہ کو بیان کرنا ہے جسے مورخین نے ترک کر دیا یعنی یہ کہ کس طرح اس نے موت سے نجات پائی اور کیونکر بنی عباس کے نتیجہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا

جسوقت بنو عباس، خاندان بنی امیہ کی گرفتاری میں مصروف تھے، اُس وقت عبدالرحمن نہر فرات کو عبور کر کے مع اپنے چھوٹے بھائی کے ایک چھوٹے گانوں میں پہونچا اور یہاں ایک ایسے شخص کے مکان میں پناہ گزین ہو گیا جو اس خاندان کا ممنون احسان تھا اس کے ایک لڑکی تھی زبیدہ نہایت جمیل و خوش اندام جس کی عمر ابھی صرف ۱۶ سال کی تھی جو اپنے باپ کے غیر حاضری میں (جب وہ فرات میں مچھلی کے شکار کے لئے جاتا) گھر کا سارا انتظام کرتی۔ عبدالرحمن کی عمر بھی اس وقت ۲۰ سال کی تھی اور یہ بھی نہایت خوبصورت اور دلکش نقشہ کا انسان تھا۔

اول دن جب زبیدہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی، اس کے دل میں عبدالرحمن کی محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن اب کچھ زمانہ کے قیام نے اس جذبہ میں اور زیادہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ وہ نقاب کے نیچے سے، پردہ کی اوٹ سے، دریچوں کی جھلملی سے اسے دیکھا کرتی تھی اور خاموشی کے ساتھ مدارج محبت طے کرتی جاتی تھی۔

ایک دن زبیدہ پانی لینے کیلئے دریائے فرات کے کنارے گئی تو بائیں ساحل کی طرف دور کی فضا میں بہت سے سیاہ پرچم اُس کو متحرک نظر آئے وہ جانتی تھی کہ سیاہ پرچم بنو عباس کا قومی نشان ہے، وہ اس سے بھی واقف تھی کہ عباس کی اولاد بنو امیہ کی جانی دشمن ہے اور اس کا مہمان (عبدالرحمن) خاندان امیہ کا ایک فرد ہے —— یہ دیکھ کر اس کا جی دہل گیا اور وہ سمجھ گئی کہ اب عبدالرحمن

کی خبر نہیں ہے، اس لئے وہ فوراً گھر گئی تاکہ اپنے باپ سے سارا ماجرا بیان کرے، لیکن اس وقت وہ بھی نہ ملا اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ براہ راست عبد الرحمن کو اس خطرہ سے آگاہ کرے ۔۔۔ اس حد تک تو اس کے خیالات کی رفتار عام فطرت انسانی کے ماتحت عمل میں آئی لیکن اس کے بعد ہی اُس کے جذبات محبت والفت جنبش میں آئے اور اس نے خیال کیا کہ عبد الرحمن کو خطرہ سے آگاہ کرنا گویا اپنے سے جدا کر دینا ہے اور اس کو وہ گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے اس کی محبت حیلہ کار نے ۔۔۔ اور کونسی محبت ہے جو حیلہ کار نہیں ہوتی ۔ یہ تدبیر نکالی کہ مردانہ لباس پہن کر اس کے پاس جائے اس خطرہ سے آگاہ کرے اور خود بھی اس کیساتھ رہبر کے حیثیت سے ساتھ ہو ، چونکہ عبد الرحمن نے اس وقت تک زبیدہ کی صورت نہ دیکھی تھی اس لئے یہ تدبیر اس کی بالکل ممکن العمل تھی۔

زبیدہ نے اپنے باپ کا لباس پہنا اور دروازہ کھٹکھٹا کر عبد الرحمن سے سارا حال بیان کیا۔ اول اول اُس نے پس وپیش کیا کہ چھوٹے بھائی کی معیت میں کیونکر وہ بھاگ سکتا ہے، لیکن جب زبیدہ نے مجبور کیا اور خدمات رہبری میں پیش کیں تو عبد الرحمن راضی ہو گیا اور آخر کار یہ تینوں غروب آفتاب سے قبل فرات میں کود پڑے تاکہ اُس کو عبور کر کے نکل جائیں اس کوشش میں عبد الرحمن کا چھوٹا بھائی دریا کے اندر ڈوب گیا۔ کہا جاتا ہے کہ عباسیوں کے ایک تیر نے اسکو زخمی کر دیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ بہر حال وہ عباسی لشکر کے تیر سے زخمی ہو کر مرا ہو یا کسی اور وجہ سے یہ واقعہ ہے کہ فرات کے دوسرے ساحل پر جسوقت عبد الرحمن پہونچا تو صرف رہبر اس کے ساتھ تھا اور اس کا چھوٹا بھائی اس سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکا تھا۔

یہ دونوں چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے شام، جبل لبنان، فلسطین، صحرائے سینا سے گزرتے ہوئے مصر کی حدود میں داخل ہوئے اور قیروان تک پہونچ گئے عباسیوں کی طرف سے مصر میں جو حاکم مقرر تھا اس کو بھی عبد الرحمن کی فراری کی خبر دیدی گئی تھی اور وہ بھی جستجو میں تھا، لیکن عبد الرحمن مع زبیدہ اور ایک خادم کے جس کا نام بدر تھا اور جو مصر سے ساتھ ہو گیا تھا، اندلس پہونچا اسوقت یہاں کی حالت یہ تھی کہ نہ صرف بربر اور عربیوں میں سیادت کی نزاع قائم تھی بلکہ خود عربوں کے اندر بھی مضری اور یمنی کی تفریق نے سارے ملک کے اندر اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ اس انشقاق وبدامنی سے فایدہ اٹھاکر عبد الرحمن حکومت بنی امیہ کے لئے لوگوں کو دعوت دینی شروع کی اور آخر کار ستمبر ۷۵۵ء میں وہ بنو امیہ کا قایم مقام ہو کر یہاں کا حکمراں ہو گیا اُسنے قرطبہ میں نیا قلعہ طیار کرایا۔ مسجد بنوائی اور خطبہ سے منصور خلیفۂ عباسی کا نام نکال کر اپنا نام داخل کیا۔ اسی عہد سے عبد الرحمن داخل (اول) کے لقب سے مشہور ہوا اور تاریخ میں اپنی بیشمار یادگار چھوڑ گیا۔

حکومت و دولت کے زمانے میں بھی عبد الرحمن نے اپنے شریک مصائب (زبیدہ) کو فراموش نہیں کیا اور اس کو کوئی جلیل القدر

خدمت تفویض کرنی چاہی کیونکہ وہ اب تک اسے مرد ہی سمجھا تھا۔ لیکن جب ایک دن وہ اپنا مردانہ لباس اُتار کر عبد الرحمن کے سامنے آئی تو اُسے سخت حیرت ہوئی، لیکن اب بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے اس قدر تکلیفیں کیوں برداشت کی تھیں اور اس کے دل میں کس قسم کی آگ مشتعل تھی۔ عبد الرحمن، وہ عبد الرحمن الداخل جو سلطنت و سیادت تمام دقیق ترین رازوں سے آگاہ تھا جو حکومت و قیادت کے نازک ترین نکات کے سمجھنے میں اس قدر ذہین و ذکی تھا، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی زبیدہ کی حالت کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور اس کے چہرہ میں جو کھلا ہوا صحیفۂ محبت و عشق تھا، اس کے ایک جذبہ کا بھی مطالعہ نہ کرسکا۔
عبد الرحمن کی ساری زندگی میں غالباً یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے اس کی بے حسی اور بلادت ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ عبد الرحمن نے زبیدہ کی انتہائی عزت کی تمام امرا کے سامنے اُسے "فارس جمیل" کا لقب عنایت کیا۔ لیکن زبیدہ کا اپنے وطن وعزہ کو ترک کرنا، تمام مصائب برداشت کرنا اس غرض سے نہ تھا کہ وہ جاہ و شہرت کی طالب تھی بلکہ اس لئے یہ تمام آلام اس بنا پر جھیلے تھے کہ وہ ایک دن اپنے محبوب سے مل جائے گی، اس لئے جب اُس نے عبد الرحمن کے قلب کو اس درجہ بارد و بے حس پایا تو اس کا مایوس ہو کر حزیں و ملول ہو جانا بالکل فطری امر تھا لیکن عبد الرحمن جو انتظام مملکت کے اہم مشاغل میں مصروف رہتا تھا اس کو کیا اس امر کا موقع مل سکتا تھا کہ زبیدہ کے نازک حسیات کو سمجھتا۔

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا یہاں تک کہ چند دنوں کے لئے اطمینان سے بیٹھنے کی فرصت اسے نصیب ہوئی۔
وہ ایک دن محل کے معاملات پر غور کر رہا تھا کہ دفعتہً اُسے زبیدہ کا خیال پیدا ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ کسی سردار سے اس کا عقد کر دینا چاہیے چنانچہ اس نے سر عسکر عبد الملک کو طلب کیا اور اس کی رضامندی حاصل کر کے زبیدہ سے دریافت کیا کہ اسے تو کوئی عذر نہیں ہے۔ زبیدہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور با چشم پُر نم بولی کہ "آپ مالک و مختار ہیں میں کیا اور میری رائے کیا؟"

جشن زفاف کا اہتمام کیا جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سارا قرطبہ اس خوشی میں چراغاں کیا گیا لیکن جس وقت زبیدہ کے حجرہ میں پہونچے تو وہ وہاں موجود نہ تھی بلکہ عبد الرحمن کے حجرہ میں پڑی ہوئی رو رہی تھی عبد الرحمن کو اطلاع ہوئی تو وہ خود وہاں گیا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب زبیدہ سکراتِ موت میں مبتلا تھی۔
جب زبیدہ نے نگاہِ واپسیں سے عبد الرحمن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے بھی حجاب اٹھا اور اب سمجھ میں آیا کہ زبیدہ کا تمام آلام و مصائب اختیار کرنا کس لئے تھا۔ لیکن یہ سمجھنا اب بعد از وقت تھا کیونکہ موت کی زردی اس کی پیشانی پر دوڑ چکی تھی۔"
زبیدہ نے اپنی آخری نگاہ اُٹھائی اور کچھ گفتگو بھی کی جس سے عبد الرحمن صرف اس قدر سمجھ سکا کہ اُس نے زہر کھا لیا ہے۔

اس نے زبیدہ کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور سینہ سے لگا لیا آخر کار اس کو اس جگہ دم توڑنے کی اجازت دینی ہی پڑی جہاں تک پہونچنے کی تمنا میں وہ ساری عمر گھلا کی۔ عبد الرحمٰن نے اُسی عبد الرحمٰن نے جو تنہا اِن مملکت کا انتظام تو کر سکتا تھا لیکن ایک قلب مجروح کا مداوا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ زبیدہ کی سرد پیشانی کو بوسہ دیا، اور روتا ہوا حجرہ سے باہر نکل آیا۔

گنگا

مہکا دیا ہے ساحل پھولوں کی طرح تو نے
چمکا دیا ہے صحرا تیرے ہی رنگ و بو نے
تو رشک گلستاں ہے
اے گلعذار گنگا!

موج رواں میں تیرے ذرات برق رخشاں
ہمپایۂ فلک ہے تیرا حباب رقصاں
قطرے گہر ہیں تیرے
اے آبدار گنگا

ہیں زندہ تیرے دم سے ارمان گوپیوں کے
ہوتے ہیں تیرے اندر اشناں گوپیوں کے
ہے تیرا حسن ان میں
اے جلوہ بار گنگا

سادھو نے تیرے در پہ دھونی رمائی آکر
اور دان کی کسی نے گنگا نہائی آکر
ہیں تیرے فیض جاری
اے زرنگار گنگا

چرنوں میں تیرے آکر چھپتے ہیں ماہ پارے
کرتی ہیں تیری موجیں ابرو سے کچھ اشارے
تو جان دلکشی ہے
اے شاندار گنگا

وحدت پرست ہوں میں مسلک مرا جدا ہے
سات آسماں کے اوپر رہتا مرا خدا ہے
کرتا ہوں ندیوں میں
تجھکو شمار گنگا

اسلاف کے قدم کو چوما ہے چونکہ تو نے
گرویدہ کر لیا ہے مجھکو بھی تیری خو نے
مجھ پر عنایتوں کا
ہے تیری بار گنگا

محمود اسرائیلی

من پرتو جانانم

آئینۂ حیرانم؟ یا صحن گلستانم
من سوختہ سامانم؟ یا مہر درخشانم
دانم بخدا - دانم نے اینم و نے آنم
من پرتو جانانم

مجبور بہ تقدیرم؟ یا صاحب تدبیرم؟
من پیکر تصویرم؟ یا خوگر تقریرم؟
دانم بخدا - دانم نے اینم و نے آنم
من پرتو جانانم

آواز دل خویشم؟ یا ساز دل تو یشم؟
من ناز دل خویشم؟ یا راز دل خویشم؟
دانم بخدا دانم نے اینم و نے آنم
من پرتو جانانم

امین حزیں

غزلیات

(عبدالباسط) باسط بھوپالی

تو فغاں کارگر نہیں ہے نہ کچھ دعا میں اثر نہیں ہے
خدا نے وہ رات مجھکو دی ہے جسے تلاش سحر نہیں ہے

یہ جلوہ تابی جہان الفت کی دیدنی ہے، مگر [illegible]
کہ ذرہ ذرہ تڑپ رہا ہے تجلیوں کو خبر نہیں ہے

نظر کو ذوق تلاش کیسا قدم کو تشویش جستجو کیوں ہو
دل اپنے جلووں کو ڈھونڈتا ہے جسے مجال نظر نہیں ہے

نہ آرزوں میں جوش پنہاں نہ ولولوں میں خروش رسوا
یہ حیرت جلوہ کیا ہے یارب کہ ہمکو اپنی خبر نہیں ہے

میں جسکو تحفہ میں پیش کردوں وہ جسکو زیب نظر بنا لیں
الٰہی دامان آرزو میں کوئی بھی ایسا گہر نہیں ہے

ادھر جمال کرشمہ پرور، ادھر ستمہائے حشر منظر
سنبھالے دل کو کوئی تو کیونکر، کسی کو تاب مفر نہیں ہے

مری محبت کی داستانیں فلک پہ ہنستے ہیں سننے والے
مگر وہ انجان اور ایسے کہ ان کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

کسی کی کافر نگاہیاں بھی تو ازتی ہیں دلوں کو باسط
مگر نہیں ہے تو ایک میری تباہیوں پر نظر نہیں ہے

شمع

ضبط پر قدرت ہے تجھکو یہ کہ تو خاموش ہے
گرچہ تیرے سینے میں یاس و الم کا جوش ہے

تیرے شعلوں سے ہے ظاہر رنج بیتابی کا حال
بزم میں جلنا ہی تیری زندگی کا ہے مآل

تیری دھیمی روشنی میں ہے نہاں الفت کا راز
تیری ہر ہر سانس ہے افسانۂ سوز و گداز

تیرا جلنا درس ہے اہل بصیرت کے لئے
شمع تو شمع ہدایت ہے محبت کے لئے

صبر کی محفل میں اک تو ہی ہے لذت آشنا
ضبط راز عشق میں ہے جاتی ہو خود ہی فنا

تو نہ ہوتی تو نہ ہوتی بزم عشرت میں ضیا
تو نہ ہوتی تو نہ ہوتا منکشف راز فنا

تیری ہی ممنوں ہیں شاہ و گدا کی محفلیں
تجھ سے ہی پر نور ہیں شام الم کی منزلیں

تو نہ ہوتی تو نہ ہوتی خانۂ عشرت میں دھوم
تیرے ہی دم سے تو ہے کاشانۂ غربت میں دھوم

بیکسوں کی قبر روتی ہے راتوں کو تو ہی
آنے والا انکی قبروں پہ نہیں ہے کوئی بھی

سچ بتا اے شمع کس کے ہجر میں روتی ہے تو
کس کے غم میں آنسوؤں سے اپنا منہ دھوتی ہے

کیا تجھے بھی ہے کسی کی کم نگاہی کا گلا
کیا تری ہستی بھی ہے یاس و الم میں مبتلا

ضبط کرتی ہے جسے تو کون سا وہ راز ہے
کس طلسم راز کی اے شمع تو دمساز ہے

ثاقب کانپوری

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

آ نکلنا نہ تم کہیں سے ادھر
کوئی بیٹھا ہے جاں کھونے کو

کون ہوگا غریب شادی و غم
کوئی ہنسنے کو ہے نہ رونے کو

کٹ گئی ساری رات آنکھوں میں
ہم سے کیا پوچھتے ہو سونے کو

ہو چکی باز پرس بھی آخر
ہو گیا جو رہا تھا ہونے کو

وہ بشر بھی عجب بشر ہے جگر
فرض سمجھے جو جان کھونے کو

جگر بریلوی

دلؔ شاہجہاں پوری

جویائے حقیقت ہوں عالم سے جدا گانہ دل ہے طرف کعبہ رخ جانب بتخانہ

تاثیر بیاں بھر دے اے گردش پیمانہ ساقی کو سنانا ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرہ میں پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے اے اہل نظر دیکھو خاکستر پروانہ

اک کیف نے دونوں پر مستانہ اثر ڈالا میکش ہے خود رفتہ چکر میں ہے پیمانہ

جب صبا عقدہ لہرائے حد جاناں نزلکی چل وادیٔ ایمن تک سن طور کا افسانہ

ہے مشرب رنداں میں انداز طلب بھی ہر گردش ساغر پر ایک نعرۂ مستانہ

کی گریۂ پیہم نے تشریح غم پنہاں ہر اشک مسلسل سے افسانہ در افسانہ

پردے سے عیاں ہو کر پردہ میں نہاں ہو جا چھا جائیگی خود حیرت اے جلوۂ جانانہ

یوں جل کے سر محفل تصویر وفا کھینچی پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازی پروانہ

اللہ رے کیف مے ہے اور ہی عالم میں معراج تھی بیخودی کی اک لغزش مستانہ

حالات الم لکھ کر بیمار نے دم توڑا آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل افسانہ

وہ حیرت نظارہ وہ منظر محویت وہ برق کے پردہ میں انداز حجابانہ

کیا جانے کہاں موجیں کھینچے لئے جاتی ہیں پہنچا ہمیں ساحل تک اے ہمت مردانہ

دنیائے حقیقت میں آزاد تعین ہیں ہمنے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

اک مست ابھی آ دل لکھتا ہوا گزرا ہے صد زہد بہ یک جرعہ تقدیر می و میخانہ

فرخؔ بنارسی

ثبات رنگ و بوئے گل بہار بوستاں تک ہے یہ دو دن کا تماشا ہے جو آغاز خزاں تک ہے

کبھی چلتی ہے آندھی اور کبھی بجلی چمکتی ہے یہ ہنگامہ چمن میں صرف تیرا آشیاں تک ہے

سفر ہے رات دن لیکن نہیں معلوم اب تک کہاں آ رہے ہیں اور ہمیں جانا کہاں تک ہے

شریک رنگ محفل سرخی خون تمنا ہے تمھاری بزم کی رونق ہماری داستاں تک ہے

کہیں اب ہے فریب جستجو دم بھر ٹھہرنے دے خبر کیا ہے کہ حد عرصۂ کون و مکاں کہاں تک ہے

ازل سے خاتمہ پر آج تک آئی نہ آخر ؔفرخ نہیں معلوم طول داستان غم کہاں تک ہے

نظیرؔ لودھیانوی

بیاباں ایک ذرہ میرے اجزائے پریشاں کا گلستاں ایک ٹکڑا میرے خوں آلودہ داماں کا

دکھاتا ہے جو جلوہ صبحدم خورشید تاباں کا اٹھاتا ہے فلک پردہ ہمارے زخم پنہاں کا

نہاں تھی تنگنائے دل میں اک دنیا مسرت کی جسے پہلو سمجھتے تھے وہی در تھا گلستاں کا

ہنساتا ہے فلک جن کو وہی ناشاد ہوتے ہیں گریباں چاک ہے بزم جہاں میں صبح خنداں کا

نہیں ہے مشغلہ کس کا گدائی تیرے جلوہ کی سحر کے ہاتھ میں بھی جام ہے مہر درخشاں کا

وہ کیسے لوگ ہیں یارب جنھوں نے پا لیا تجھکو ہمیں تو ہو گیا دشوار ملنا ایک انساں کا

. . . .

دل مایوس کیوں گھبرا گیا مدفن کی ظلمت سے تماشا عمر بھر دیکھا ہے میں نے شام ہجراں کا

نہیں بھولا تمھارے وقت رخصت کا سماں مجھکو گماں صبح وطن پر ہے ابھی شام غریباں کا

شفق ہے آسمانوں پر یہ صحرا دشت لالے ہیں جہاں میں جابجا چھڑکاؤ ہے خون شہیداں کا

بہت مشکل ہے میرے گلستاں میں بلبل رہنا اڑایا ہے چمن ہر نخل نے سرو خراماں کا

کیا سودائیوں نے سوز الفت اسقدر ارزاں اڑا پھرتا ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

فلک سے بھی پرے جس کا پتہ دیتا تھا واعظ کسی کوچے میں پاتا ہوں نشاں اس باغ رضواں کا

زلیخا کو نظیرؔ اتنا کوئی پیغام پہنچا دے

کہ ہے غار حرا میں بھی تماشا چاہ کنعاں کا

مجنوںؔ گورکھپوری

پشیماں ہو گے ناحق سنکے مجھ سے داستاں میری نہ پوچھو حال دل میرا نہ کھلواؤ زباں میری

وہی رسوائیاں میری وہی بدنامیاں میری سناؤں کیا نہیں سننے کے قابل داستاں میری

مرے صیاد سرگرداں سے اتنا کوئی کہدیتا جہاں رکتے ہے بجلی ہے وہ شاخ آشیاں میری

بھڑکا کے اٹھے چمن چمن رنگ پھولوں کا نکھر آئے سکھا دے غنچہ لبوں کو کوئی طرز فغاں میری

جنوں کی شورشوں سے لیکے ایام اسیری تک

مری زنجیر کے نالوں میں سن لو داستاں میری

استفسارات

غالب کا مذہب

(جناب سید اوسط علی صاحب - برہان پور)

اس وقت مختلف رسایل میں غالب کے مذہب کے متعلق بھی بحث چھڑی ہوئی ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ شیعہ تھے، کوئی انھیں سنی ثابت کرتا ہے، آپکی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں جو رباعی غالب کی درج کی ہے اور جس کا آخری مصرع یہ ہے :-

شیعی کیونکر ہو ماورا النہری

اس سے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعی نہ تھا۔

(نگار) مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید اب سے دو سال قبل لکھنؤ کے کسی صاحب نے طبقۂ اسد اللّہی کے متعلق استفسار کیا تھا اور اسی سلسلہ میں غالب کی نسبت بھی ایک مختصر گفتگو کی گئی تھی کہ اس کا اپنے آپ کو اسد اللّہی کہنا کیا معنی رکھتا ہے اور جہاں تک مجھے خیال ہے میں نے اس میں یہ لکھا تھا کہ غالب یقیناً تفضیلی شیعہ تھا۔ چنانچہ اُس استفسار کا تعلق براہ راست غالب کے مذہب سے نہ تھا اس لئے اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ آپ نے اسکو اصل سوال ہی قرار دیا ہے تو مجھے صاف صاف کہدینا چاہئے کہ غالب کو سنی کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ذوق کو شیعہ کہدے اس سے زیادہ خفیف حرکت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ سنی جماعت محض اس لئے کہ غالب ایک اچھا شاعر تھا اُسے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لئے بعید از قیاس تاویلوں سے کام لے درانحالیکہ وہ شخص جس کے مذہب کے متعلق فیصلہ ہو رہا ہے وہ چیخ چیخ کر کہ رہا ہے کہ میں شیعہ ہوں اور شیعہ بھی ایسا جو باوجود (عقاید کے لحاظ سے) علی اللّہی نہ ہونے کے اپنے آپ کو علی اللّہی کہہ رہا ہے۔ اس کے قطعات نوحہ و فاتحہ وغیرہ دیکھئے اور خود غور کیجئے کہ جو معبود خلائق بوتراب کے "کار خدا بہ عرصۂ محشر کند علی" کا قائل ہو، جو یہ دعویٰ کرے کہ :-

بر دست آں کہ خاتم قوس امامت ست   آرایش جہاں گر از سر کند علی

اُس کو آپ شیعی نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ ایک ترکیب بند میں اُس نے اپنے غلو کو دو جگہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے :-

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام   ہوشیارم باخدا و با علی دیوانہ ام

از فنا فی الشیخ مشہودم فنا فی اللہ باد   محو گشتم در علی دیگر سخن کوتاہ باد

مثنوی ابر گہر بار میں حضرت علی کو وہ عین ذات نبوی سمجھکر کہتا ہے :-

نہ گنجد دوئی در نبی و امام کو   علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام

شاہ نجف وصی نبی، مرتضیٰ علی   آں از ائمہ اول و ثانی ز پنجتن

حالی نے جہاں غالب کی وہ رباعی درج کی ہے جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہیں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ یہ صرف تفنن طبع تھا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی علیکم سے تفضیلی نہ جانتا ہو۔

اس سے بھی زیادہ صراحت اس کے تشیع کے اگر آپ چاہتے ہیں تو ذیل کے شعروں کو ملاحظہ کیجئے:۔
ایک قصیدہ میں وہ حضرت علی کو اس شان سے پیش کرتا ہے:۔

نفس نبی، خدائے نصیری، امام خلق آمنت عظیم کہ حق بر جہاں نہاد

اب رہے مرزا کے بعض خطوط جن سے ان کے سنی ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہیں کیونکہ جن باتوں سے یہ استنباط کیا جاتا ہے وہ نہایت معمولی ہیں اور انھیں ان اشعار کے مقابلہ میں جن کو ایک خاص سنجیدہ کیفیت کے ماتحت اُس نے لکھا ہے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ استمداد بالاولیاء یا تراویح پڑھنا سنی ہونے کی قوی دلیل نہیں ہے جیسا کہ وصایت علی کا عقیدہ تشیع کا دلیل ہو سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ غالب ہمہ اوست کے قایل تھے، صوفی مشرب رکھتے تھے اور صلح کل اُن کا مسلک تھا جیسا کہ اُن کے کلام اور خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس عقیدہ کا آدمی شیعہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر میں اس کے تسلیم کرنے کے لئے مجبور کیا جاؤنگا تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ غالب نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ اس سے بھی کچھ زائد علی اللہی تھے نصیری تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ذات علی میں خدا حلول کر گیا ہے جس طرح ہمہ اوست کی بحث نکال کر ان کو تشیع سے خارج کیا جا سکتا ہے اسی طرح اس استدلال پر علی اللہی بھی مانا جا سکتا ہے اور ایسا کہنے کے لئے ایک اور قوی وجہ یہ بھی موجود ہے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو اسد اللہی ظاہر کیا ہے۔

دیوان نوشاد مجموعۂ غزلیات ہے اودھ کے مشہور تعلقہ دار جناب راجہ نوشاد علی خاں صاحب کا جس کو عالیجناب راجہ محمد اعجاز رسول خاں صاحب تعلقہ دار جہانگیر آباد نے اپنے نہایت دلچسپ مفید و پر لطف مقدمہ کیساتھ شایع کیا ہے۔ کتاب کا حجم، اس کی طباعت و ترتیب نہایت دلکش ہے اور مقدمہ اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بالخصوص قابل ملاحظہ ہے۔ نوشاد لکھنوی طرز کے خوشگوار شعراء میں ہیں ان کے کلام میں زبان کی صفائی، حسن ادا، محاورات اور محاکات کے دلچسپ نمونے موجود ہیں۔ اگرچہ بہت مختصر تنقید میں تفصیلی ریویو کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا لیکن بعض اشعار قابل ذکر ہیں:۔

الٰہی کون یاد آیا ہے مجھ کو طبیعت آج قابو میں نہیں ہے

خدا جانے وہ کیا سمجھے ہیں دل میں دم آخر جو ہم سے بے خبر ہیں

میں جو مضطر ہوا بلا سے ہوا تم تو خوش ہو گئے ستا کے مجھے

سامنے سب کے تو ہم ضبط سے لیتے ہیں کام دل جو دکھتا ہے تو رو لیتے ہیں تنہائی میں

معلومات

جدید امریکہ شکاگو (امریکہ) میں بچوں کے جسمانی حالت کی تحقیق و نگرانی کا کام ایک مستقل محکمہ کے سپرد ہے امریکہ قوم کی آئندہ نسل اس طرح جدید اصولوں پر مرتب ہو رہی ہے چنانچہ اس محکمہ کا دعویٰ ہے کہ موجودہ امریکی لڑکے جن میں سولہ سے لیکر اٹھارہ سال کی عمر والے شامل ہیں اب اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ قدآور ہوتے ہیں اور کم از کم دو انچ اُن کا قد بڑھ گیا ہے۔

حسین ترین ملکہ ملکہ رومانیہ یورپ کی حسین ترین شہزادی ہیں یعنی موجودہ بادشاہوں میں کوئی بھی ایسی خوبصورت ملکہ کا مالک نہیں

نیاگرہ آبشار مشہور و معروف نیاگرہ آبشار کی غیر معمولی شہرت و عظمت بھی ایک دن ختم ہوتی نظر آتی اس لئے مسٹر فرنیک ٹائیلر ماہر طبقات الارض انڈیا کا خیال ہے کہ جھیل ایری کی سطح روز بروز بلند ہوتی جاتی ہے اور اگر انسانی مداخلت و تمدنی ضروریات قرب و جوار کے رقبہ میں کوئی تبدیلی نہ بھی کریں تو ایک ہزار چھ سو سال کی مدت میں یہ جھیل بھی جھیل ہیرون کی سطح پر آجائیگی اور اس طرح دونوں جھیلوں کا پانی شکاگو پہنچا کرے گا اور آبشار نیاگرہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائیگا۔

مچھلیوں کی تعداد ایک چشمہ کا ۱۰ × ۱۵ فٹ رقبہ اور اس کے قرب و جوار کے بعض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ۱۰ × ۱۵ انچ کے بھی تھے۔ اس موقع پر مچھلیوں کے شمار کا تجربہ کیا گیا لیکن پوری کامیابی نہ ہو سکی تقریباً ۷۵ فیصدی سے زاید مچھلیاں شمار نہ ہو سکیں جس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر مچھلیاں دیر تک چھپی ہوئی بیٹھی رہتی تھیں۔ بہرحال اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک میل کے رقبہ میں ۶۵۴ مچھلیاں پائی گئیں۔ لیکن اگر اسمیں بقیہ ۲۵ فیصدی کا بھی اضافہ کیا جائے تو یہ تعداد ۸۷۵ تک پہنچتی ہے۔

نیویارک لنڈن ٹیلیفون آلہ خبر رسانی کی تاریخ میں نئی دنیا اور یورپ کے درمیان سلسلہ ٹیلیفون کی تکمیل ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس ٹیلیفون پر ۱۵۰۰۰۰۰۰ ڈیڑھ کرور روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اور پہلے ہی دن جب سلسلہ گفتگو اور کاروبار شروع کیا گیا تو تخمیناً ایک کرور اسی لاکھ ۱۸۰۰۰۰۰۰ کا بیوپار ہوا

لیکن اس ٹیلیفون کا درمیانی فاصلہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے انگلستان میں اس کا پہلا بڑا اسٹیشن رگبی ہے جہاں سے انگلستان بھر کے معاملات تقسیم ہوتے ہیں اور امریکہ میں ہولٹن میں ہے جہاں سے نیویارک اور دوسرے مقامات پر

پیغامات بھیجے جاتے ہیں اس وجہ سے تاروں یا شعاع برقی کا ایک حلقہ بن گیا ہے جس کا فاصلہ اگر ایک بولنے والے ٹیلیفون سے دوسرے پیغام رساں تون تک لگایا جائے تو ۲۹،۰۰۰ + ۶۰۰۰۰ میل = ۶۰۰۰ و ۲۹ میل قرار پائے گا۔

اس ٹیلیفون کی دوسری عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جب اس ٹیلیفون پر کام شروع ہوتا ہے تو لندن کے بازاروں کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے اور جب ٹیلیفون بند کیا جاتا ہے تو امریکہ کا کاروبار کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد ٹیلیفون اس لئے کام نہیں کر سکتا کہ پیغامات ایسے حالات میں صحیح نہیں پہنچ سکتے جب کہ ایک جانب تو دن ہو اور دوسرے حصہ میں جہاں کے پیغام بھیجا جاتا ہے رات ہو گئی ہو۔

بائیں ہاتھ سے کام کرنا

عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے بیوقوف اور کمزور ہوتے ہیں اور انسانی عیوب میں اس کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن حال میں ڈاکٹر ریز نے خصوصیت سے ایسے لوگوں کے دماغی تحقیق کی ہے جو اپنے بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دماغ کا نصف داہنا حصہ جب زیادہ قوی ہوتا ہے تو لوگ بائیں ہاتھ سے کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دماغی کمزوری نہیں ہے اور مثال میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والی مصور سینزل کا نام پیش کیا جاتا ہے جس کے دماغ کی داہنی جانب بہت زیادہ حساس اور قوی تھی۔

سینما کی کامیابی

رڈولف ولینٹینو ایک اطالوی لڑکا تھا جس کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال کی ہوگی وہ اپنے وطن سے نکل کر امریکہ پہنچا اور ہالی وڈ کے عجائب کدہ میں داخل ہو گیا جہاں محرک تصاویر کے (فلم) تماشے طیار ہوتے ہیں چند سال کے بعد دنیا نے سنا کہ ولینٹینو نہ صرف بہترین ایکٹروں میں شمار ہونے لگا ہے بلکہ اظہار معاشقہ کے لئے اس سے بہتر صاحب فن کوئی نہیں ہے حسن و جمال کی دنیا اس پر نثار تھی، زر و جواہر کے انبار اس پر قربان تھے۔ جوانی اور شباب کی سرمستیاں گویا اسی کے لئے وضع ہوئی تھیں اور شہرت و قبول عام کی کوئی بلندی ایسی نہ تھی جو اس کے قدموں کے نیچے پامال نظر آتی ہو۔ امریکہ سے گزر کر یورپ و ایشیا کی کوئی سرزمین ایسی نہ تھی جہاں اس کے ہزاروں لاکھوں شیدائی موجود نہ ہوں۔ مقبولیت دہر و اعزیزی کی یہی کیفیت تھی کہ دفعتہً رڈولف ویلنٹنو کو ایک شدید بیماری پیش آئی اور اس کے لئے عمل جراحی تجویز ہوا یہ حادثہ امریکہ اور یورپ کے لئے غالباً دنیا کے اہم تاریخی واقعات سے بھی زیادہ سخت و ہولناک تھا کہ بیمار پرسی کرنے والے اور ہمدردی کے پیغامات بھیجنے والوں کی تعداد کروروں سے متجاوز ہو گئی اور شفاخانہ کے محاذ میں کثیر تعداد میں ٹیلیفونوں کا اضافہ کیا گیا تاکہ جوابات میں تاخیر نہ ہو متعدد ہوائی جہاز پیرس و امریکہ کے درمیاں دوائیں لانے اور ماہرین فن جراحی کی امداد حاصل کرنے کے لئے دورہ کر رہے تھے۔ عیادت کرنے والی اور سوگوار نازنینوں کی تعداد کا کیا شمار ہو سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد ہزار ہا رومال تو ان آنسوؤں سے تر پائے جاتے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ کرنے

کے لئے دنیا کی بے تعداد دولت اور انسانی جذبات کے غیر معمولی فراوانی دونوں عاجز ہیں۔ ولینیٹو کے جنازہ کے ہمراہ لاکھوں انسانوں بحر بے پایاں حرکت میں تھا اور خواتین کا بہیم غش کھا کھا کر گرنا ماتمی جلوس میں وہ اہمیت پیدا کر رہا تھا جو دنیا کی بڑی سے بڑی ہستیوں میں بھی صرف بعض ہی کو نصیب ہوئی ہو۔

یہ تمام روداد جو اک مختصر مدت میں پیش آئی محض نتیجہ ہے اس مجنونانہ شیفتگی کا جو موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب و تمدن کے زیر سایہ فن ڈراما بلکہ اس کی مخصوص شاخ سینما سے پیدا ہوگئی ہے!

امریکہ میں ریڈیو کی ترقی

۱۹۲۲ء میں صرف ۶ ہزار آلات ریڈیو یہاں پائے جاتے تھے، لیکن ۱۹۲۶ء کے اخیر تک اُن کی تعداد ساڑھے چھ ملین ہوگئی ہے اور روزانہ لاسلکی اسٹیشنوں سے ۲۶ ملین پیغام روانہ ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آلات ریڈیو کی قیمت جو صرف ۱۹۲۶ء میں خرید کئے گئے ۱۰۰ ملین گنی تک پہونچتی ہے اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک ۳۰۰ ملین گنی اس پر ملک کا صرف ہو چکا ہے۔

امریکہ میں ۲۷ ملین خاندان ایسے ہیں جہاں گیارہ ملین فونوگراف، ۱۸ ملین موٹر، ۱۷ ملین ٹیلی فون اور ۷ ملین ریڈیو استعمال ہوتے ہیں۔

بندروں کی تعلیم

اس وقت تک بندروں کو گفتگو کرنے کی تعلیم دینے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن امریکہ کا ایک پروفیسر بیان کرتا ہے کہ چمپنزی بندر کو ابھرے ہوئے حروف پر انگلیاں استعمال کرنا اس طرح سکھایا جاتا ہے، جس طرح اندھوں کو، کیونکہ بندر میں نقل و تقلید کی اہلیت بہت زیادہ ہے۔ اگر پروفیسر مذکور اس میں کامیاب ہوگیا تو بندر کا کتابیں پڑھ لینا بہ نسبت گفتگو کرنے کے زیادہ آسان ہو جائیگا۔

آنکھ اور سینما

مشہور ہے کہ سینما کی متحرک تصویروں کے طرف دیکھنا نگاہ کے لئے مضرت رساں ہے۔ لیکن حال ہی میں ولایت کے دو ڈاکٹروں نے کامل تحقیقات کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رسائل و جرائد کا ۴۵ منٹ تک مطالعہ کرنا، سینما میں ڈیڑھ گھنٹہ تصاویر کا مطالعہ کرنے سے زیادہ مضرت رساں ہے۔

سب سے بڑا مینار

ہوائی جہازوں کی ہدایت کے لئے بڑے بڑے مینار طیار کرائے گئے ہیں جن میں رات کو نہایت تیز روشنی ہوتی ہے اور بہت دور سے ہوائی جہاز چلانے والے کو سمت وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے بڑا مینار حکومت فرانس نے قائم کیا ہے جس میں ایک ہزار ملین بتی کی روشنی ہوتی ہے اور ۳۰۰ میل کے فاصلہ سے روشنی نمودار ہو جاتی ہے

مطبوعہ نگار شین پریس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام وصل بلگرامی

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
جلد ۱۲ - شمارہ ۲

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۷ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۲ | اگست ۱۹۲۷ء | شمار ۲

ملاحظات

شنو شنو، زتو ماہم شکایتے داریم

ایک انسان کیلئے دنیا میں اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اس کے حق میں کسی کی طرف سے "اظہار بے حسی" کیا جائے نگار و ناظرین نگار کے درمیان جو تعلق گزشتہ چھ سال کے اندر قائم ہوچکا ہے وہ اگر ہم کو آپ کی طرف سے "التفات خاص" کا متوقع نہیں کرسکتا، تو کم از کم یہ یقین تو اسکو پیدا ہی کرنا چاہئے کہ آپ ہمارے خلاف فیصلہ کرنے میں حدود انصاف سے کبھی تجاوز نہ کریں گے

نگار کے شعبۂ انتظام کا سب سے زیادہ تکلیف دہ روزانہ تجربہ وہ خطوط ہیں جو رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت میں موصول ہوتے ہیں۔ تکلیف دہ اسلئے کہ ان میں سے اکثر کا کوئی جواب نمبر خریداری درج نہ ہونے کی وجہ سے نہیں دیا جاسکتا۔ آپ کے نزدیک نمبر خریداری کی کوئی اہمیت نہ ہو، لیکن یہ تو دیکھئے کہ آپ اس کے ترک سے منیجر کا کسقدر وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ بعض حضرات ڈاک خانہ کے رجسٹر د نمبر ۴۰۱۱ کو اپنا نمبر خریداری سمجھتے ہیں حالانکہ ہر مہینے پتے کے کاغذ پر صاف صاف نمبر خریداری علٰحدہ تحریر ہوتا ہے۔ کیا یہ امر بڑا دشوار ہے کہ آپ کسی جگہ اس کو نوٹ کر لیں اور خط و کتابت میں اس کا حوالہ دیدیا کریں۔

اب رہا اصل مسئلہ رسالہ نہ پہونچنے کا، سو اس کے متعلق پہلے بھی ایک مرتبہ عرض کیا گیا ہے اور اب پھر اسکا اعادہ کرتا ہوں کہ دو تین مرتبہ

فہرست سے مقابلہ کرنے کے بعد رسالہ پوسٹ کیا جاتا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ قصداً یا ایسی احتیاط کی صورت میں سہواً کسی کے نام کا رسالہ روانہ نہ ہو، اس لئے اب رسالہ گم ہونے کے جو اسباب ہوسکتے ہیں ان میں سے ایک ڈاک کی بدنظمی ہے جس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر مہینے جب رسالہ نہ پہونچے تو اپنے مقامی ڈاک خانہ کو اطلاع دیجئے اور ہمیں بھی مطلع کیجئے تاکہ ہم بھی محکمۂ ڈاک کو لکھیں۔ دوسرا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض حضرات اپنا پتہ غلط یا ناکافی لکھتے ہیں۔ ڈاک خانہ و مقام کا نام لازماً انگریزی میں لکھنا چاہئے۔ تیسرا سبب یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ بعض حضرات کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہوتا اور رسالہ دوسرے ہاتوں میں پہونچکر ضائع ہوجاتا ہے، ہوسٹلوں، لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں سے جو شکایت رسالہ نہ پہونچنے کی آتی ہے اسکا سبب اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے۔ میں اس مرتبہ خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ کبھی کبھی یہ تکلیف دہ اور وقت ضائع کرنے والے واقعات میرے کانوں تک بھی پہونچ جاتے ہیں۔

یوپی کی ہندوستانی اکاڈیمی نے سال رواں کے لئے پانچہزار روپیہ جدید تصانیف کے لئے منظور کیا ہے اور دو ہزار بہترین کتاب کیلئے یہ بھی طے ہوا ہے کہ ہندو اور مسلم عہد کی ادبی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی تاریخ پر دو کتابیں مرتب کرائی جائیں جس کے لئے کسی اہل ادیب کا انتخاب زیر غور ہے۔

اردو نثر اور اردو نظم کے دو بہترین کتابوں پر بھی علٰحدہ علٰحدہ دو انعام تجویز کئے گئے ہیں اور سر تیج بہادر سپرو نے ایک ہزار روپیہ اپنی طرف سے اس ادیب کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر تین خطبے پڑھے۔ "اکاڈیمی" بھی ایک ہزار روپیہ اس شخص کو دیگی جو تین خطبے اس کے مقرر کردہ موضوع پر دیگا۔

اس مہینے طنزیات کا مضمون ختم ہوجاتا ہے۔ جناب آسی نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جبپر اس سے قبل کسی نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ ہر چند بعض جگہ 'تعریفات' و 'تقسیمات' سے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن نفس مضمون کی ندرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور امید کی جاتی ہے کہ اب اس بنیاد پر زیادہ محققانہ مضمون لکھنا آسان تر ہوجائیگا۔ خواجہ عشرت لکھنوی کا مضمون لکھنؤ کی پھبتیوں پر نہ صرف جمع واقعات بلکہ صحت واقعات کے لحاظ سے بھی قابل داد ہے۔

مجنوں کا افسانہ حسن شاہ انسان کی قوت خیال کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو زمانہ میں بھی شہزادہ پیدا کرسکتا ہے وہ لوگ جو جناب مجنوں کی طرح خیال پرست ہیں اس افسانہ سے بہت لطف اٹھائیں گے، خواہ وہ کتنا ہی "گریزپا" کیوں نہ ہو۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ خیال پرستی کی ارتقائی صورت "عبادت" ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک خیال پرست کبھی "معبود" نہیں بن سکتا۔

دوسرا افسانہ "جواہرات کی چوری" ہے جس کا ایک حصہ اس مہینے کے رسالہ میں شائع کیا جاتا ہے، دوسرا حصہ جس میں انکشاف جرم کو ظاہر کیا گیا ہے آئندہ مہینے میں شائع ہوگا۔ ارتکاب جرائم اور سراغ رسانی کے متعلق جدید ترین انداز افسانہ نگاری یہی ہے جو اس میں پیش کیا گیا ہے جزئیات جرم کے لحاظ سے انکشاف جرم کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا۔ یہ گویا افسانہ نگاری کا "لف و نشر" ہے۔ تیسرا افسانہ "تحفۂ محبت" جتنا مختصر ہے اسی قدر پر لطف ہے۔ مولوی حامد حسن صاحب قادری نے ترجمہ میں اصل زبان کی کیفیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ترجمہ کی خوبی یہی ہے۔

حالی اور شاعری پر سید اعجاز حسین صاحب کا مضمون ختم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ میں اس کو حد درجہ تشنہ کہونگا۔ حالی کی شاعری پر اس سے زیادہ غائر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سلسلہ کے مضامین میں فراست الیدا اور اکبر جاری ہیں۔ غالب کا ذوق فارسی اس مرتبہ درج نہ ہوسکا۔ "اور لارڈ رپن کا عہد حکومت" مئی کے بعد اب پھر شروع ہوتا ہے ابھی اس کے کئی نمبر باقی ہیں لیکن اب بلا انقطاع ان کو ختم کر دیا جائے گا۔

میں انتشار دماغ کی وجہ سے کتب موصولہ پر عرصہ سے ریویو نہیں کر سکا، حالانکہ بعض کتابیں ایسی تھیں جن پر مجھے جلد توجہ کرنی چاہئے تھی مثلاً ڈاکٹر عابد حسین صاحب پروفیسر جامعۂ ملیہ کی "تاریخ فلسفۂ اسلام" حضرت ہوش بلگرامی کا مجموعۂ مضامین "عروس ادب" یا سید محمد صاحب قادری ام۔ اے کی "دنیائے افسانہ" ان میں سے ہر ایک کتاب تفصیلی تبصرہ چاہتی ہے اور حالت یہ ہے کہ میں فقدان فرصت کی وجہ سے ان پر ایک سرسری نگاہ بھی نہیں ڈال سکا۔ میں مصنفین کرام کی خدمت میں یہ معذرت پیش کرتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرونگا۔

"لغت اسلامی"، جس کا ذکر اس سے پہلے کسی اشاعت میں کر چکا ہوں، نگار مشین پریس میں چھپ رہی ہے، جو حضرات اس مفید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ابھی سے اپنا نام دفتر نگار میں بھیجدیں۔ یا براہ راست سید حامد حسین صاحب رضوی اکسائز سب انسپکٹر یوت محل (برار) کو اطلاع دیدیں کیونکہ اس صورت میں وہ خاص رعایت کے مستحق سمجھے جائینگے۔

طنزیات اور اُردو زبان

(گزشتہ سے پیوستہ)

فقرہ چست کرنا

یہ بھی طنز کی ایک قسم ہے اور اس کی تعریف قریب قریب آوازے ملتی ہے اس مین کسی استعارہ یا تشبیہ کا ہونا ضروری نہین ہے مختصر تعریف یہ ہے کہ برمحل کوئی ایسی بات کہی جائے جو یا تو کسی کے اعتراض کا جواب ہو، یا کسی کی ہجو ہو، یا براہ راست دوسرے کے عادات و اخلاق پر کوئی تعریض کرکے اس کی نکتہ چینی یا تحقیر کی جائے اس میں کبھی کبھی متانت بھی شریک ہوتی ہے ورنہ اکثر رمز و کنایہ اور شستہ ظرافت پر اس کی بنا ہوتی ہے۔ فقرہ چست کرنیکا نتیجہ ہمیشہ دل آزاری ہی پر نہین ہوتا بلکہ کبھی اس سے صرف ظرافت، کبھی دوسرے کی ہجو اور تعریض کبھی اپنی مدح کبھی طعن وطنز اور کہین دوسرے کو بیوقوف بنانا کہین فریب دیکر اپنا مطلب نکالنا مقصود ہوتا ہے مولوی اسمٰعیل نے جب جہاد مین شکست کھائی تو شاہ نصیر نے ایک قصیدہ کہا جس کا ایک شعر ہے:۔

ہرن کی طرح میدان وغا مین چوکڑی بھولے　　اگرچہ تھے دم شملہ سے وہ شیر نیشانی

چونکہ اس شعر مین ایک تشبیہ ہے اسواسطے بادی النظر اسپر پھبتی کا دھوکہ یا گمان ہوتا ہے۔ مگر در اصل مولوی اسمٰعیل مرحوم پر ایک فقرہ چست کیا گیا ہے جسمیں انکی حماقت کا اظہار ہے

مومن فریب دینے اور اپنا مطلب نکالنے کے لئے کہتے ہیں۔

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا　　دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

صرف تحقیر کی مثال یہ ہے:۔ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

بقانے میر تقی میر پر یہ فقرہ کہا:۔

میر صاحب بہر اس سے کیا بہتر۔ اس سے ہووے جو نام شاعر کا۔ لیکے دیوان پکارتے پھرئے۔ ہر گلی کوچہ کام شاعر کا

دوسری جگہ بقانے یوں مخاطب کیا:۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر　　اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ریاض الحکایات مصنفہ کاشانی مین لکھا ہے۔ کہ ایک مرتبہ شیطان نے فرعون کے دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائی فرعون نے پوچھا کون ہے۔ شیطان نے فقرہ چست کیا کہ واہ خدائی کا دعویٰ اور یہ معلوم نہیں کون ہے۔

مندرجہ بالا فقرہ سے ظرافت اور ہجو دونون مقصود ہین۔ جواب اور رد تعریض ملاحظہ ہو۔

لقمان کی بدصورتی پر کسی نے تمسخر کیا۔ انھوں نے یہ فقرہ کہا تو نقش پر ہنستا ہے یا نقاش پر۔ اتھنز کے مشہور مقنن سولن کا لڑکا مر گیا وہ اس کے غم میں بہت رویا۔ کسی نے کہا کہ رونے سے کیا حاصل ہے وہ واپس نہیں آسکتا۔ کہا اسی لئے روتا ہوں۔

لیونا نڈز' اسپارٹا کا بادشاہ تھا اس نے جب ایران کے بادشاہ اردشیر بہمن کا مقابلہ درۂ تھرموپالی پر کیا تو ایک سپاہی نے اندیشہ ظاہر کیا کہ دشمن کی فوج اسقدر ہے کہ تیروں کی بوچھار آفتاب کو ڈھانک لیگی لیونا نڈز نے کہا "تو اچھا ہے ہم سایہ میں لڑینگے"

ایک اسکول کا ماسٹر فخر سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ہومر کی غلطیاں درست کی ہیں اسی بیڈیس نے کہا۔ تو آپ بچوں کو کیوں تعلیم دیتے ہیں مُردوں کو تعلیم دیا کرو۔

ایک بہت لمبا شخص کسی انار والے کی دوکان پر پہونچا اناروں کو دیکھکر کہا کہ بہت چھوٹے ہیں۔ انار والے نے کہا "حضرت بیٹھکر دیکھئے"

غصّہ کی گفتگو یعنی ایسی گفتگو جسمیں اپنے رنج کا بھی اظہار ہو اور دوسرے پر بھی رنج کا اثر مترتب کرے اسمیں طعنہ طنز شکوہ۔ شکایت۔ مخاطب کی عیاری بیوقوفی وغیرہ کا اظہار کرکے اس کو بھی مشتعل کیا جاتا ہے۔ مگر یہ گفتگو ہجو کے طرز سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے کہیں اس میں اپنی کمزوری کا کہیں اپنی دلاوری اور فخر کا کہیں دھمکیوں اور دباؤ کا اظہار ہوتا ہے

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں　　جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

اس میں داغ کو رنج پہونچنے اور اس کے بعد بہادری کا اظہار بھی ہوتا ہے فلک کی ہجو کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ ابتک ایسے ویسوں سے کام پڑا ہے کسی دل جلے کو نہیں دیکھا۔

اب کی کچھ منہ سے نکالا تو تمھیں جانوگے　　داغ پھر مجھکو نہ کہنا جو برا کہوں

اسمیں بھی پہلے مصرع سے کسی گفتگو سے رنج پہنچنے کا اظہار ہے اس کے ساتھ ہی اپنی بیباکی کا اعلان

میر حسن مثنوی سحر البیان میں اس جگہ جہاں ماہرخ کو یہ معلوم ہوا کہ میرا معشوق شاہزادہ بے نظیر کسی اور پر عاشق ہو گیا ماہرخ کی زبانی یہ غصہ کی گفتگو کرتے ہیں۔

وہ آگے تو آئے مرے نابکار　　گریباں کو اس کے کروں تار تار

یہی قول و قرار تھا میرے ساتھ　　بھلا اس کا دامن ہے اور میرا ہاتھ

ہمارے بزرگوں نے ہے سچ کہا　　کہ ہیں آدمی زاد کم بیوفا

اتنے میں بینظیر آگیا اس کو دیکھکر یہ گفتگو کی :-

بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے پڑی　　کہاں سن تو او موذی و مدعی تو

مجھے سیر کو مین نے گھوڑا دیا　کہ اس مالزادی کو جوڑا دیا
الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا　یہ اوپر ہی اوپر مزے لوٹنا
مچلکا دیا تھا نہ تو نے ہی　بھلا اس کا بدلا نہ یوں تو نسہی

مندرجہ بالا سات شعرون مین پہلے شعر مین صرف جذبات غضب کا دوسرے مین غضب کے جذبات افسوس کے ساتھ تیسرے شعر مین افسوس اور نصیحت کا پہلو لئے ہوئے جذبات غصہ کا اظہار کیا ہے آخری چار شعرون کے پہلے مین صرف غضب وغصہ۔ دوسرے مین اعتراض اور طعنہ تیسرے مین آوازہ۔ چوتھے مین واقعات کا اظہار اور اظہار غضب وغیرت کیا گیا ہے۔ مثنوی طلسم الفت مین جب وزیر حسن آباد شیدا کی تقریر سنکر بگڑ بادشاہ کے پاس واپس گیا اور وہاں جاکر اس نے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہ حسن آباد اس کے جواب مین کہتا ہے ؎

ہاں کہو جلد فوج ہو تیار　مابدولت کے لاؤ تو ہتھیار
دیکھین تو کتنا حوصلہ ہے اسے　ہم سے عزم مقابلہ ہے اسے
لوہا دکھلانے کو یہ آیا ہے　ہم کو کیا موم کا بنایا ہے
بادشاہ اس کا کیا ہے یہ کیا ہے　کثرت فوج پر یہ بھولا ہے

ان سب شعرون مین صرف غصہ کا اظہار ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی جرأت بہادری اور دلاوری کے پہلو دکھائے گئے ہین۔ مثنوی گلزار نسیم مین حمالہ دیونی (جسکی وجہ سے تاج الملوک کو گل بکاؤلی ملا تھا) اور بکاؤلی کی گفتگو کا یوں نقشہ کھینچا گیا ہے

بکاؤلی نے کہا ؎　بولی کہ اری تجھے خبر ہے　گلچین مرا کونسا بشر ہے
حمالہ :-　بولی وہ کہ صدقہ ہوں بلا لوں　بن دیکھے کسی کا نام کیا لوں
بکاؤلی پھر کہتی ہے ؎　تیرا ہی تو ہے فساد مردار　داماد کو گل دیا مجھے خار

اسی طرح جب بکاؤلی نے تاج الملوک کو اول اول بلایا تو یہ گفتگو کی

میری طرف اک نظر تو دیکھو　کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو　........ کیوں جی تمھیں لے گئے تھے وہ گل
ہے یا نہیں یہ خطا تمھاری　فرمائیے کیا سزا تمھاری

مثنوی لیلیٰ مجنون ہاتفی مین جب لیلیٰ کی ماں کو یہ خبر ہوئی ہے کہ یہ بھی قیس سے کچھ لگاؤ رکھتی ہے تو وہ نہایت خفا ہوئی اور لڑکی سے یہ گفتگو کی

اے اور من رواست اینہا　در ہجو توئی سزاست اینہا　ناموس مرا بباد دادی　در سرزنش عجب فتادی

دارا نے جب سکندر سے خراج مانگا ہے اور اُس نے انکار کیا ہے تو دارا نے لکھا :-

تو اے طفل ناپختہ و خام رائے　مزن پنجہ با شیر جنگ آزمائے
بہم پنجگی با منت یار کو　سیاہت کجا و سپہدار کو
چو کژدم بوی مارخوئی کنی　کہ با اژدہا جنگجوئی کنی
ہماں بہ کہ ای سرور رومیان　بہ بندی چو بندہ بخدمت میان

کہیں غصہ میں ایسے الفاظ بھی کہے جاتے ہیں جنہیں دوسروں پر طنز کیا جائے اور اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے حریف کے جذبات حزن کو برانگیختہ کیا جائے جیسے مثنوی زہر عشق میں ایک جگہ ماں کی خفگی اپنے بیٹے پر یوں ظاہر کی گئی ہے

اللہ آمین سے ہم تو یوں پالیں آپ آفت میں جی کو یوں ڈالیں

کبھی غصہ کی گفتگو میں مخاطب سے نفرت کا اظہار اور اس کو احمق بنانا مقصود ہوتا ہے جیسے فیضی اپنی مثنوی نلدمن میں اسوقت جب طبیب صبح کیوقت نل کی نبض دیکھنے گیا ہے نل کی زبانی غصہ کے ضمن میں طبیب کی حقارت اور اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے نل گفت کہ اے طبیب نادان رنجم مفزا اے یا مدادان نشتر چہ زنی رگ جنوں را آگاہ نہ تب درون را

چشمے بہ دل مشوش انداز قارورہ بہ بر در آتش انداز

زجر و توبیخ کی گفتگو بھی تقریباً غصہ ہی کی موافق ہوتی ہے مگر اسمیں اتنا فرق ہوتا ہے کہ صرف مخاطب ہی کی کمزوریوں وغیرہ کا اظہار ہوتا ہے اور اُسی پر طنز و تشنیع کی جاتی ہے قائل اپنی بہادری اور فخر و مباہات کے پہلو کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا

ملامت اپنے مخاطب سے ایسے الفاظ کہنا جنسے اُسکو افعال یا اقوال پر شرم آئے اور اُس کے جذبات غیرت و غصہ و رنج مشتعل ہوں۔ اس میں بھی طنز طعنہ ہجو وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ اس گفتگو میں واقعات کا اظہار اکثر ہوتا ہے مگر تشبیہ و استعارہ سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ مگر کہیں تمسخر کا ملامت میں جزو غالب رہتا ہے جیسے میر ایک جگہ کہتے ہیں۔

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچہ جاناں والے ادہر آبے ابے او چاک گریباں والے

کہیں اپنے عجز اور بری الذمہ ہونے کے ساتھ دوسرے کو ملامت کیجاتی ہے جیسے میر کہتے ہیں۔

تجھی سے ہیں اے میر یہ خواریاں نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

کہیں طنز یہ کسی واقعہ کا اظہار کر کے ملامت کیجاتی ہے۔ غالب ایک جگہ کہتے ہیں۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

میر پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

ملامت کے ساتھ مخاطب کے حمق کا اظہار

میر میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جسکے سبب اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

کسی کی کمزوریوں کا اظہار کرتے ہوئے ملامت کرنا۔

آج پھر واں بے حمیت میر تھا کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

سودا ہجو اور تمسخر کے پہلو کو غالب رکھکر ایک لڑکی کو ملامت کرتے ہیں ؎

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے　　نہ کہ لڑکوں میں ڈنڈ پیلے

کبھی افسوس کا پہلو غالب رکھتے ہوئے ملامت کیجاتی ہے۔

حسرت موہانی　　عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے　　حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے

سودا　　سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشقباز　　خانہ خراب تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کبھی کسی کے حالات بیان کر کے بغیر تخاطب کسی غیر متعلق شخص سے ملامت کیجاتی ہے۔

میر　　میر کے دین و مذہب کو تم کیا پوچھو ہو اُن نے تو　　قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غرضکہ ملامت کے اسی طرح سے مختلف طریقہ ہیں مگر ہر صورت میں یہ ضروری ہے کہ طنز اور ہجو وغیرہ کا پہلو شریک رہے جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے۔

ہجو

وہ گفتگو جسمیں طنز۔ طعنہ۔ ملامت۔ غصہ۔ رمز و کنایہ۔ پھبتی تمسخر وغیرہ وغیرہ سب چیزیں شریک ہوں اس کو ہجو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھی صرف ایک ہی چیز پر ہجو کی بنا ہوتی ہے۔ کبھی یہ سب چیزیں اس میں ہوتی ہیں ہجو کی مثالیں گزشتہ سب مثالوں سے اخذ کیجا سکتی ہیں۔ ان کا علیحدہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مگر پھر بھی ہم چند جدید مثالیں جا بجا سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔ میر تقی میر ایک پُرخور کی ہجو کرتے ہیں۔

ایک پرخور آشنا ہے پیر　　سینہ سوراخ جس سے ہے کفگیر

صدمنی دیگ ہے شکم اس کا　　نفس اژدہا ہے دم اُس کا

آنت شیطان کی ہے اسکی آنت　　دانت اسکا ہے ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آوے نہار　　منہ ہے گویا کہ زخم دامن دار

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی　　منہ چھیپوں سے جیسے روٹی جلی

گال کلّے سے پھر توے سی سیاہ　　کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

توند کالی جو کھول جاوے لیٹ　　آہنی ہے تنور اس کا پیٹ

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے　　چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

سودا اپنے زمانہ کے کوتوال رشید ی خاں کی ہجو کرتے ہیں۔

شہر میں کیا ہے تھا امن و اماں　　کیسی کرتی تھی خلق خوش گزراں

[illegible]

اب جہاں دیکھو واں جھمکّا ہے چور ہے ٹھگ ہے اور اچکا ہے

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال شیدی فولاد اب جو ہے کتوال

چور کب اس کا زور مانے ہے کالا بال اپنا اسکو جانے ہے

سودا اپنے معاصر میر ضاحک کی ہجو کہہ کے یوں ہنسی اڑاتے ہیں۔

کنکری چننے پر ہے اب گزران معدہ اس کا ہے مرغ کا سنگدان

اور ایک جگہ ضاحک کی ہجو میں کہتے ہیں اور تمسخر کے ساتھ کچھ واقعات بھی لکھتے ہیں

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھریا بیوجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا

بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈی کو جب ہلایا تب شیخ سدو اس پر غصہ کو کھا کے آیا

بولا کہ کیوں ہے ضاحک بکرا کوئی منگایا

ضاحک نے تب کہا یوں تم نے زباں نکالی بے آج کو کہاں ہے کل دو گے مجھکو گالی

بکرے کی شکل ہیجڑیاں نے گو ہمیشہ نکالی بی بی کو اور تم کو گھر کر دیا ہے خالی

بکرا وہ دیگی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا

میراں یہ سن کے بولے پھر کیوں کیا کہا جی میں اس سوا نہیں کچھ اور حرف جانتا جی

بکرا اگر نہ آیا چھوڑونگا کر تجا جی گالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بجا جی

آگے ہے ڈھول دھمپا میں تم کو کہہ سنایا

اور کسی جگہ کسی غریب بڈھے کی خبر لے ڈالی ہے ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی سودا کو یہ بدنما جوڑ دیکھکر مذاق ہاتھ آیا لکھتے ہیں:—

جب گھنگرو وہ بہنکے چلے ہے ٹھلکتی چال آتا ہے شیخ جی کے تئیں اس صدا پہ حال

عمامہ سر سے پھینک کے ہو جاتے ہیں نہال تب مہربانگی سے یہ کہتی ہے وہ چھنال

اب ہم کو اپنی چاہ جتاتے ہیں شیخ جی

اک روز شیخ جی کو جورو سی جا اڑے کہنے لگی کہ تم ہو بڑن کے میرے بڑے

بس اب ڈاڑھی رکھو کہیں جو کانا گر پڑے ڈرتا نہیں ہے مجھ سے تو اے بھڑوے منہ سڑے

کچھ دن ابھی دوا سے ستاتے ہیں شیخ جی

ہجو ملیح | ہجو ملیح بھی ہجو کی ایک قسم ہے اور بہ نسبت صریح ہجو کے طنز سے اس کا تعلق زیادہ ہے ہجو ملیح سے مراد یہ ہے کہ قائل

کچھ ایسی باتیں کہے جو بہ ظاہر تعریف معلوم ہوتی ہوں مگر اصل میں وہ ہجو ہوں

میر اُمرائے ہمعصر کی اس طرح تعریف کرتے ہیں۔

یک بیک گر کسی کی موت آئی — اسکے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہونچی ہے جن کو امرائی — سب ہیں اولاد حاتم طائی
کون دیکر کفن اٹھادے لاش

اولاد حاتم طائی سے تمام بُرائی اور بخل وغیرہ کا دفتر کھولدیا گیا جعفر علی خان فصیح کا یہ شعر بھی اس قسم میں داخل ہوسکتا ہے

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں — تم میں دو وصف ہیں بدخو ہو جفاکار بھی ہو

سودا ایک شخص کی ہجو ملیح اس طرح کرتا ہے۔

دارہ احمد نگر ایک ہیں مرد عزیز — فہم ہیں سرتا قدم اور سراپا تمیز
شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض — جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض

منیر کا یہ شعر بھی ہجو ملیح کی ایک عمدہ اور بہتر مثال ہے۔

عدالت ان دنوں ایسی بڑھائی زمانے نے — کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر پانی

بولی ٹھولی طنز کی ایک قسم ہے زیادہ تر یہ قسم عورتوں کی زبان میں داخل ہے مگر مردوں کی زبان میں بھی اس کا دوسرا مستقل نام رکھنا مناسب نہیں۔ بولی ٹھولی کے معنی یہ ہیں کہ کچھ ایسے الفاظ مخاطب سے کہے جائیں جن کے بظاہر کچھ اور معنی ہوں یعنی یا تو الفاظ ـــــ قدر تعریف سے بھرے ہوئے ہوں کہ اُس آدمی کے مرتبہ اور عزت سے بالاتر ہوں یا وہ کچھ ایسے لہجے میں اداکئے جائیں اور ایسے انداز سے کہے جائیں جو اپنے معانی کو الٹا ظاہر کریں اور اپنے اصلی معانی و مفہوم سے جدا ہوکر قایل کی حسب منشا کام کرنے لگیں۔ یا ان میں رمز و کنایہ شامل ہو۔ مگر ہر صورت میں ان الفاظ سے مخاطب یا کسی شخص کی ہلکی سی ہجو ہونا ضروری ہے۔ کبھی بولی ٹھولی کے ذریعہ سے مخاطب کی ایک ظریفانہ رنگ میں ایسی تحقیر کیجاتی ہے جس سے اسکو رنج نہ ہو بلکہ ایک قسم کی شرمندگی ہو طبیعت میں اور اس میں یہی فرق ہے مثلاً انشا کہتا ہے۔

بلا سے اگر آئی ہولی کہارو — نہ مجھ سے کرو بولی ٹھولی کہارو

ظاہر ہے کہ ہولی میں ہنسی مذاق ہوتا ہے نہ کہ ہولی کی تقریب کیوجہ سے دو دوستوں میں تشنیع۔ طعنہ اور طنز و مخاصمت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ لہذا انشا کے مندرجہ بالا شعر سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جا بجا کی مذاق اور ظرافت باتوں باتوں چھیڑ چھاڑ کرنا بھی بولی ٹھولی میں داخل ہے۔ فسانۂ آزاد میں حسن افزا۔ روح افزا۔ بہار النساء ایک جگہ موجود ہیں بہار النساء کو ذرا اپنے سنورنے کا

زیادہ شوق ہے جو کچھ دور پر آئینہ دیکھ رہی ہے۔ روح افزا اور حسن افزا میں باہم اس عیب کے متعلق رائے زنی ہو رہی ہے جب بہار النسا بن سنور کر آئینہ دیکھکر آتی ہے تو ان دونوں میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔

حسن افزا (روح افزا کے کان میں) "بہار النسا، بہن اسوقت خوب نکھر کے بن ٹھن کے آئی ہیں"

روح افزا کہتی ہے "تم نے کیا دیکھا اِن کو، پہلے دو چار بار دوپٹہ سنبھالا پھر چوٹی کو درست کیا اور پھر آئینہ کے قریب سامنے جا بیٹھیں ان کو تو مرض ہے یہ امی جان تسپر ٹوکتی رہتی ہیں"

اب بہار قریب آجاتی ہے اور کہتی ہے کیا باتیں ہوتی ہیں چپکے چپکے ہم بھی کچھ سنیں میرا ہی ذکر ہوگا"

حسن آرا ہنستے ہوئے "بہن آج آئینہ کے پاس آپ کم بیٹھیں" یہ فقرہ بولی ٹھولی کے تحت میں آئیگا۔

نواب سراج الدین خان سائل دہلوی کے شعر ہیں :-

درِ میخانہ چوپٹ تھا تہجد کو ہوئی چوری — کہ کچھ ٹوٹے ہوئے شیشہ ہیں کچھ چھوٹے پیالے ہیں
گماں کسپر کریں میکش ادھر صوفی ادھر واعظ — خدا رکھے محلہ میں سبھی اللہ والے ہیں

کسے الزام دے کوئی کہکر خاموش ہوگئے اور جن لوگوں کو الزام دیا گیا ہے وہ اسی سے دیا گیا ہے۔ یعنی ہمارے محلہ میں تو کوئی بھی چور نہیں ہے مطلب یہ کہ یہ سب چور ہیں۔

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ علاقہ کابل بلخ و بدخشان وغیرہ فتح کر کے شامل مملکت ہندوستان کر لیا جائے اس کے لئے کوششیں بھی کی گئیں مگر ناکامی ہوئی۔ اسی خیال سے بولی ٹھولی کی صورت میں محمد معظم بڑے شاہزادہ کو لکھتے ہیں :-

رقعہ۔ عمیں پور خلافت بعرض رسید کہ آنفرزند نگاہداشت سپاہ می نمایند و نوکراں بیش مواجب نگاہ میدارند (ظاہرا قصد قندہار داشتہ باشند خدا توفیق رفیق سازد) یہ فقرہ طعن کے طریقہ پر لکھا گیا اور ان کی کم ہمتی پر ان کو شرمایا گیا ہے۔

اسی طرح میر کا ایک شعر ہے ؎

بزم عدو میں آپ تھے کوئی اور تھا — سچ ہے مری نگاہ نے دہوکا دیا مجھے

داغ کہتا ہے .... — تم تو اچھے ہو چلو ہم سے دغا تم نے تو کی

اس کو صرف بولی بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ انشا ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں تو کچھ کھیلی نہیں ہوں ایسی کچی گولیاں — جو نہ سمجھونگی زناخی خان تمھاری بولیاں

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی بات کو کسی دوسرے شخص پر ڈھال کر کہنا بھی بولی ہے۔ کبھی ایسی تعریف کیجاتی ہے جو ہجو ملیح کی صورت سے ہوتی ہے مگر اصل میں اس کو بھی بولی کہا جا سکتا ہے۔ جیسے سودا نے ایک جگہ مولوی ندرت کشمیری کی لڑکی کے

متعلق لکھا ہے ۔

بدقت میتواں فہمید معنی ہای نازاو کہ شرح حکمت العین است مژگان درازاو

بعض لوگ غلطی سے بولی کے ساتھ ٹھٹولی کہتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ٹھٹولی ایک بےمعنی لفظ ہے جو تابع مہمل کی طرح بولی کے ساتھ بولا جاتا ہے اور ٹھٹولی علیحدہ لفظ ہے ۔ جو مذاق اور ہنسی کے معنی میں مستعمل ہے ۔ جیسے سید انشاء اللہ انشاء ایک جگہ لکھتے ہیں

کہا میں نے ہنسکر بھلا کیا کرو نہیں تو ہنسکر کی ان نے ٹھٹولی کہا رو

نوک جھوک

دو شخصوں میں خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن ایسی گفتگو ہونا جنہیں کچھ رمز و کنایہ ۔ کچھ طنز و طعن ۔ کچھ آوازے کچھ شکوہ و شکایات ملی ہوئی ہوں نوک جھوک کہلاتا ہے ۔

مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنی مایۂ ناز تصنیف فسانۂ عجائب میں اس جگہ پر لکھا ہے جہاں شاہزادہ جان عالم جادوگرنی کی قید سے چھوٹ کر ملکۂ مہر نگار کے باغ میں پہونچا ہے ۔ شام کا وقت تھا ملکۂ مہر نگار کی سواری آرہی تھی خواصوں نے دیکھا کہ آج غیر مرد باغ میں بیٹھا ہوا ہے سواری روک دی گئی اور ایک اپنی سمجھ کی موافق جان عالم پر رائے زنی کرنے لگی ۔ سواری کے رکنے پر ملکہ کو اصل حال معلوم ہوا تو حکم دیا کہ دریافت کرو یہ کون ہے لکھتے ہیں :-

ایک خواص باشارۂ ملکہ آگے بڑھی ۔ پوچھا کیوں جی میاں مسافر تمھارا کدھر سے آنا ہوا ۔ اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے سوائے اللہ کی ذات کے ہیہات نہ کوئی سنگ نہ سات اس جنگل میں وارد ہو " شہزادہ نے مسکرا کے کہا کہ مصیبت خیلا تجھ پر پڑی ہوگی ، معلوم ہوتا ہے یہاں آفت زدے ہی آتے ہیں ، کہو تم سب کی کیا کم بختی ، ایاموں کی گردش نصیبوں کی سختی ہے ، جو چرخ ملوں کی طرح ناکام سرشام پھرتی ہو "

ملکہ یہ سنکر پھڑک گئی اور بولی " واہ صاحب تم بہت گرما گرم تندمزاج حاضر جواب ہو ، حال پوچھنے سے اتنا برہم ہو کر کڑا فقرہ سنایا کہ اس مردار کے ساتھ ، تھو تھو ، منہ جھٹ سکو پچھلیاں لیاں بنایا " جان عالم نے کہا اپنا دستور نہیں کہ ہر کس و ناکس سے ہمکلام ہوں ۔ دوسری مردار سے بات حرام ہے مگر خیر دھوکے میں جیسا اس نے سوال کیا ویسا ہم نے جواب دیا اب تمھارے منھ سے مردار نکلا ہم سمجھے چپ ہو رہے " ملکہ نے ہنسکر کہا خوب ایک نشد دو شد ۔ صاحب جو چخ سنبھالو ۔ ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو کیا میرے دشمن درگو مردار خور ہیں ۔ بھلا وہ تو کہہ کے سن چکی میں آپ سے پوچھتی ہوں حضور کس سمت سے رونق افروز ہوئے دولت سرا چھوڑے کے روز ہوئے اور قدوم میمنت لزوم سے اس دشت پرخار کو کیوں رشک لالہ زار کیا "

جان عالم " چہ خوش آپ در پردہ بناتی ہیں ۔ بگڑا کر طنز سے یہ ستاتی ہیں ۔ ہم حضور کاہے کو مزدور ہیں ، تم جو جیتے جی چار کے کاندھے پر سوار ہو البتہ حضور ہو "

ملکہ "اے صاحب کچھ منھ سے بولو سر سے کھیلو نذر بھینٹ جو چاہو لے لو"

جان عالم "امرائیت کو کام نفرمائیے آؤ معلوم ہوا تم بڑے آدمی ہو۔ سواری مانگے کی نہیں ہے خواص بھی تمھاری ہیں۔ خاک نشینوں کی ہمبستری کرو، تکلف نہ کرو۔ طبیعت حاضر ہوگی تو تمھارے بیٹھنے سے کچھ کہہ اٹھیں گے تم ہوادار کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہم فقیر بستر خاک پر سایہ دار

"یہ بین تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا"

ملکہ بولی اس مدۃ العمر میں ایسا مسافر جریدہ، دہن دریدہ تمھارے سوا نہیں دیکھا

زبان سنبھالو یہ منہ زوریاں غریبوں سے　　خدا کی سوں کوئی تم سا بھی بدلگام نہیں

اسیطرح اسجگہ پر جہان جان عالم نے انجمن آرا کو جادوگر کی قید سے چھڑایا ہے اور پھر انجمن آرا کو دیکھکر بیہوش ہوگیا ہے۔ انجمن آرا نے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا ہے جان عالم کو کچھ ہوش آیا۔ انجمن آرا نے جھجک کر گھٹنا سرکایا۔ جان عالم نے چشم نیم وا سے شہزادے کا منہ دیکھا۔ اور کہا ہماری بیہوشی ہوشیاری سے اچھی تھی"

انجمن آرا نے کہا۔ کیا خوب اتنا اختلاط میری جڑ جھٹے تمھاری محنت مشقت پر نظر کر کے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی تم جل نکلے خدا جانے دل میں کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجیے چلتا دھندا کیجیے واہ وا نیکی برباد گناہ لازم

جان عالم ؎　　خاک ہی اپنی اٹھے تو اس مکاں سے اٹھ سکے　　ہم جہاں چوں نقش پا بیٹھے نہ واں سے اٹھ سکے

الا چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا معشوقوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا"

انجمن آرا "چہ خوش، بہلا دل تو بہلا لو، کچھ ہو یا نہ ہو زبان کا مزہ نکالو یہ تو وہی مثل ہوئی مان نہ مان میں تیرا مہمان ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا　　الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

عشق و عاشقی کی باتیں میری بلا جانے، رمز و کنایہ کسی اور سے جا کے کرو۔ اپنا چو چلا تہ کر رکھو اپنی صورت تو غور سے دیکھو یہ تمنے سنا نہیں شاید۔ حلوا خوردن را روئے باید"

جان عالم "میں بیچارہ خستہ تن غربت زدہ آوارہ وطن میں کہاں سے لاؤں کیونکر ویسی صورت بناؤں ایک ہنستا ہے ایک روتا ہے کفر و اسلام میں بڑا فرق ہوتا ہے تمھیں ابھی تک موہن بھوگ کا ذائقہ نہیں بھولا ہے۔ دم تقریر زبان پر حلوا ہے"

انجمن آرا یہ سنکر کھسیانی ہوگئی کہا چلو صاحب وہ مواقربان کیا تھا۔ اپنی چو بچ بند کر۔ جلی کٹی کی ہنسی اپنے گھر جا کر کرو مگر خیر اور جو چاہیے کہہ لیجیے۔ در پردہ کیا صاف صاف گالیاں دیجیے" انجمن آرا "خاطر جمع رکھ اپنے گھر چلکر تجھے مال و زر سے لاد دونگی کہ تو چل نہ سکے گا بوجھ سے ہل نہ سکے گا"

جان عالم "آخر سلطنت کا گھمنڈ آیا۔ ہم بھی کبھی حاجت روائے عالم مشہور تھے"

اسی طرح مثنوی لذت عشق میں جہاں بادشاہزادہ اور وزیرزادہ اپنے ساتھ والوں سے بچھڑ کر کسی باغ میں دم لینے کو ٹھہرے ہیں اور راستے کی تکان سے ایک چبوترہ پر پڑکے سو رہے ہیں وہاں اس شہر کی شاہزادی جو باغ کی مالک ہے اور اس کے ساتھ اس کی وزیرزادی دونوں سیر باغ کو آئی ہیں اور ان دونوں سوتے ہوؤں کے سر پر جاکر کھڑی ہوئی ہیں اور خوب قہقہے لگائے ہیں۔ اس ہنسی کے ساتھ ان دونوں کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے یہ دیکھکر کہ شام ہوگئی ہے چلنے کا ارادہ کیا۔ مگر وزیرزادی اور شاہزادی نے روکا۔ اس جگہ وزیرزادہ گفتگو کرتا ہے۔

کھڑی ہے جو یہ پاس دخت وزیر — حقیقت میں ہے یہ نہایت شریر
اپیلاپن اس کا مجھے بھا گیا — کروں کیا دل اسپر مرا آگیا
مجھے اسکو دیدیجئے گر حضور — تو ساری حرمزدگی ہوجائے دور

یہ سنکر وزیرزادی کہتی ہے۔

سمجھنا نہ دل میں ذرا مجھکو نیک — سناؤں گی سو گر کہے گا تو ایک
نہ ملکہ کی باتوں پہ مغرور ہو — ہوا کھا ذرا اپنی پچھنے دور رہو
ذرا ہوش کی لے تو اپنے خبر — میں جوتی نہ ماروں ترے نام پر

مثنوی میرحسن میں اس جگہ جہاں نجم النسا جوگن بنکر بے نظیر کو ڈھونڈنے گئی ہے اور رات کے وقت اکیلی ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی بین بجا رہی ہے۔ اس طرف سے بادشاہ جنات کا لڑکا گزر رہا اس کو وہ آواز پیاری معلوم ہوئی پاس آبیٹھا اور سمجھ گیا کہ یہ جوگن صرف بنی ہوئی جوگن ہے اسیواسطے کہنے لگا۔

یہ سمجھا بنا وے کا کچھ بھیس ہے — لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے
پڑا ایسا ایسا کہو کیا بجوگ — لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ
کدھر سے تم آئے کدھر جاؤگے — دیا اپنی ہمیں بھی فرماؤگے
وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر — کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر
کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر — یہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
کہا تب پریزاد نے واہ جی — بہت گرم ہیں آپ، اللہ جی

اسی طرح فیروز شاہ شاہ جنات کے لڑکے نے جب بینظیر کو چھڑا دیا ہے اور نجم النساء کے سامنے لایا تو نجم النسا بینظر کے

تخت کے گرد پھرنے لگی تو فیروز شاہ نے کہا۔

کہا اس نے ہنسکر بھلا دیکھ تو　　تو اس بات پر میرے صدقے نہو
کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا　　ارے دیو تو کیوں دوانہ ہوا

رمز و کنایہ یہ وہ گفتگو ہے جسمیں کچھ طنز وطعنہ بھی شریک ہو۔ مگر اس سے قایل کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ مخاطب کو رنج پہونچے بلکہ وہ چھپا چھپا کر ایسی باریک بات کہتا ہے جس سے مطلب کچھ اور ہوتا ہے مگر اس کی زبان سے کچھ اور الفاظ نکلتے ہیں رمز و کنایہ کی گفتگو سے صرف چھیڑ چھاڑ کرنا مقصود ہوتی ہے جیسے

جناب شیخ جو وہ شے حلال ہو جاتی　　تمام رند اسی چیز سے وضو کرتے

اسمیں در پردہ شراب کی خوبیاں بیان کرکے واعظ شہر سے چھیڑ چھاڑ کرنا مقصود ہے۔ کبھی رمز و کنایہ محض طنز وطعن اور اپنی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے حکیم مومن اپنی ایک مثنوی میں کہتے ہیں۔

ہو جاتا میں ہنستے ہنستے بیدم　　آئیں مجھے ہچکیاں جو پیہم
ہاں کس نے کیا ہے یاد بولو　　ہے کون تم اس کا نام تو لو

کبھی رمز و کنایہ اظہار ناز کے لئے ہوتا ہے مثلاً مومن اسی مثنوی میں کہتے ہیں اور اپنے معشوق کی رمز و کنایہ کی گفتگو میں اس کے ناز معشوقانہ کا اظہار کرتے ہیں۔

لاتا گل و عطر میں کبھی گر　　فرماتیں یہ مجھسے مسکرا کر
یہ گل تو عمل کیا ہوا ہے　　یہ عطر فسوں پڑھا ہوا ہے
یہ سونگھوں نہ میں نہ یہ لگاؤں　　ممکن نہیں تیرے دم میں آؤں

مومن اور ایک جگہ اسی مثنوی میں طنز کی صورت میں رمز و کنایہ کی گفتگو کو نقل کرتے ہیں

آئینہ کو رکھتی آگے لاکر　　اور کہتی یہ منہ سے منہ ملاکر
لو دیکھو ذرا کرو خود انصاف　　ہم دونوں میں کس کا رنگ ہے صاف
ہے دونوں میں کون خوبصورت　　ہے دونوں میں کون ماہ طلعت

رمز و کنایہ غصہ کے انداز میں

حالی　　دیکھی ہیں ایسی ایسی بہت مہربانیاں　　اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائیگا
انشاء　　گلوری پان کی جو کھا رہی ہو اس سے کہتا ہوں　　نہ کہے بات کچھ جی میں بری ہو سو اگل ڈالے

مومن　چاک پردہ سے یہ غمزہ ہیں تو اے پردہ نشیں　ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے

انشا کا ایک شعر ہے　گر ناز نیں کے کہے سے برا مانتے ہیں آپ　میری طرف کو دیکھئے میں نازنیں سہی

رمز و کنایہ میں تمسخر کے ساتھ کبھی کسی کی برائی کیجاتی ہے مگر اس صورت سے کہ وہ محض دوستانہ معلوم ہو جیسے ریاض صاحب کہتے ہیں

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن　ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

حالی کہتے ہیں ؎　کیوں بڑھاتے ہو اختلاط اتنا　مجھ میں طاقت نہیں جدائی کی

یہ ایک شکایت ہے کہ آپ کے اختلاط آپ کی محبت کا انجام ہمیشہ یہی ہوا ہے اور یہی اب بھی ہوگا لہذا معاف فرمائے بیخود دہلوی ایک جگہ عجیب طریقہ سے رمز و کنایہ کا اظہار کرتے ہیں ؎

تصویر کیوں دکھائیں تمھیں کیوں بتائیں نام　لائے ہیں ہم کہیں سے کسی بیوفا کی ہے

رمز و کنایہ میں طرز تکلم خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور تقریباً اسی پر اس گفتگو کا مدار ہوتا ہے۔ نوک جھوک کی گفتگو کھلی کھلی چوٹیں ہیں مگر اس میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو بات کہی جاتی ہے بہت پوشیدہ اپنے کسی دوسرے کی آڑ میں یا اس میں ایک ابہام رہتا ہے مثلاً شیفتہ کہتے ہیں ؎

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی　میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

مائل دہلوی کہتے ہیں ؎　آپ کو دیکھتا ہوں اے مائل　اور امانت کو دیکھتا ہوں میں

داغ مرحوم کہتے ہیں ؎　میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ　سب لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں

انور دہلوی ایک جگہ رمز و کنایہ کے ساتھ کہتے ہیں ؎

نہ میں سمجھا نہ تم آئے کہیں سے　پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اکبر کہتے ہیں ؎　آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں　جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانہ والے

ذوق رمز و کنایہ کے انداز کا ایک جگہ یوں اظہار کرتے ہیں ؎

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے　ایما یہ ہے کہ بھیجدو آنکھیں نکال کے

سید انشا بھی اسی رنگ میں کہتے ہیں ؎

بھیجدی انگوٹھی مجھے فیروزہ کی　اس کے یہ معنی کہ ہیں ٹوہ میں خواجہ فیروز

مولانا ناطق گلاوٹھوی رمز و کنایہ کے ساتھ بے مہری کے طعن کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

تم کوستے ہو جب سے طبیعت بحال ہے　اچھے ہیں آج کل تو تمھاری دعا سے ہم

کہیں شکوہ شکایت رمز و کنایہ میں کیجاتی ہے جیسے

توُنے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں　　　　یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

رمز و کنایہ کے سلسلہ میں مجھے یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے رمز و کنایہ کے متعلق جسقدر مثالیں دی ہیں یا جو کچھ رمز و کنایہ کی گفتگو کی تعریف کی ہے اہل ذوق اسکو علم معنی و بیان کی طرف نہ لیجائیں ۔

واسوخت یا جلی کٹی

ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ جلی کٹی عورتوں کی اس گفتگو کی طرف منسوب ہے جو غصّہ کی بحر میں وہ اپنے مخاطب سے کرتی ہیں۔ اس میں استہزا۔ یا تمسخر۔ یا طنز اکثر نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر رشک و حسد کے جذبات ہوتے ہیں۔ اور صاف صاف اپنے رنج پہونچنے کا اظہار کرکے دوسرے کو اس کے پاداش میں ویسے ہی جوابات سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے ۔ اگر کہیں رمز و کنایہ بھی ہوتا ہے تو اس طرح کہ صاف معلوم ہو۔

جان صاحب

الہی جو موے بدنام میرا نام کریں　　　　ادھیں کی نہی بڑی کو مری غلام کریں
کرم ہے کل سے بڑا آج میرے چوُنڈے پہ　　　　بلائیں وہ جو مری بار بار لیتے ہیں
میری جوتی سے میسر اگر تراش تھیں　　　　اپنی بچی کو بٹھا رکھتے نہ تم کو دیتے
اپنے گھر والی میں وہ جا کے خبر تو لیویں　　　　انکی بہنا سے زیادہ نہیں مکار ہوں میں
اپنے پلہ سے نہ باندھو مجھے اب چھوڑ دو تم　　　　لاکھ مکار رہیں مکار ہوں ٹکا رہوں میں

انشا کہتے ہیں ؎

اوروں کے سر چا چڑھو مجھ سے نہ بولو دادا　　　　رکھو نہ اجبڑی ہوئی بختوں جلی سے غرض
اُڑ گئی فاختہ کیوں سرو پہ دم دیتی ہے　　　　اجی اس کا نہ کچھ اچھا مجھے کھڑاگ لگا
تم نے پر بیتی کہانی تو سیر ڑی انا ئ　　　　آپ بیتی تو کوئی بات نہ چھیڑی انا
بھر آئی میری آنکھ تو انشا نے یوں کہا　　　　لگتا ہے مجھکو سوے گھلانا بہت برا
اپنا جو جیتا ہو ہمیں زدر نگوڑا　　　　صدقہ اسے کر ڈالئے درگور نگوڑا

واسوخت میں، عاشق کی طرف سے اپنے معشوق کو جلی کٹی سنائی جاتی ہیں مگر یہ طرز گفتگو صرف نظم ہی میں مروج ہے نثر میں اس کو صرف اسی نام سے موسوم کرین گے جو ہم لکھ چکے ،

مومن خاں کہتے ہیں :۔

کہ اور غزل بطرز واسوخت　　　　مومن یہ اسے سنائیں گے ہم

اب ادر سے لو لگائیں گے ہم　　جوں شمع تجھے جلائینگے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت　　کیا کیا تری خاک اڑائینگے ہم
سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے　　جانا نہ کہ سر اٹھائینگے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح　　تجھ سے بھی بری بنائینگے ہم
لب کا ترے دعوئے مسیحی　　مرا ور پہ آزمائینگے ہم
گر خواب میں بھی ادھر کو دیکھا　　آنکھیں مژہ کو دکھائینگے ہم
گر تیری طرف کو بیقراری　　کھینچے گی تو لوٹ جائینگے ہم
گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو　　منہ پھیر کے مسکرائینگے ہم
کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا　　کچھ اور مزہ چکھائینگے ہم
پھر تیرے ہوا کا دم بھرا تو　　جی ہی کو ہوا بتائینگے ہم
گر خواب میں آن کر جگا یا تو　　سوتے مردے جگائینگے ہم
آتا ہے گلی سے دھیان تیرے　　خاطر میں ستم نہ لائینگے ہم
بتخانہ چین ہو گر ترا گھر　　مومن ہیں تو اب نہ آئینگے ہم

ایک جگہ مرزا غالب بھی اسی انداز میں ایک شعر فرما گئے ہیں جو بہت مشہور و معروف ہے ؎

ہمسے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن　　ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذر مستی ایکدن

امانت مرحوم کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔ اول سے لکھتے آتے ہیں کہ میں نے اپنے معشوق کو بہت کچھ سمجھایا مگر وہ کسی طرح سے نہ سمجھا۔ پھر تو میں بھی آدمی تھا آخر جواب دینے پر مجبور ہو گیا ایک نیا معشوق تلاش کر لیا اور ایک دن پہلے معشوق کے پاس پہونچا۔ یہ معشوق جواب ملا نہایت ہی باوفا تھا لکھتے ہیں ؎

میں نے اس گل کو جو یکرنگی میں کامل پایا　　خار دینے کو ترا اُس غنچہ دہن کے آیا
دیکھکر مجھکو یہ کلمہ وہ زبان پہ لایا　　اب بھی ناحق مرے چونڈے پہ کرم فرمایا

کسکی یہ یاد کہ تو دل سے مجھے بھولا ہے
نہ خدا جھوٹ کرے اب کوئی گل پھولا ہے

کھل کھلا کر مرے منہ سے یہی نکلا اکبار　　گل وہ پھولا ہے کہ اب تجھکو دکھائے گا بہار

اپنے جوبن پہ ہے نازاں عبث اے گلِ خستا باغِ عالم میں پڑے ہیں گل تر تجھ سے ہزار
سرو قد سیکڑوں ہیں غنچہ دہن لاکھوں ہیں
گلشنِ دہر میں بلبل کو چمن لاکھوں ہیں

اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں اس نے کہیں تب وہ بولا۔

ایسی باتیں کبھی آگے نہ سنیں یقین جانتا طعنہ دیدیکے کلیجہ کو دیا میرے پکا
ہاں بہت دن ہو دل اب مری صحبت سے بھرا ایسی ہرجائیوں سے بات نہ کروائے خدا
اچھی صورت جو کسی اور طرف پائی ہے
غیر سے ملنے کی تہمت مرے سر آئی ہے

آنکھوں میں ڈال کے آنکھ اس نے جو اسطرح کہا بولا میں بس مجھے دیدہ کی صفائی نہ دکھا
سر بازِ غیر یہ تو ہے تو مجھے اس سے کیا میں نے بھی ڈھونڈھا ہے اپنے لئے اک ماہ لقا
دیکھے انسان جھلک اسکی تو چکا چوندھ میں آئے
جلکے مہتاب سے چہرے پہ ہوائی چھٹ جائے

پھر وہ شعلہ کی طرح کانپ کے بولا اک بار میں نہ کہتا تھا کہ ہاتھ آیا ہے اسکے کوئی یار
ایڑی چوٹی پہ اسے صدقے کروں لیلیٰ و نہار میں پکارا کہ زباں بند کراے بدکردار
تجھکو کیا کیانہ جلا دے گا جلایا اُس کا
کان اب کھول کے سن مجھ سے سراپا اسکا

اس کے بعد اس کا سراپا بیان کیا ہے اور چلی کٹی کی باتیں کرتے رہے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی محفل ہو جسمیں تو بھی ہو وہ بھی ہو تو میاں سے تیرے روبرو لیکر بیٹھوں اور تو چلے اور کہے کہ اچھا اب ہم گھر جائینگے ۔

گھر کے تو جانیکا اسدم جو کہے قصد صنم یعنی منگوا دو سواری مرا گھٹتا ہے دم
از رہِ طعن وہ تجھ سے کہے اے کشتۂ غم آج رہجاؤ امانت کی تمھیں سر کی قسم
گھر کہاں جاؤ گے اب رات کو سودائی ہو
سو رہو تخت پہ گر نیند بہت آئی ہو

سنکے اس طنز کو تو مجھ سے کہے ہو کے خفا خوب یاں آپ نے لا کر مرا دل شاد کیا

ان سے کہدو کہ زبان بند رکھیں بہرخدا　　مجھکو یہ رمز و کنائے نہیں بھاتے اصلا
لطف یہ ہے کہ ملاقات کا پردا رہجائے
کچھ مرے منہ سے نکل جائے تو پھر کیا رہجائے

قہقہہ مارکے تب یوں کہے وہ گل اندام　　اپنے عاشق سے کہو اور کسی سے کیا کام
مجھ سے کر سکتا ہے بیہودہ بھلا کوئی کلام　　بس چلو چپ رہو ہوتی ہے مری نیند حرام
نام اس گھر کا محلہ میں نہ بدنام کرو
لڑ چکے جاؤ خدا کے لئے آرام کرو

حکیم مومن خان مومن بھی اپنے معشوق سے بہت جل گئے ہیں کہتے ہیں،

ہائے اکبار وہ لطف پیہم چھوڑ دیا　　انس و اخلاص دلاسا و کرم چھوڑ دیا
چارۂ بخش و درمانِ الم چھوڑ دیا　　میں نے بھی آپ کو اس سر کی قسم چھوڑ دیا
اب گر وہ بھی تو داد دل ناکام نہ لوں
گو کہ بدنام ہوا ہوں یہ کبھی نام نہ لوں

جب نہو چاہ تو کس واسطے چاہوں میں بھی　　بیوفا نکلے تو کاہے کو نباہوں میں بھی
تم ہو گر فتنۂ دوراں تو بلا ہوں میں بھی　　خوب ہے جان رکھو یہ کہ بُرا ہوں میں بھی
پھر ادہر منہ نکروں شکل دکھاناتو کہاں
اسطرف سے نہ چلوں کوچہ میں آنا تو کہاں

دیکھ لوں گا میں بس اب مہر لقا اور کوئی　　برق وش شعلہ روش گرم ادا اور کوئی
آتش خرمن آزار و جفا اور کوئی　　شمع کاشانۂ فروزاں دفا اور کوئی
دم ہے آنکھوں میں یہ صدمہ مری دل پر گزرا
گزرے دنیا سے بلا تم ہی میں درگزرا

الغرض واسوخت کو سوائے اس کے کہ مردوں یا عاشقوں کی جلی کٹی سے تعبیر کریں اور معنی نہیں اس میں طعنہ طنز رشک حسد غصہ وغیرہ بھی باتیں شامل ہوتی ہیں

شکوہ و شکایت | اگر بنظر سرسری دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طنز سے یہ بحث بالکل علیحدہ ہے۔ مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے

کہ شکوہ بھی طنز کی ایک نوع ہے۔ کبھی کبھی اس عنوان بیان مین بھی طنزیہ جملے یا اس کے متناسبات شامل ہوجاتے ہیں کبھی اظہار افسوس کے ساتھ شکوہ کیا جاتا ہے کبھی اس میں غصہ وغیرہ کے جذبات شامل ہوتے ہیں۔

شکوہ سے مراد وہ گفتگو ہے جسمین کوئی شخص اپنے مخاطب سے اپنے غم اپنی تکلیف کا خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہوئی ہو ایسے انداز سے اظہار کرے جسمین مندرجہ بالا جذبات مین سے کوئی خاص جذبہ یا سبب شامل رہے شکوہ کا نتیجہ ایسی ہجو پر ختم ہوتا ہے جو سننے والا برداشت کرسکے مرزا غالب کہتے ہیں "شکوہ سے" میں برا نہیں مانتا مگر شکوہ کا فن سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور مہذا دوسرے کے واسطے گنجائش بھی نہ چھوڑے

برسوں ترے لئے ہم احباب سے لڑے ہیں   او دشمن مروت کچھ حق بھی ہے ہمارا

اس شعر میں محض شکوہ ہے اور اپنے حقوق کا اظہار کیا گیا ہے۔ شکوۂ دوستانہ کی مثال ملاحظہ ہو:۔

سائل

غیر پر بیحد عنایت ہو ادھر کچھ بھی نہ ہو   ایک پر اتنا تلطف ایک پر کچھ بھی نہ ہو

کبھی شکوہ میں غصہ بھی عجز اور طنز کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ جیسے غالب کہتا ہے

دیر نہین حرم نہین در نہین آستان نہیں   بیٹھے ہین رہگزر پہ ہم غیر ہمین اٹھائے کیون

کبھی شکوہ عاجزانہ افسوس کے ساتھ ہوتا ہے جیسے غالب کہتا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فیضی مثنوی نلدمن میں اُس حالت کو جب نل دمن کو سوتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا ہے اور دمن بیدار ہوئی ہے اور اس نے نل کی تصویر خیالی سے شکایتین کی ہیں یون لکھتے ہیں۔

آشفتہ دمن زخواب برخاست   چون طرۂ خود تباب برخاست

ہمخوابہ نیافت جز خیالے   ہمدوش نیافت جز ملالے

اس حالت میں عاجزانہ دوستانہ شکوہ کرتی ہے۔

رفتی و مرا خبر نکردی   بر بیکسیم نظر نکردی

رفتی و مرا خبر ندادی   صد تیشۂ غم لبسر نہادی

پیش از تو جنون و عشق بودہ است   این راہ مگر کسے نہ سودہ است

گویند سخنوران کامل   دیوانہ بکار خویش عاقل

اور چند مثالین ملاحظہ فرمائیے:۔

یہاں سے وہاں تک نہ جانے کتنے درخت زمین پر لیٹ گئے تھے۔ میں نے جس گڑھے میں پناہ لی تھی وہ ڈالیوں اور پتوں سے بھر گیا تھا اور پانی اس میں کمر تک جمع ہو گیا تھا۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو میں وہاں سے نکلا۔ میرے کپڑے بالکل بھیگ گئے تھے۔ میرا مکان بہت دور تھا راستہ ایسا نہ تھا کہ وہاں تک آسانی سے پہنچ سکتا میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتفاق سے مجھے دو تین فرلانگ پر ایک بستی دکھائی دی اور میں ٹھوکریں کھاتا ہوا اسی سمت میں روانہ ہوا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک جلاہے کا گھر ملا جہاں برآمدہ میں کئی آدمی جمع تھے اور اسی آندھی پانی کی باتیں ہو رہی تھیں کسی کی جھونپڑی اڑ گئی تھی۔ کسی کے آم اور مہوے کے درخت اکھڑ گئے تھے۔ کسی کا مکان گر گیا تھا۔ غرضکہ عجیب ہلچل مچی تھی۔ میں بھی رات کاٹنے کے لئے اسی مکان میں پہنچا۔ میرا استقبال کچھ اس انداز سے کیا گیا گویا پہلے سے میرا انتظار ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر کسی قدر حیرت ہوئی لیکن تھوڑی دیر میں صاحب خانہ نے ایک سن رسیدہ آدمی کی طرف اشارہ کرکے کہا "ہمارے حسن شاہ نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ایک آفت کا مارا یہاں پناہ لینے آ رہا ہے۔ ان کی یہی عادت ہے کبھی کبھی غیب کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں"۔

حسن شاہ کا نام میں بچپن سے سنتا آیا تھا۔ وہ گرد و نواح میں مجذوب مشہور تھے۔ میں مجذوب کو پاگل سمجھتا تھا اس لئے کہ "عشق الٰہی" کا کوئی خاص مفہوم میرے ذہن میں نہیں۔ یہاں تک تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ کوئی دنیا کی کسی چیز کو غلوئے جذبات میں اللہ یا یا معبود مان کر پوجنے لگے لیکن یہ براہ راست "اللہ میاں" سے عشق میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا۔ بہرحال "حسن شاہ کو لوگ" اللہ والا کہتے تھے اور دور دور سے معتقدین ان کے پاس مرادیں لے کر آتے تھے۔ مجھے ان کے زیادہ حالات معلوم نہ تھے اتنا سنا تھا کہ پہلے وہ کوئی بڑے زمیندار تھے۔ جب سے وہ "جامۂ خرد" سے عاری ہوئے ان کی ساری جائداد ان کے رشتہ داروں کے قبضہ میں چلی گئی صرف ان کا وسیع مکان جو لب دریا واقع ہے اُن کے پاس بڑی مشکل سے چھوڑ دیا گیا ہے اور اب وہ صاحب جذب و کمال ہو گئے ہیں مجھے یہ سنکر بڑا لطف آیا کرتا تھا کہ وہ اپنے مریدوں کو دعا کے بجائے بد دعا دیتے ہیں اور بغیر گالی کے کوئی بات نہیں کرتے میں اس عجیب و غریب ہستی کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔

آج میں نے حسن شاہ کا نام سنا تو ہمہ تن شوق و نیاز بنکر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بھی مجھے غور سے دیکھا اسکی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی جو کسی دوسری دنیا سے حاصل کی گئی تھی۔ اس کی داڑھی بے ربط طریقہ سے چھاتی تک بڑھ گئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں کی رگیں اس طرح ابھری ہوئی تھیں کہ دیکھنے والے پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ مجھے حسن شاہ پہلی نگاہ میں بھوت معلوم ہوا۔ حسن شاہ نے چند منٹ مجھے دیکھا اور پھر میرا داہنا ہاتھ زور سے پکڑ کر کہنے لگا "تم آ گئے! میں ایک مدت سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کسی نہ کسی دن آکر میری داستان سنو گے۔ میرے ساتھ چلو میرے مکان میں تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔ اسکی گرفت میں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بیڑی لگا دی ہے اور میرے تمام جسم میں بجلی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ میں ایسا ڈرا کہ اس کی بے ربط گفتگو پر

حیرت بھی نہ کر سکا۔ مجمع برخاست ہو گیا تھا۔ میزبان کہیں میرے لئے چارپائی لینے چلا گیا تھا۔ میں تنہائی میں حسن شاہ کے سامنے لرزہ براندام تھا اور وہ بھی مجھے پکڑے ہوئے تھا۔ گویا اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں۔ اتنے میں میزبان کی بیوی نکلی اس نے میری گھبراہٹ دیکھ کر کہا "گھبرائیے نہیں۔ یہ نہایت معصوم اور اللہ والے ہیں۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ البتہ یہ دیہیوں کے ساتھ ان کو نہ جانے کیوں بہت زیادہ لگاؤ رہتا ہے۔ یہ قریب کے ایک گاؤں کے مشہور زمیندار ہیں۔ ان کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ انکی شادی ہونے والی تھی لیکن شادی سے ایک دن پہلے لڑکی کو سانپ نے کاٹ لیا اور کچھ دنوں بعد یہ مجذوب ہو گئے ...."

حسن شاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس خوبصورت عورت پر آنکھیں نکال کر بولا "مجذوب تیرے باپ ہوں گے۔ ساٹھ سال کی عمر تیری ہوگی۔ سانپ نے تیرے شوہر کو کاٹ لیا ہوگا۔ اور سنئے کل میری شادی ہوگی۔ گانا بجانا ہو رہا ہے اور کمبخت کہتی ہے سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ تیری زبان سڑ جائے۔" مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔ میزبان کی بیوی نے میرے کان میں جھک کر کہا "ذرا ان سے پوچھئے کہ ان کی عمر کیا ہے۔" میں نے پوچھا تو جواب ملا "۱۸ برس" اب میری دہشت دور ہو گئی اور مجھ پر عبرت چھا گئی۔ میزبان کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھکر حسن شاہ جلدی سے اٹھا اور اس کے آنسو پونچھکر کہنے لگا "یہ کیا؟ آنسو انسانکو بری طرح غارت کر دیتے ہیں۔" اور پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "انھیں آنسوؤں نے میرے اس حصّہ کو جلا کر سیاہ کر ڈالا ہے۔ جب میں کسی کو روتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک بات یاد آجاتی ہے جسکو میں سمجھ نہیں سکتا کہ کیا ہے۔" حسن شاہ یہ کہکر چپ ہو گیا اور بیٹھ کر سوچنے لگا۔ چند لمحے بعد آپ ہی آپ کہنے لگا "بیشک ساٹھ برس! بڈھا ضعیف۔ ناکارہ۔ اپنے ہوش میں نہیں لڑکوں کا کھلونا۔ تم لوگوں کا "مجذوب" دنیا میں تنہا۔ بے یار و مددگار" اس نے اپنا سر اپنے زانوں میں چھپا لیا۔ میزبان کی بیوی نے متحیر ہو کر کہا "ان کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے آج تک کسی نے نہیں سنا تھا۔ یہ تو اب اپنے حواس میں معلوم ہوتے ہیں۔"

میں اب حسن شاہ سے مرعوب نہ تھا۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کے آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے کہا "تم روتے کیوں ہو؟ کل تو تمھاری شادی ہونے والی ہے اور تم بدشگونی کر رہے ہو؟ خوشیاں مناؤ اور اپنی قسمت پر ناز کرو کہ سعیدہ کے ساتھ تمھاری شادی ہو رہی ہے۔" حسن شاہ یک بیک پھر شگفتہ ہو گیا اور اس کے خیالات کا سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا پھر مل گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اسی وجہ سے تو کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔ رات بھر تم کو قصے سناؤنگا کل تم میری شادی میں شریک ہونا۔" میں اس کے ہمراہ جانے کا پورا ارادہ کر چکا تھا۔ مگر پھر اسی عورت نے کہا "حسن شاہ ان کو کل لیجانا۔ آج یہ بہت تھک گئے ہوں گے۔" حسن شاہ نے ڈانٹ کر کہا "پاگل تو نہیں ہوئی ہے۔ کل میری شادی ہے سب کے سب اہتمام میں مصروف ہوں گے ان سے قصے کون بیان کرے گا؟" یہ کہکر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

طوفان ختم ہو گیا تھا مگر طوفان کے آثار باقی تھے۔ زمین دلدل ہو رہی تھی جابجا درخت اکھڑے پڑے تھے ہم لوگ جنگل جھاڑی

میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ کسی طرح باپ سے صاف صاف اپنے دل کی حالت بیان کردوں لوگ اپنی اپنی جگہ سعیدہ کے لئے خاوند تلاش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ سعیدہ نے مجھ سے ملنا کم کر دیا تھا اور جب ملتی تھی تو میں اس کے حرکات و سکنات میں تصنع کا شائبہ محسوس کرتا تھا۔"

حسن شاہ خلاف توقع پھر رک گیا اور فضا میں نہ جانے کس چیز کو دیکھنے لگا میں نے بھی اس کے "سکوت بے محل" میں خلل انداز ہونا نامناسب سمجھا اور صبر کے ساتھ اس کے پھر ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ خاموش رہکر اس نے خود بخود بلا کسی تحریک کے سلسلہ شروع کیا:۔

"آخر کار میں ضبط نہ کر سکا اور اپنے باپ کے پاس ایک مختصر تحریر بھیجدی "سعیدہ کی شادی مجھ سے ہونی چاہئے۔ اگر وہ کسی غیر کی آغوش میں دی گئی تو پھر دریا کی بے شمار موجوں میں میرا پتہ بھی نہ لگیگا" ہر طرف ایک شورش پھیل گئی کسی کو مجھ سے ایسی اُمید نہ تھی باپ نے مجھے بلا کر سمجھایا۔ ترش روئی کے ساتھ باتیں کیں۔ دھمکیاں دیں مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا میں فیصلہ کر چکا تھا میرا ارادہ زور پکڑ چکا تھا میں اپنی بات پر اڑا رہا باپ مجھ پر جان دیتا تھا اس لئے اس کو شکست ہوئی اور سعیدہ مجھ سے منسوب ہو گئی۔ مگر کہیں یہ سب خواب تو نہیں تھا؟ ......" اس کے خیالات پھر پریشان ہونے لگے میں نے جلدی سے کہا "پھر کیا ہوا" حسن شاہ نے جواب میں کہا:۔

میں اپنے قصہ کو بیکار طوالت نہیں دے رہا ہوں اس سے تم میری پوری زندگی کی سرگزشت سمجھ لوگے۔ گھر والوں نے مجبور ہو کر یہ طے کیا کہ ڈیڑھ سال بعد سعیدہ عمر بھر کے لئے میری ہو جائیگی۔ دونوں کلیاں جو مرجھا رہی تھیں پھر شگفتہ ہو گئیں۔ سعیدہ پھر نئی زندگی کی لہریں محسوس کرنے لگی اور میں تو گویا دوبارہ پیدا ہوا۔ لیکن اس کے بعد ہم کو ایک دوسرے سے ملنا نصیب نہیں ہوا۔ سعیدہ رسم کے مطابق مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت ہم نے جن بے چینیوں میں بسر کی ان کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا ہمارے جینے کا بہانہ صرف یہ امید تھی کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے کی آغوش میں پہنچ جائیں گے خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال ختم ہونے کو ہوئے بیاہ کی تیاریاں شروع ہوئیں گانا بجانا شروع ہونے لگا۔ خوشیاں منائی جانے لگیں میں خود ہر کام میں سرگرمی کے ساتھ نمایاں حصّہ لے رہا تھا میرے لئے کائنات پر ایک نیا رنگ پھر رہا تھا۔ سعیدہ کے لئے "حجلۂ عروسی" تیار ہو رہا تھا .... اور اس کے بعد کیا ہوا؟"

میں نے فوراً کہا "ہاں بتاؤ کیا ہوا؟" حسن شاہ نے غور کرتے ہوئے کہا:۔

"شاید میں پاگل ہو گیا۔ مجھے پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر سعیدہ تم نے شادی کا پیغام دیا تو وہ مرجائیگی اور تم پاگل ہو جاؤ گے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ بچپن ہی سے مجھ پر کبھی کبھی ایک خواب کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی جس میں بلا کسی ظاہری توسط کے مجھکو ہونیوالی بات کا علم ہو جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر جن یا پری کا سایہ ہے۔ باپ کو وہ منحوس تحریر روانہ کرنے سے پہلے

میں دیکھ چکا تھا کہ میری سعیدہ کو ایک کالے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ مگر میں متنبہ نہ ہوا محبت نے مجھکو اندھا بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کو واہمہ سمجھ کر دل سے نکال دیا۔ اُف! محبت بڑی خود غرض ہوتی ہے! میں نکاح کا پیغام نہ دیتا تو سعیدہ آج اسی دنیا میں ہوتی اور میں بھی شاید اس حالت کو نہ پہنچتا۔ سعیدہ۔ تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی! میری برباد زندگی کی تجھکو ذرا پروا نہیں۔

من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونۂ؟

حسن شاہ اتنا کہکر خاموش ہوگیا۔ میں نے پوچھا "کیا قصہ پورا ہوگیا؟" یہ سنکر وہ سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے حافظہ پر زور دے رہا ہے۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس قہقہہ نے میرا دل دکھا دیا۔ حسن شاہ نے اپنی بے ہنگام ہنسی قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں اس کے بعد میں دیوانہ اور مجذوب سمجھا جانے لگا۔ دنیا والے ہر بات میں اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں اب بعض مجھے ولی و بزرگ کامل سمجھتے ہیں اور بعض مجنون اور فاتر العقل۔ سچ ہے جسکو دنیا کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو وہ دنیا کے خیال سے دیوانہ ہی ہے مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ لوگ اب بھی مجھے چین نہیں لینے دیتے اور خوامخواہ آکر پریشان کرتے ہیں۔ میں گالیاں دیتا ہوں۔ صلواتیں سناتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ میرے معتقدین اسی میں اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔ ہر جگہ یہ مشہور ہے میری بد دعاؤں کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ خیر اب قصہ بہت مختصر ہے اسے بھی سن لو سعیدہ مجھ سے اب بھی غافل نہیں ہے وہ مجھے گاہے گاہے خط لکھا کرتی ہے اور مجھکو تسلیاں دیا کرتی ہے میں جاکر ان کو لے آتا ہوں اور چند منتخب کرکے تم کو دکھاتا ہوں۔" وہ اُٹھکر ایک کمرے میں گیا اور ایک بوسیدہ صندوقچہ اٹھالایا جسمیں بہت سے کرم خوردہ خطوط بے ترتیبی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ حسن شاہ نے مجھکو ایک تحریر دی اور کہا "پہلے اسکو پڑھو یہ اس وقت کا ہے جبکہ سعیدہ کی موت کے بعد مجھ پر وہ کیفیت اچھی طرح طاری نہیں ہوئی تھی جسکو سب دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں اور میرے والدین میرے دماغ کی طرف مائل کرنے کے لئے میری دوسری شادی کرنا چاہتے تھے میرے ماں باپ کو میری بڑی فکر تھی اور وہ بھی میرے ہی غم میں مرگئے"

میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"پیارے حسن یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم سعیدہ کو بھول گئے جس کے لئے زندگی سے بیزار ہوکر ماں باپ سے بغاوت پر آمادہ ہوگئے تھے؟ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والدین نے کس مشکل سے تم کو میرے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی تھی؟ میں مان نہیں سکتی کہ تم میرے ہوتے ہوئے کسی اور کو اپنے پہلو میں جگہ دوگے۔ میرا حسن اگر دوسرے کا ہوگیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ اور کیا کرونگی؟ نہیں نہیں مجھ کو نہ چھوڑو صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہو۔ دن کٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دن بھی آہی جائیگا جب ہم ایک دوسرے سے ملجائینگے اور پھر کوئی قوت ہم کو جدا نہ کرسکیگی۔ "تمھاری کنیز سعیدہ"

دوسرے خط میں بیتابی کا اظہار کیا گیا تھا۔

"اب تشنگی نا قابل برداشت ہو رہی ہے آخر یہ صبر آزما گھڑیاں گزر کیوں نہیں جاتیں؟ حسن تم کو میں کب دیکھوں گی؟ ...."

تیسرے خط کو پڑھ کر میں بیساختہ رو دیا۔ صرف اس قدر لکھا تھا:-

"کونسی رات آن ملئے گا؟

دن بہت انتظار میں گزرے۔ سعیدہ"

حسن شاہ نے جتنی تحریریں مجھے پڑھنے کو دیں سب ایسی ہی تھیں کہ واقعی کوئی دل والا بھی اُن کی تاب نہیں لا سکتا تھا پھر اگر بیچارہ حسن شاہ اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھا کہ سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی سب سے آخری خط میں لکھا تھا:-

"شاباش حسن شاباش! تم بڑے پختہ مغز ہو۔ آئینِ وفا خوب نباہا۔ میں جب سوچتی ہوں کہ میرا چاہنے والا ایسا دھن کا پکا ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی ہوں۔ بس اب جدائی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ گھبراؤ نہیں تم بہت جلد مجھ سے ملنے والے ہو۔ اللہ اللہ! ہجر کی یہ دراز مدت بھی کیسی کٹھن تھی۔ (تمھاری منتظر سعیدہ) اس خط نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔ میں اس کا مطلب سوچنے لگا۔ سعیدہ میں خطوط پڑھ چکا تھا حسن شاہ نے کہا اب جانے دو سب ایسی ہی ہیں تم بہت تھکے ہوگے خوانخواہ میری وجہ سے پریشان ہوئے صبح ہو رہی ہے کچھ آرام کر لو" یہ کہکر وہ اس طرح بیٹھ گیا گویا اب اس کو کچھ کرنا نہیں تھا۔ اس وقت اسکی بالکل وہی حالت تھی جو کسی عزیز کے جنازہ کی تجہیز و تکفین کے بعد ماتم داروں کی ہوتی ہے یعنی وہ ایک تکان محسوس کر رہا تھا جسنے اس کے اعصاب کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ چار بج چکے تھے ہوا کی خواب آور کیفیت نے مجھ پر اثر کیا اور میں حسن شاہ کی حسرتناک صورت دیکھتے دیکھتے سو گیا لیکن ابھی گھنٹہ بھی پورا نہ ہوا تھا ایک نامعلوم خطرہ کے احساس سے میری نیند اچٹ گئی دیکھا تو حسن شاہ سامنے نہ تھا اور اس کے خطوں کی صندوقچی بھی غائب تھی میں گھبرا کر اٹھا اور سارا مکان چھان مارا۔ کہیں اس کا پتہ نہ لگا میرا دل دھڑکنے لگا۔ احاطہ میں تلاش کرتا ہوا چہار دیواری سے باہر آیا اور ایک ٹیلہ پر چڑھکر ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا یکایک میں نے دیکھا کہ حسن شاہ مجھ سے بہت دور دریا کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کی بغل میں اس کی صندوقچی بھی تھی میری جان سوکھ گئی۔ میں ٹیلہ سے کود پڑا اور پکار کر کہا "حسن شاہ ذرا ٹھیرو ایک بات تو سنو" اس نے چلا کر جواب دیا "میرے پیچھے نہ آؤ میں اب کسی کی نہیں سن سکتا۔ میں اپنی سعیدہ سے ملنے جا رہا ہوں" میں نے دوڑنا شروع کیا مگر بیکار۔ وہ ایک جگہ جہاں دریا بہت گہرا تھا رکا اور صندوقچی کے لئے کود پڑا میں اسکو ڈوبتا دیکھ رہا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ گاؤں والوں کو آواز دی لیکن جب تک وہ آئیں حسن شاہ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ چکا تھا۔

رات بھر میرے گھر والے میرے لئے پریشان تھے۔ ہر جگہ میری تلاش کی گئی مگر میں نہ ملا۔ لوگوں کے دلوں میں نہ جانے کیا کیا اندیشے پیدا ہو رہے تھے آٹھ بجے کے قریب میں صحیح و سالم واپس ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ کسی سے کچھ کہتا سنتا۔ میں نے کچھ کھایا کر حسن شاہ کی سرگزشت پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کی اس دردناک موت کا بہانہ میں ہوا ہوں مجھے دیکھتے ہی اس کے دماغ میں صحت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ اچھی طرح اپنے ہوش میں آگیا تھا۔ اس کا جنون دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خواب سے دفعتاً بیدار ہو گیا تھا۔ اس کی "مجذوبیت" چھن گئی تھی اور اس کی قوتوں نے جواب دیدیا تھا۔ اب وہ زمانہ کی گردش پر فتح نہ پا سکتا تھا اس کی سعیدہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ اس صدمہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ۳۵ برس کا زمانہ اس پر سے چند گھنٹوں میں گزر گیا اتنی مدت کا غم میں اتنے قلیل عرصہ میں برداشت کرنا حسن شاہ کے بس کی بات نہ تھی اور اس نے اس کا علاج سوا اس کے اور کچھ نہیں دیکھا کہ خود بھی سعیدہ کے پاس چلا جائے۔

مجنوں گورکھپوری

بادۂ ناب۔ مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے .... عہ

مطالبہ فطرت۔ (مجلد) اتحاد فلسفۂ اسلام پر ایک بیش تصنیف مصنفہ محمد فاروق ایم۔ ایس۔ سی .... عہ

نمکدان فصاحت۔ عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی۔ تاریخی لطائف کا مجموعہ .... عہ

تذکرۂ حضرت بلھے شاہ۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸

جہاں آرا بیگم۔ شاہزادی جہان آرا بنت شاہجہاں کی نہایت دلچسپ مستند تاریخ ۸

بندگی۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا مکمل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی بے نظیر کتاب .... عہ

لسان الغیب۔ حافظ شیرازیؒ کی مکمل سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول ۱۲ جلد دوم ۱۲

فتنۂ خلق قرآن۔ امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰

کاس الکرام۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور رباعیات کی مکمل شرح اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے .... عہ

یادگار غالب۔ مرتبہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی .... عہ

کلیات نظم حالی۔ شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام کا مکمل مجموعہ جلد اول ۱۲

نقش ارژنگ۔ جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ .... عہ

ابو مسلم خراسانی۔ جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ .... عہ

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

اکبر، آئین اکبری میں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

ایک جوان شخص کی اعلیٰ تعلیم کا اُسوقت یہ معیار سمجھا جاتا تھا کہ وہ عربی زبان لکھ پڑھ سکتا ہے۔ صرف نحو اور عروض کے قواعد سے واقف ہے۔ قرآن کی بڑی بڑی سورتیں زبانی پڑھ سکتا ہے، فارسی اس کی مادری زبان ہے اور حافظ و سعدی کے قریب قریب کل اشعار اور فردوسی کے بہت سے اشعار اُسے یاد ہیں، بادشاہوں اور شہزادوں کی سوانح سے علم رکھتا ہے، کسیقدر علم ہندسہ ہئیت اور تھوڑا بہت علم موسیقی بھی جانتا ہے۔ تیمور کی اولاد جہانگیر کے عہد تک ترکی زبان سے یقیناً واقف تھی۔ چنانچہ جہانگیر خود ترکی زبان جانتا اور اس میں لکھ پڑھ سکتا تھا[1]

اکبر میانہ قد تھا لیکن اس کا قد درازی کی طرف مائل تھا، اس کا رنگ گندمی تھا بلکہ اس میں سانولاپن زیادہ تھا۔ وہ سیاہ چشم و سیاہ ابرو، قوی الجثہ، فراخ سینہ اور کشادہ پیشانی تھا۔ ہاتھ اور بازو لانبے تھے ...... اس کی آواز بلند تھی اور طرز کلام نہایت پاکیزہ اور خوشگوار تھا۔ اس کے عادات و اطوار دوسرے لوگوں سے بالکل جداگانہ تھے اور اس کے چہرہ سے رعب تقدس ظاہر ہوتا تھا۔ یہ بیان اسکے بیٹے جہانگیر کا ہے۔

اپنے بزرگوں کی طرح اکبر بھی بڑا سرگرم شکاری تھا۔ ایک دن میں اس نے خود ۱۲ تیز رفتار جنگلی خرگوش شکار کئے اس نے آگرہ کے قریب میلوں کے نشانات کو بارہ سنگوں کے بے شمار سینگوں سے آراستہ کیا جن کو شکار میں مارا تھا۔ ایک بار اس نے ۴۸ گھنٹے میں ۲۲۰ میل کا سفر گھوڑے پر طے کیا۔

"اس کی تاریخ عجیب و غریب بہادرانہ مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خلقی طور سے اسکو خطرات میں پڑنے کی ایسی ہی تحریک ہوتی تھی جیسا کہ ایک عاقلانہ کام کرنے کی" اس نے شخصی شجاعت کے اُس خیال کو مکمل طور پر ثابت کر دیا جو اس کے عہد میں عام طور پر پھیلا ہوا تھا۔ ذیل کے بہادرانہ اور وفادارانہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ ترکی سپاہی کس حد تک اس جوہر کا مالک تھا۔ تیمور کے بیٹوں میں سے ایک (جہانگیر) قمرالدین کا تعاقب کر رہا تھا اور بالآخر اسے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی آگے نکل آیا اور تحکمانہ لہجہ میں چلا اٹھا "میں قمرالدین ہوں" اور اپنے آقا کے بجائے ہلاک ہو گیا۔

قاسم کوکا اور بابر دونوں کو ایک روز یک قوم کے خان نے قید کر لیا۔ قاسم نے اپنے تئیں بابر ہونا ظاہر کیا اور ٹکڑے ٹکڑے

---

[1] مکمل تعلیم کا دلچسپ خاکہ دیکھنے کے لئے ناظرین کو ابوالحسن اور اس کی لونڈی توڈو کا قصہ لیڈی برٹن کی کتاب الف لیلہ جلد سوم صفحہ ۲۷۰ پر پڑھنا چاہئے۔ مصنف

کر دیا گیا۔ اور بابر آزاد ہو گیا۔ بیرم خاں، ہمایوں کا ایک ممتاز عہدہ دار (اور نوجوان اکبر کا اتالیق) ایک دشمن کے ہاتھ میں اچانک گرفتار ہو گیا۔ ابو القاسم ایک وجیہ شخص بجائے بیرم کے سہواً پکڑ لیا گیا اور قریب تھا کہ ہلاک کر دیا جائے کہ بیرم نے آگے قدم بڑھا کر دلیرانہ آواز سے کہا "میں بیرم ہوں" ابو القاسم نے کہا "نہیں" وہ محض میرا خدمتگار ہے اور چونکہ بہادر اور مطیع ہے چاہتا ہے کہ بجائے میرے خود ہلاک کر دیا جائے اس لئے اسے چھوڑ دو" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابو القاسم قتل کیا گیا اور اس کا آقا بیرم بچ گیا۔ اکبر نے راجہ جے مل (جس کو اس نے اپنی دل پسند بندوق سنگرام کا نشانہ بنایا) اور اس کے بھائی کے بہادرانہ مقابلہ کے بعد چتور کا مشہور سنگین قلعہ تسخیر کیا۔ ان شریف عالی نسب دشمنوں کے غیر معمولی بہادری کی یادگار باقی رکھنے کی غرض سے اکبر نے دونوں کے بت (جو ہاتھیوں پر سوار تھے) دہلی کے پھاٹکوں پر نصب کرائے برنیر لکھتا ہے "یہ زبردست ہاتھی جن پر دو بہادر سوار ہیں نہایت شاندار ہیں ان کو دیکھکر ایک ناقابل بیان رعب و عزت کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا"

ایک خوفناک بلوہ فرو کرنے کی غرض سے اکبر نے تین ہزار سپاہیوں کی فوج لیکر چار سو پچاس میل کا سفر برسات کے موسم میں نو دن کے اندر طے کیا۔ اور باغیوں کی فوج پر (جو اکبر کی فوج سے کہیں زیادہ تھی) جو خیموں میں پڑی سو رہی تھی اچانک چھاپہ مارا۔ بعض جو ان میں سے ہوشیار تھے بادشاہ کی موجودگی پر اعتبار نہ کر سکے کیونکہ اس کی فوج میں اسوقت کوئی جنگی ہاتھی تک نہ تھا۔ شاہی سرداروں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دشمن پر بیخبری کی حالت میں اچانک حملہ کرنا بہادری کے خلاف ہے ہم اسوقت تک انتظار کریں گے جب تک کہ وہ بیدار ہوں، لہذا اکبر نے بگل بجانے والے کو حکم دیا کہ حملہ کا اعلان کرے۔ اسپر باغی فوج مقابلہ کو طیار ہوئی اور بالآخر پامال کر دی گئی۔

ولیعہدی کے زمانہ میں جہانگیر کی طبیعت سخت سزا دینے کی طرف زیادہ مائل تھی جس کا اظہار کئی بار ہوا۔ ایک موقع پر اس نے ایک نوکر کی بابت حکم دیا جو اس کے ہلاک کرنے کی سازش میں شریک ہو گیا تھا کہ اس کی کھال کھینچ لیجاوے۔ جب یہ خبر باپ کے کانوں تک پہونچی جس کی حکمت عملی ایسے معاملات میں ہمیشہ جداگانہ روش رکھتی تھی اور جو خلقی طور پر نہایت نیک تھا اس نے اپنے بیٹے کو نہایت سرزنش آمیز خط لکھا جسمیں بہت کچھ لعنت ملامت کی گئی تھی اور یہ لکھا تھا کہ "ہم بذات ایک بھیڑ کی بھی کھال کو اس کے جسم سے علیحدہ کیا جانا بغیر خوف زدہ ہوئے نہیں دیکھ سکتے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر ایسے شخص کا بیٹا ایک انسان پر اسی خوفناک سزا کا حکم دینا جائز رکھتا ہے"۔ تاہم اکبر خود بھی بعض اوقات نہایت کم سخن اور ضدی ثابت ہوا ہے۔ ایک سست اور کاہل ایلچی کو جس نے دیر لگائی تھی اس نے یہ تحریر بھیجی "اگر تم اسد کے ساتھ دربار کو جلد واپس نہیں آتے تو تم دیکھو گے کہ تمہارے اور تمہارے اہل و عیال پر کیا گزرتی ہے" اس کے بہت سے قصے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تند تو ضرور تھا مگر کینہ پرور نہ تھا اور اس کی رحمدلی نے بتدریج ترقی پائی تھی۔

بادشاہ نماز مغرب کے بعد تخلیہ میں چلا جاتا تھا اسوقت خادم ادھر ادھر منتشر ہو جاتے تھے اور جب بادشاہ کے آنے کا وقت سمجھتے

۵ دیکھو ہربرٹ صاحب کا سفرنامہ مطبوعہ ۱۶۳۴ء صفحہ ۱۰۱ مصنف

پھر جمع ہوجاتے تھے۔ ایک روز شام کو ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ اپنے معمول سے ذرا پہلے نکل آیا اور ایک بدبخت مشعلچی کو اُس نے سوتے دیکھ لیا اور ایسا برہم ہوا کہ اسے مینار پر سے نیچے گرا دیے جانے کا حکم دیا اور اس کا جسم پاش پاش ہوگیا۔ محافظین کی بھی نہایت ذلت کی گئی اور ان کے بجائے دوسرے مقرر ہوئے۔

تخت نشینی کے بارہویں برس چتوڑ کے تسخیر کر لینے پر آٹھ ہزار راجپوت تہ تیغ کئے گئے اور سترہویں سال میں اُسنے ایک قیدی کی زبان نکال لئے جانے کا حکم دیا۔ اٹھارہویں سال میں اس نے تیمور کی طرح دو ہزار انسانی سروں کا مینار چنوایا اور اوائل زمانہ حکومت میں بہت موقعوں پر اس نے ظالمانہ اور وحشیانہ سزاؤں اور عقوبتوں کی منظوری دی یہ باتیں اسوقت کی ہیں جبکہ اکبر کے شباب کا زمانہ تھا اور اسوقت تک اس کے مزاج میں ابو الفضل کی صحبت کا اثر نہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ہر ایک ایسے وحشیانہ کاموں کے ساتھ ہی بیسیوں عاقلانہ اور ترحم آمیز قوانین تمثیلاً بیان کئے جاتے ہیں۔ سن جلوس کے ساتویں برس اس نے حکم دیا کہ جو سپاہی لڑائی میں قید کئے جائیں ان کی بیویاں اور بچے آئندہ سے غلام نہ بنائے جائیں۔ آٹھویں برس جاتریوں پر جو ناگوار محصول قائم کیا گیا تھا معاف کر دیا نویں سال جزیہ موقوف کیا[۱] پچیسویں سال کل باشندگان کی مردم شماری (معہ نام اور پیشہ) کی گئی تاکہ محصولات کا اوسط ہر فرد بشر پر برابر رہے۔ اٹھائیسویں سال ستی ہونے کی جبریہ رسم بند کیگئی اور اکبر نے اس قاعدہ کو خود موقع پر موجود ہو کر شکست کیا۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔

وہ نہایت جری اور مجسم انصاف تھا اس کا منشا تھا کہ وہ تمام آدمیوں کو صلح اور امن کی زنجیر میں ایکساتھ جکڑ دے وہ اس جدوجہد میں تھا کہ اپنی تمامی رعایا کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائے اور اس کے یہاں ۱۵ اہم منصب دار یعنی سواروں کے کماندار تھے جن میں سے اکیس و دس ہندو تھے۔ یہ بالکل غیر ممکن تھا کہ ان سرداروں کے ماتحتوں پر اسلام کے سخت قانون کے ذریعہ سے حکومت کیجاتی مذہبی رواداری ایک سیاسی ضرورت تھی جیساکہ لارڈ ٹینیسن[۲] نے اپنے اس نوٹ میں لکھا ہے جو اس نے اپنی نظم اکبر کے خواب میں تحریر کیا ہے "اسکی مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ ہمارے ٹیوڈر[۳] بادشاہوں کو سربگریباں ہونا چاہئے"۔

---

[۱] اکبر کے زمانہ سے ایک صدی قبل کشمیر کے مسلمان فرمانروا علی شاہ نے اپنے ہندو رعایا کیساتھ برتاؤ کرنے میں بہت سی اصلاحوں کے جاری کرنے میں اکبر سے پیشقدمی کی تھی اس نے جزیہ کو موقوف کیا۔ گاؤں کو ذبح کیا جانا بند کیا۔ اس کے علاوہ علم و ہنر کا بڑا قدر دان اور سرگرم مربی تھا۔ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے معاملات سے اکبر کے کان آشنا ہو چکے تھے اور تخت نشینی کے بارہویں برس تاریخ کشمیر کے ترجمہ کے ذریعہ سے جسے فیضی ترتیب دے رہا تھا ان اصلاحات کی اطلاع ہو چکی تھی عام مذہبی آزادی کا اصول بھی ہندوستان میں کوئی نیا مسئلہ نہ تھا۔ سولہویں صدی کے اندر نانک اور کبیر سکھوں نے اس اصول پر عمل کیا اور اس کی اشاعت کی۔ مصنف

[۲] بمقام سومرسبی ۶ اگست ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۲ء میں وفات پائی انیسویں صدی کے انگریزی شعرا میں بڑا پایہ رکھتا ہے ۱۸۵۰ء میں ملک الشعرا کے لقب سے ممتاز ہوا۔ اور ۱۸۸۴ء میں امارت کی درجہ پر پہونچا۔

[۳] ۱۴۸۵ء سے ۱۶۰۳ء تک جس سلسلہ نسب کے بادشاہ تخت انگلستان پر قابض رہے وہ ٹیوڈر کہلاتا ہے۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہنری ہفتم ٹیوڈر ان کا پڑپوتا تھا اس خاندان کے عہد حکومت میں انگریزوں نے اپنی بحری اقتدار کی بنیاد قائم کی اور یورپ کے پروٹسٹنٹ ملکوں میں درجہ امتیاز حاصل کیا۔

اس کے عہد سلطنت کے دلچسپ واقعات اس کے مذہب "توحید الٰہی" کی بنیاد قائم کرنے سے متعلق ہیں۔ اس معاملہ میں اس کا وزیر ابوالفضل اس کا خاص مشیر تھا۔ شیخ مبارک ایک ممتاز اور آزاد طبع عالم تھا اور اس کے دو بیٹے فیضی اور ابوالفضل اس سے بھی زیادہ ممتاز اور آزاد طبع تھے۔ اس خاندان کا حال ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اکبر کی زندگی کے بہت بڑے حصہ میں انکا اثر ہمیشہ غالب رہا۔ اکبر کے سن جلوس کے بارہویں سال فیضی اس کے دربار میں باریاب ہوا اور بعد میں بادشاہ کا دوست اور منظور نظر ہوگیا۔ ابوالفضل چھ سال کے بعد ۱۵۷۴ء میں دربار تک پہونچا اکبر کی عمر اسوقت بتیس[۳۲] برس کی تھی اور وہ متواتر لڑائیوں اور حملوں سے فارغ ہوکر اطمینان حاصل کر چکا تھا۔ شیخ مبارک جو کسی وقت سنی تھا کم وبیش شیعہ ہوگیا تھا اور ہندوستان و ایران کے مختلف مذاہب کی تحقیقات کر چکا تھا۔

فیضی کی نظم میں اکثر مذہبی مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا۔ جس کے معنی بعض اوقات مخفی ہوتے تھے لیکن اکثر ان اشعار سے معرفت الٰہی مقصود ہوتی تھی مثل اور سب شعرا کے وہ بھی عشق و محبت کے اشعار نظم کرتا تھا۔ لیکن دیگر مشرقی باشندوں کی طرح اس کا معشوق بھی ایک حسین لڑکا تھا۔ ابوالفضل نے آئندہ کے لئے وعدہ کیا تھا کہ وہ فیضی کی نظم پر ایک تنقید[ا] شائع کریگا لیکن بعد کو اس نے لکھا کہ اب ایسا نہیں ہوسکتا فیضی سے مجھکو مثل بھائی کے محبت ہوگئی ہے اور اس محبت کا اب یہ تقاضہ نہ ہونا چاہئے کہ میں اس کی نظم پر جرح کروں بلکہ یہ محبت چاہتی ہے کہ اس کے چند اشعار لکھوں۔"

میں اس موقع پر ان سب اقتباسات کا ایک جزو نقل کرونگا جس سے اس عہد کی شاعری کا نمونہ اور شاعر کی طبیعت کا اندازہ معلوم ہوجائے اور بادشاہ کی طبیعت کا بھی رنگ معلوم ہو جو شاعروں کا قدردان اور دوست تھا۔

یہ اشعار فیضی کے قصائد سے لئے گئے ہیں:-

شعر		ترجمہ
یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا	نور ک فوق النظر حسنک فوق الثنا	اے تو وہ کہ ازل سے موجود ہے اور ابد تک رہیگا تیرا نور بینائی کی رسائی سے بالا اور تیرا حسن تعریف
نور تو بینش گداز حسن تو دانش گسل	فکر تو اندیشہ کاہ کنہ تو حیرت فزا	سے بے نیاز ہے تیرا نور بینائی کو خیرہ کرنیوالا اور تیرا حسن عقل گم کرنیوالا ہے تیری لئے فکر اندیشہ کم کرنیوالی
راہ کمال ترا حرف و نقط ریگ و دشت	عالم علم ترا شہر سخن روستا	اور تیرا راز حیرت بڑھانیوالا ہے تیرے کمال کی راہ میں حرف اور نقطے ریگ جنگل کی مثل ہیں تیرے علم کے
دانش و بینش بہم یک بیک آمد محن	ابجد عشق تر است تحسین ہجا	علم کو کلام کا شہر دیہات کے مانند ہیں دانائی اور بینائی کو باہم ملا دینا گویا تیرے ابجد عشق کی بسم اللہ ہیں
نیست دماغے تہی از سر سودائی تو	مغز فلاطوں بسوخت زین تف ماخولیا	کوئی دماغ تیرے خیال سودا سے خالی نہیں۔ فلاطوں کا مغز اس مالیخولیا کی گرمی سے جلگیا تھا
ولہ		
اے نقد اصل و فرع ندانم چہ گوہری	کز آسمان بلند تر و از خاک کمتری	اے بیخ و شاخ کے نقد نہ معلوم کہ تو کیسا گوہر ہے، کہ آسمان سے بہت بڑا اور زمین سے بہت چھوٹا ہے
بنیان تست مستعد نقش علو و سفل	خواہ آسمان و خواہ زمین مجو مخیری	تیری بنیاد عالم علوی اور سفلی کی استعداد رکھتی ہے، خواہ آسمان بنجا یا زمین بنجا تجھکو اختیار ہے

[ا] اس وعدہ کا وہ ایفا کرتا ہے۔ مصنف

از عقل سرکش کہ مشیرے است مؤتمن 		بر وہم دل منہ کہ سفیہے است مفتری
عقل سے سرکشی نہ کر کہ امانت دار مصلاح کار ہے، وہم پر بھروسہ نہ کر کہ جھوٹا اور تہمت لگانیوالا ہے

شرمندہ باش در نظر خود کہ خویش را 		میزان کل لقب نہی وحشو دفتری
اپنی نظر میں خود شرمندہ ہو کہ اپنے کو، فرد حساب کا میزان کل سمجھتا ہے اس حال میں کہ تو حشو ہے

خواہی بسر معنی ایثار وا رسی 		با خود ہلاہلی کن و با غیر شکری
اگر کرم کے معنی اور راز کو پہنچنا چاہتا ہے، تو اپنے نفس کے لئے زہر ہلاہل اور غیر کے لئے شکر کا کام دے

جان پدر ستارہ طالع بکام تو 		پیوستہ کے رود نہ فلک را برادری
اے جان پدر تیری قسمت کا ستارہ تیرے مقصد کے موافق ہمیشہ کب تک گردش کرتا رہے تو فلک کا بھائی نہیں ہے

ولہ

حریف خلوت من عقل ذو فنون منست 		صریر کلک من آواز ارغنون منست
میری تنہائی کی رفیق خود میری عقل ذو فنون ہے۔ میرے قلم کی آواز میرے ارگن کی آواز ہے

عجب کہ حوصلۂ روزگار بر تابد 		اگر برون فگنم آنچہ در درون منست
اگر زمانہ کا حوصلہ اس کے برداشت کرے جو میرے دل میں ہے تو حیرت کرنا چاہئے

یہ اشعار اس کے غزلوں سے انتخاب کئے گئے ہیں :-

بہ کہ گداز م و ز نو طرح دل دگر نہم 		چند رفوگری کند صبر دل دو نیم را
بہتر ہے کہ اس دل کو چھوڑ دوں اور ایک دوسرے دل کی بنیاد ڈالوں صبر دل دوپارہ کا کہاں تک رفو کرے

گرچہ جاں بے تو بلب نزدیک ہست 		دور بودن باد ب نزدیک ہست
تیرے بغیر اگرچہ جان لب کے قریب آگئی ہے، لیکن دور رہنا ادب کے خیال سے نزدیکی ہے

ناشکری عشق چوں تواں کرد؟ 		غم بر سر غم فزود ما را
عشق کی ناشکری کیونکر ممکن ہے، کہ اس نے غم پر غم ہمارے سر پر بڑھا رکھا۔

حیران فسوں سازی عشقم کہ جمالت 		از دیدہ در دل آید و در سینہ نگنجد
عشق کی فسوں سازی سے میں حیران ہوں کہ تیرا حسن آنکھ سے اندر آتا ہے اور سینہ میں نہیں سماتا

عجب تر از دل فیضی ندیدہ ایم طلسم 		کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص
فیضی کے دل سے زیادہ حیرت انگیز ہمنے کوئی طلسم نہیں دیکھا کہ خود ہی گہر ہے، خود ہی دریا خود ہی غوطہ خور

یہ مصرعے اس کی رباعیات سے منتخب کئے گئے ہیں جنمیں بادشاہ کی مدح حد سے تجاوز کر گئی ہے

خواہی کہ چو من راہ ہدی بشناسی 		نشناختہ شاہ را کجا بشناسی
اگر تجھکو منظور ہے کہ میری طرح ہدایت کی راہ پہچانے تو بادشاہ یعنی اکبر کو بغیر پہچانے راہ ہدایت کب پہچان سکتا ہے

این سجدہ ناقبول سود ت ندہد 		اکبر بشناس تا خدا بشناسی
یہ غیر مقبول سجدہ تجھکو کچھ فائدہ نہ دے گا، پہلے اکبر کو پہچان لے تا کہ خدا کو پہچان سکے

۱۵۷۴ء تک اکبر کم سے کم ظاہر طور پر ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اولیاء اللہ کے مزارات پر جایا کرتا تھا[۵۲]۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے تھے۔ ابوالفضل کی صحبت کے اثر نے اکبر کے خیالات کو پختہ کر دیا جس سے اسکو مکمل تحقیقات کرنے کی تحریک ہوئی۔ شاہ نواز خان (۱۶۹۹ء) ایک معتبر شخص اکبر کے بارہ میں لکھتا ہے

---

[۵۱] فیضی کی ایک رباعی یہ ہے :- 	شاہی کہ بعقل ذو فنون خوانیمش 	در راہ خدای رہنمون خوانیمش 	ہر چند کہ سایۂ خدا ایند شہان
او نور خداست سایہ چون خوانیمش 	اسی قسم کی ایک رباعی صاحب مرأۃ العالم نے یحیٰی کاشانی سے منسوب کر کے لکھی ہے جو شاہجہان کے عہد میں بادشاہ نامہ کے نظم کی خدمت پر مامور تھا۔
گر بیغرضی خواست اوی شاہ دین رو داست 	زین گفتہ حاجتم بدلیل دیگر نیست 	تو سایۂ خدائی و این ہمچو آفتاب 	روشن بود کہ ہیچ کس را دو سایہ نیست

[۵۲] سن جلوس کے بارہویں سال اس نے چتوڑ کی خوشنما یادگاریں بلاشک ایک حد تک پولیٹکل وجوہ سے لیکن زیادہ تر مذہبی خیال سے بھی یکقلم برباد کر دیں یا ان کو خراب کر دیا۔ مصنف

"اس امر کا بارہا اعلان کیا گیا ہے کہ ابوالفضل کافر تھا لیکن یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس میں شبہہ نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ صفات کا شخص تھا اور خلق اللہ کے ساتھ صلح کل چاہتا تھا" وہ اپنے دشمنوں کے حق میں عالی حوصلہ تھا اور حق العباد کے معاملہ میں نہایت ایماندار اور استباز تھا۔ وہ بڑا نازک خیال منشی تھا۔ لوگوں کے دل اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے دہشت زدہ تھے" یہ اعلیٰ درجہ کا مدبر، وفادار اور جان نثار وزیر، ایک فیاض مزاج اور خیراندیش دوست تھا۔ اکبر کی حکومت کی جو کچھ عظمت قائم ہوئی اس میں بڑا حصہ ابوالفضل کا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی (جو اکبر کے عہد کا بڑے مورخ اور زبردست عالم تھا) ابوالفضل کی نسبت کہتا ہے کہ "اکبر بہ نسبت میرے اس پر زیادہ عنایت کرتا تھا"

"اکبر کی خدمات کی بجاآوری میں دائمی انہماک، زمانہ سازی، ریاکاری، بادشاہ کی مزاج دانی اور بیحد چاپلوسی سے اس کا منظور نظر بنگیا تھا۔ ابوالفضل کی چاپلوسی واقعی بسا اوقات حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی لیکن نہ اتنی زیادہ جتنا کہ اس زمانہ کا مقتضا تھا۔ وہ اس معاملہ میں ایسا نادان نہ تھا جیسا کہ وہ درباری جس نے بادشاہ سے یہ کہا تھا کہ مقام مارے پر بارش کے پانی میں تری نہ تھی۔ ابوالفضل اپنی خوش نصیبی سے (جس کا وہ درحقیقت مستحق تھا) وزارت کے درجہ تک پہونچگیا" لیکن ملا صاحب کہتے ہیں "اپنی ناتجربہ کاری اور سادگی کے سبب سے ترقی نہ کر سکا" اس میں شک نہیں کہ ملا صاحب اپنی بدنصیبی کے خود ذمہ دار تھے۔ کیونکہ انھوں نے بہت سے دشمن بنائے تھے اور ایسے غافل تھے کہ مدتوں بلا اجازت اپنی خدمات سے غیر حاضر رہے بادشاہ ان کو پسند نہ کرتا تھا اور ایک موقع پر عین دربار میں ان سے نہایت ترشرو ہوکر سخت کلامی کی تھی، چنانچہ بدایونی کہتے ہیں "کہ اس دن سے میں نے اپنا گستاخانہ طریقہ اور بحث و تکرار کی عادت ترک کردی"۔ ابوالفضل اور فیضی ہمیشہ بدایونی پر قریب چالیس برس سے مہربانی کا برتاؤ کر رہے تھے لیکن ملا صاحب ان کو ہمیشہ ملامت کرتے رہے جس کا سبب ایک حد تک بلاشبہہ ان کی کامیابی پر محض ذاتی حسد تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ ایک سچے دیندار مسلمان تھے اور ان دونوں آزاد خیال دہریوں کے قول و فعل سے آئے دن ان کے مذہبی عقاید کی تحقیر کیجاتی تھی۔

ملا صاحب کو (بالکل انکی مرضی کے خلاف) شاہی کتبخانہ کے لئے مہابھارت کا فارسی ترجمہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ایک دیندار شخص کے لئے یہ کیسا کام تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "میں نے (اٹھارہ فنون میں سے مترجم) دو فن کا ترجمہ کیا جو طفلانہ اور بیہودہ خیالات سے پرہے اور جسے پڑھکر مخلوق خدا حیرت میں آجائیگی ایسے ایسے احکام ہیں جو کسی نے آج تک نہ سنے ہوں گے۔ بہت سی چیزوں کے لئے سخت ممانعت کی گئی ہے اور شلجم کھانے کی تو سخت ممانعت ہے، لیکن یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ میں ایسے کام پر مامور کیا گیا ہوں"۔ ابوالفضل نے اس کا دیباچہ لکھا"۔ ملا صاحب نے رامائن کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ اس کام میں چار برس کا زمانہ صرف ہوا۔ اس کتاب کا ترجمہ

جواہرات کی چوری

(فسانہ)

ارتکاب جرم

(۱)

انسان کے ضمیر کے متعلق ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کہی جاچکی ہیں اور یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی آزردگی یا آسودگی کا دارومدار ضمیر پر ہے خواہ وہ منفعل ہو یا غیر منفعل۔

اس میں شک نہیں کہ اگر انسان کی ضمیر کو اپنے کردار کا احساس نہ ہو تو اسے آزردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن یہ نظریہ قوی دلائل پر قائم نہیں، اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک، نہایت راسخ ضمیر بھی بعض مواقع پر غیر منفعل رہے اور مواقع بھی وہی جو ایک کمزور سے کمزور ضمیر کو غرق انفعال میں غرق کردیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی واقعہ ہے کہ خوش قسمتی سے بعض آدمیوں کی کوئی ضمیر ہوتی ہی نہیں اور اس وجہ سے وہ عوام الناس کی طرح شک و شبہ میں مبتلا ہی نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر ابراہیم کو ہی لیجئے اس کے بشرے سے ہر وقت خیر خواہی اور ہمدردی عیاں تھی۔ کوئی شخص اس کے متبسم، بشاش، کتابی چہرے کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ مجرم ہے اور اس کا پابند صوم و صلوٰۃ ملازم جو اسے ہمیشہ مکان میں خوش و خرم ادھر ادھر گاتے گنگناتے ہوئے دیکھتا اس کی شائستگی کا شاہد تھا۔

ابراہیم کی آمدنی بھی اوسط درجے کی تھی اور وہ آسودہ زندگی بسر کرتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی آمدنی کا ذریعہ چوری تھا یہ کام بہت مشکل اور خطرناک ہے لیکن اگر احتیاط کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ایسا خطرناک بھی نہیں ہے۔ ابراہیم حد درجہ محتاط تھا۔ وہ ہمیشہ تنہا کارروائی کرتا اور کسی سے مشورہ و تذکرہ نہ کرتا۔ اس کا کوئی ساتھی ہی نہ تھا کہ کبھی سرکاری گواہ بن سکتا۔ کوئی اس کا رازدا ہی نہ تھا کہ غصے کی حالت میں خفیہ پولس کو اطلاع دیدیتا اور نہ وہ طماع و مسرف تھا جیسا کہ اکثر مجرم ہوتے ہیں اور اسکی ترکیبیں بڑی ہوشیاری کی ہوتی تھیں اور راز کے ساتھ عمل میں لائی جاتی تھیں اسی طرح آمدنی بھی دانائی کے ساتھ سیونگ بنک میں جمع کردی جاتی تھی۔

ابتداً ابراہیم جواہرات کی تجارت و حرفت سے دلچسپی لیتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی اس کا اظہار ہو جاتا تھا لیکن دوسرے تجار اسپر شبہ کرتے تھے کہ وہ ناجائز اور ممنوع طور پر مسروقہ جواہرات کی خرید و فروخت کرتا ہے۔ مگر ابراہیم ہر ممکن بشاشت

اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جو کچھ وہ جانتا تھا بس وہی جانتا تھا۔ بمبئی میں اس کے خریدار اس سے متنفر نہ ہوتے تھے

اکتوبر کے مہینے میں ایک شام جبکہ وہ اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا تو اوسط درجے کی خوشحالی کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا وہ لباس اسکے زیب تن تھا جسے وہ اکثر بمبئی کے سفر میں استعمال کرتا تھا۔ اس کا بیگ بیٹھک میں کرسی پر تیار رکھا تھا جواہرات کا ایک بنڈل جو اس نے دیانتداری سے آگرے میں خرید رکھے تھے اور کسی قسم کے نامناسب سوالات پوچھنے والوں سے نہیں کئے تھے) اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔ ایک دوسرا بیش بہا پیکٹ اس کے داہنے بوٹ کی ایڑی کے خلا میں پوشیدہ تھا ڈیڑھ گھنٹے میں اسکی روانگی کا وقت ہو جانے والا تھا۔ اور اس کی آمدنی کس طرح بنک میں داخل کی جائے اس مسئلے پر غور کرنے اور ٹہلنے کے علاوہ کوئی اور کام اسی اثنا میں نہ تھا۔ اس کا ملازم سودا خریدنے کے لئے شہر گیا ہوا تھا۔ اور شاید رات کے گیارہ بجے تک اسے واپس نہ آنا تھا اس لئے وہ بنگلے پر تنہا تھا اور اسی وجہ سے کسیقدر۔ کچھ یونہی سا۔ مکدر وہ باغ سے لوٹ کر بنگلے میں داخل ہونیوالا ہی تھا کہ اسے باغیچے کے قریب سے گزرنے والی کچی سڑک پر کسی کے پیروں کی آہٹ سنائی دی وہ رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا بنگلے کے آس پاس کوئی اور مکان نہ تھا جہاں یہ جا رہا ہے تو پھر کوئی ملاقاتی یا مہمان ہے؟ یہ بھی قرین قیاس نہ تھا کیونکہ ابراہیم کے بنگلے پر شاذونادر ہی کوئی ملنے آتا تھا۔ اسی اثنا میں قدموں کی آہٹ قریب تر ہو گئی اور بنگلے کی پکی سڑک پر زیادہ وضاحت کے ساتھ آنے لگی ابراہیم باغ کے دروازے تک آیا اور جھک کر متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ عین اسیوقت روشنی کی چمک میں اسے کسی شخص کا چہرہ نظر آیا جو سگرٹ سلگا رہا تھا۔

—— یہ شخص آگے آیا اور باغ کے مقابل آکر رک گیا۔ اجنبی نے سگرٹ منہ سے نکال کر دھواں چھوڑا اور پوچھا

—— "کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ سڑک اسٹیشن کو جاتی ہے؟"

—— ابراہیم نے جواب دیا— "جی نہیں، کچھ آگے چلکر ایک اور پگڈنڈی ہے جو اسٹیشن کو جاتی ہے"

—— "پگڈنڈی" اجنبی نے ترشی سے کہا "انھوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔ میں صدر سے چلا تھا کہ ٹہلتا ہوا اسٹیشن پہونچ جاؤنگا اور اسی وجہ سے پختہ سڑک پر روانہ ہوا مگر کسی گدھے نے کہدیا کہ پگڈنڈی ہو لو جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ نصف گھنٹے سے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹکریں مارتا پھر رہا ہوں میری نگاہ بھی کسیقدر کمزور ہے"

—— "آپ کس گاڑی سے جائینگے"؟ ابراہیم نے پوچھا۔

—— "جو سات بجکر اٹھاون منٹ پر جاتی ہے"

—— "میں بھی اسی گاڑی سے جانے والا ہوں، لیکن ابھی ایک گھنٹہ اور انتظار کروں گا۔ اسٹیشن یہاں سے، پانچ چھ فرلانگ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اندر تشریف لائیے۔ ذرا آرام کیجئے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے اور پھر آپ یقیناً راستہ نہ بھولیں گے"

آپ کی بڑی عنایت ہے اجنبی نے تاریکی میں بنگلے کی طرف ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا رحالانکہ وہ عینک لگائے ہوئے تھا) مگر میں خیال کرتا ہوں ـــ"

"اسٹیشن پر انتظار نہ کیا یہیں آ ہی" ابراہیم نے اپنے مخصوص انداز سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اجنبی ایک لمحہ توقف کے بعد داخل ہوا اور اپنا سگرٹ پھینک کر ابراہیم کے عقب میں بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن ابراہیم نے اپنے مہمان سے پہلے کمرے میں داخل ہو کر لیمپ روشن کیا۔ لیمپ روشن ہوتے ہی کمرہ جگمگا اٹھا اور دونوں آدمی باہمی تجسس آمیز نگاہوں سے ایک ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"سیٹھ یوسف!" ابراہیم نے اپنے مہمان کو دیکھ کر آہستہ سے خود بخود کہا "اور مجھے پہچانتا بھی نہیں۔ اتنے برسوں کے بعد پہچان بھی کیا سکتا ہے۔ نگاہ الگ کمزور ہے"۔ "کرسی پر تشریف رکھئے" اس نے باآواز بلند کہا "آئے چائے پی لیں وقت کسی طرح گزرے آپ چائے تو پیتے ہوں گے؟"

یوسف نے چائے کی دعوت قبول کی اور ابراہیم نے ایک الماری کھولی۔ یوسف نے اپنی ٹوپی گوشے میں ایک کرسی پر رکھدی اور اپنا بیگ میز کے کنارے رکھکر چھتری میز کے سہارے کھڑی کردی اور خود آرام کرسی پر بیٹھ گیا ابراہیم نے چائے تیار کی اور دونوں نے پینا شروع کیا۔

"کیا بسکٹ نہ لیجئے گا؟" ابراہیم نے کشتی آگے بڑھاتے ہوئے کہا کشتی میں نکل کی چاردانی وغیرہ اور دو نہایت عمدہ بلوریں پیالیاں رکھی تھیں جنپر ستارے منقوش تھے۔

"شکریہ" یوسف نے کہا "ریل کا سفر درپیش ہے اور اس پیدل سفر نے ابھی سے کافی ـــ"

"جی ہاں" ابراہیم نے فوراً کہا "خالی پیٹ سفر کرنا درست نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو یہ بسکٹ ناگوار نہ ہوں گے۔ اتفاق سے کسی اور قسم کے موجود نہیں"۔

یوسف نے اسے اطمینان دلایا کہ اس قسم کے بسکٹ وہ ہمیشہ پسند کرتا ہے اور اس بات کی تائید کے طور پر اس نے بہت کم دودھ کی ایک پیالی بناکر بسکٹ مزے لے لیکر کھانے شروع کئے۔

یوسف خوش خوراک آدمی تھا اور اس موقع پر اسے اشتہا بھی بہت تھی۔ چونکہ وہ چائے بڑے اطمینان سے پی رہا تھا اور بسکٹ اس سے بھی زیادہ سکون سے کھا رہا تھا اس لئے گفتگو زیادہ نہ کرسکتا تھا۔ بس گفت و شنید کا سلسلہ ابراہیم ہی کو جاری رکھنا پڑا اور اپنی تمام زندگی میں اس خوش مزاج بدمعاش کو پہلا موقع تھا کہ اسے باتیں کرنے میں کچھ تشویش، کچھ تکلف، کچھ جھجک کا احساس ہوا۔ حسب قاعدہ اسے اپنے مہمان کی منزلِ مقصود اور شاید غرضِ سفر دریافت کرنی چاہئے تھی۔ لیکن یہی وہ باتیں تھیں

جن سے ابراہیم گریز کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے دونوں باتیں معلوم تھیں۔

یوسف جواہرات کا بڑا تاجر تھا۔ اس کا کاروبار خوب چل رہا تھا اور اس ناتراشیدہ حالت میں خرید کرتا تھا اور ایسے ہیروں کی اسے بہت شناخت تھی اسے معمول سے زیادہ بڑے اور قیمتی جواہرات خریدنے کا شوق تھا۔ اور اس کا یہ معمول سب کو معلوم تھا کہ جب اس کے پاس ہیروں کی کافی تعداد جمع ہوجاتی ہے تو وہ بذاتہٖ خود ان کو بمبئی لیجاتا ہے اور خود اس کی تراش وغیرہ کا اہتمام کرتا ہے۔ ابراہیم بھی اس بات کو جانتا تھا اور اسے کسی قسم کا شبہہ نہ تھا کہ یوسف اب اس غرض سے روانہ ہورہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی حقیر پوشاک کے کسی کونے میں کاغذ کا ایک پیکٹ پوشیدہ تھا جو غالباً کئی ہزار کی مالیت کا تھا۔

یوسف بیٹھا ہوا بسکٹ چباچبا کر کھا رہا تھا اور بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ ابراہیم اس کے مقابل بیٹھا ہوا کسی قدر اضطراب آمیز لہجے میں باتیں کر رہا تھا اور کبھی کبھی بالکل بے تکی بات کہہ جاتا تھا۔ اپنے مہمان کو وہ نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم قیمتی پتھر خاصکر ہیرے اڑانے میں بہت مشاق تھا۔ چاندی سونے کے زیور سے وہ سخت گریز کرتا تھا۔ اور سوائے نقد سکوں کے کچھ وہ چھوتا ہی نہ تھا لیکن ہیرے جن کی کافی تعداد وہ اونچے جوتے کی ایڑی میں پوشیدہ کرکے لیجاسکتا اور آسانی سے فروخت کرسکتا تھا۔ اس کی کاروائیوں کی جان تھے۔ اور اب اس کے سامنے ایسا آدمی بیٹھا تھا جس کی جیب میں ہیروں کا پیکٹ تھا جس کی قیمت ابراہیم کی دس بارہ چوریوں کی آمدنی کے برابر ہوگی۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہا تھا کہ ان ہیروں کی قیمت شاید ——— یکایک اسنے اپنے اوپر قابو حاصل کرکے جلدی جلدی باتیں بنانا شروع کیں۔ گو وہ کچھ بے ربط تھیں۔ کیونکہ دوران گفتگو میں غیر ارادی طور پر اور الفاظ بھی اسکے منہ سے نکل جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ دو جداگانہ سلسلۂ خیالات میں پھنسا ہوا تھا۔

"آج کل شام کیوقت سردی ہوجاتی ہے" ابراہیم نے کہا۔

"ہاں ہو تو جاتی ہے" یوسف نے کہا اور پھر بسکٹ کھانے شروع کردئے

کم سے کم پچھتر ہزار" ابراہیم کو خود بخود خیال پیدا ہوا" اور شاید اسی۔۔۔ نوے ..... یا ایک لاکھ!" ابراہیم اپنی کرسی پر بے چینی سے حرکتیں کر رہا تھا اور اس نے اپنے خیالات کو کسی دلچسپ موضوع پر مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دماغ کی حالت عجیب تھی۔ اسے ناگوار تھی۔

——— "کیا آپ باغ سے دلچسپی رکھتے ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔ ہیروں کی آمدنی اور سیونگ بنک کے حساب کے بعد اگر اُسے کسی چیز سے شوق تھا تو چمپا کی کاشت سے۔

——— "میرے مکان کے قریب کمپنی گارڈن ہے" یوسف نے بے جابت سے مسکرا کر کہا اور وہ یکایک خاموش ہوگیا۔ پھر کہا "شاید آپ کو معلوم ہو، میرا مکان دہلی ہے"

ابراہیم نے اس بے موقع وقفے کو محسوس کیا اور اس کی وجہ بھی وہ بہ آسانی سمجھ گیا۔ جو آدمی اس قدر مال اپنے ساتھ لیجا رہا ہو اسے گفتگو میں احتیاط رکھنی لازم ہے۔

——"ٹھیک ہے" اس نے بے توجہی سے جواب دیا "ایک دہلی والے کو باغ سے دلچسپی ہونا مشکل ہے" اور پھر اس نے اپنے دل میں حساب لگانا شروع کیا۔ فرض کرو کہ پچھتر ہزار میں فروخت ہوئے اس کا سود سیونگ بنک میں کیا ہوگا؟ اگر دوکانیں خریدیں تو کیا آمدنی ہوگی؟ پچھلی مرتبہ اس نے جو دوکانیں خریدی تھیں ان میں سے اوسطاً ہر ایک کی قیمت پونے چار ہزار رکھی اور ماہوار کرایہ چودہ روپیہ اس حساب سے پچھتر ہزار میں بیس دوکانیں خریدی جاسکتی ہیں ایک ماہ میں دوسو اسی روپیہ کرایہ! نو روپیہ روز —— سوا تین ہزار روپیہ سال کے قریب! —— اور ساری عمر کے لئے! یہ جائداد مع اسکی موجودہ دولت کے واقعی جائداد کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اتنی آمدنی پر وہ اپنے پیشے کو ترک کرکے باقی زندگی امن و اطمینان سے گزار سکتا تھا!

اس نے کنکھیوں سے اپنے مہمان کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنی نگاہ پھیر لی کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اس کے دل میں وہ مجرمانہ خواہش پیدا ہو رہی تھی جس کو وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس خواہش کو دل سے نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی انسانی روح کے قتل کو دیوانہ پن سے تعبیر کرتا تھا یہ سچ ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ایک سپاہی پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ مگر وہ واقعہ خلاف توقع تھا اور صورت حالات ناگزیر۔ اس کے علاوہ ساری خطا تو پولیس مین کی تھی۔ رہا امرتسر میں دربان والا واقعہ سو اس کی بابت یہ ہے کہ اگر وہ احمق اتنی بری طرح نہ چلاتا تو .... خیر وہ اتفاق تھا اور یقیناً بڑا افسوس ناک اتفاق اور ابراہیم سے زیادہ کسی کو اس حادثہ کا رنج نہ ہوگا۔ مگر جان بوجھ کر قتل کرنا، اور مال اڑا لینا! یہ تو بالکل پاگل آدمی کا کام تھا!

ہاں اگر وہ اس قماش کا آدمی ہوتا تو تمام عمر کے لئے چین ہی چین تھا۔ زرکثیر، سنسان گرد و نواح، خالی مکان سڑک سے دور اور دوسرے بنگلوں سے فاصلے پر، رات کا وقت اور رات بھی اندھیری —— مگر نعش کے بارے میں بھی تو سوچنا چاہئے یہ بڑی دقت تھی۔ نعش کا کیا انتظام کیا جائے۔ ابراہیم یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ریل کی سیٹی کی آواز سنی جو مکان سے کچھ دور عقب کی جانب سے گزر رہی تھی۔ اس آواز نے اس کے دماغ میں نیا سلسلۂ خیالات چھیڑ دیا اور دورانِ تخیل میں اس کی آنکھیں پُر معنی تبسم آگین جو اطمینان سے بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ آخر کار اس نے کوشش کرکے اپنی نظر پھیری اور یکایک اپنی کرسی سے اٹھکر سامنے آتشدان پر رکھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا اور اپنے ہاتھ آگ کی طرف بڑھا دیئے۔ اس کے احساسات میں تلاطم سا بپا تھا اور بار بار اس سے کوئی اندرونی طور پر تاکید کرتا تھا اس مکان کو چھوڑ کر چلا جائے اس کا جسم کانپنے لگا گو بہ نسبت سردی کے گرمی زیادہ محسوس کر رہا تھا اس نے پیچھے پھر کر دروازے کی طرف دیکھا۔

——"بڑی سرد ہوا چل رہی ہے" اس نے ذرا کپکپاتے ہوئے کہا "معلوم نہیں میں نے دروازہ اچھی طرح بند کیا تھا یا نہیں؟" وہ کمرے کی

دوسری طرف گیا اور دروازہ کھول کر تاریک باغ میں دیکھنے لگا یکایک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کھلی ہوا میں باہر نکل کر ذرا ٹہلے اور اس وحشت کو خیرباد کہدے۔

—"میرے خیال میں ابھی چلنا ٹھیک نہیں" اس نے دھندلے آسمان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

—"کیا تمھاری گھڑی ٹھیک ہے ؟" یوسف نے ذرا ہوشیار ہو کر پوچھا۔

ابراہیم نے ذرا توقف کے بعد کہا کہ گھڑی ٹھیک ہے" اگرچہ وہ خدا سے چاہتا تھا کہ اس کے منہ سے نکل جائے کہ سست ہے۔

—"ہمیں یہاں سے اسٹیشن پہونچنے میں کتنی دیر لگے گی ؟" یوسف نے پوچھا۔

—"پچیس تیس منٹ لگیں گے" ابراہیم نے غیر ارادی طور پر وقت میں اضافہ کر کے بتایا۔

—"تو ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اور اسٹیشن پر پڑے رہنے کی بہ نسبت یہاں زیادہ آرام ہے۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ ضرورت سے زیادہ پہلے چلنے سے کیا فائدہ ؟"

—"واقعی کچھ فائدہ نہیں" ابراہیم نے کہا اور عجیب جذبات کی ایک لہر جس میں قدرے افسوس اور قدرے مسرت شامل تھی اسکے دل میں دوڑ گئی۔ چند منٹ وہ دہلیز پر کھڑا ہوا رات کی تاریکی میں دیکھتا رہا گویا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور قدرتاً، خاموشی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چابی تالے میں گھوم گئی وہ واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کم سخن یوسف سے باتیں شروع کیں۔ لیکن اس کے منہ سے الفاظ بہکے بہکے نکلتے تھے۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا دماغ چکر کھانے لگا اور کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے مہمان کو خوفناک دلچسپی سے دیکھ رہا ہے اور اس نے بڑی کوشش اور قوت ارادی سے اپنی نگاہیں پھیریں لیکن ایک لمحے کے بعد وہ پھر خود بخود اور بھی سختی کے ساتھ اسی آدمی پر آ جمیں اس کے دماغ میں خطرناک خیالات چکر لگا رہے تھے۔ دوسری قسم کا مجرم یعنی ایک قاتل یا ڈاکو ایسی حالت میں کیا کرے گا ؟ رفتہ رفتہ اس کے تصور کردہ قتل کی تمام تفصیلات مرتب ہو گئیں۔ اور واقعات نے باقاعدہ اور معقول سلسلے کی شکل اختیار کر لی وہ بے چینی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا لیکن اس کی آنکھیں ہنوز اپنے مہمان پر جمی ہوئی تھیں۔ ابراہیم میں زیادہ دیر تک اس آدمی کے سامنے بیٹھنے کی تاب نہ تھی جس کی جیب میں قیمتی جواہرات ہوں۔ وہ جذبہ جس کا احساس اس کے لئے خوفناک تھا لمحہ بہ لمحہ اس کے اختیار سے باہر ہوتا جاتا تھا۔ اگر اس نے ذرا اور توقف کیا تو یہ جذبہ اُسپر غالب آجائیگا۔ اور پھر ———— اس خوفناک خیال سے وہ کانپ جاتا تھا۔ لیکن وہ جواہرات حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ کیونکہ ابراہیم بھی فطرتاً و عادتاً مجرم تھا وہ ایک شکاری جانور کے مانند تھا۔ اس نے کبھی دیانتداری سے کسب معاش نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ چوری اور اگر ضرورت پڑی تو طاقت کے ذریعہ سے سرقہ اسکی فطرت ہو گئی تھی اور بیش بہا جواہرات کی موجودگی اس کے لئے دلیل تھی کہ وہ اُن کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرے یہ بات

اس کے نزدیک ناگوار تر ہوتی جاتی تھی کہ وہ ان ہیروں کو اپنے قبضے سے باہر جانے دے

لیکن اس نے ایک مرتبہ پھر ارتکاب جرم سے بچنے کی کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ روانگی کے وقت تک یوسف کے سامنے نہ آئیگا۔

معاف کیجیئے" اس نے کہا "میں ذرا جا کر دوسرے جوتے پہن آؤں گو یہ ممکن ہے بارش ہو جائے اور پھر سفر میں ان ہلکے جوتوں سے ذرا تکلیف ہوگی"

"نہ صرف تکلیف بلکہ سردی ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے" یوسف نے جواب دیا

کمرہ طے کر کے ابراہیم باورچی خانے تک گیا جہاں اس نے لمپ کی دھیمی روشنی میں اپنے بوٹ جوتے پالش کئے ہوئے رکھے دیکھے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور جوتے پہننے لگا۔ دراصل وہ جوتہ تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کے ہیرے ان جوتوں میں پوشیدہ تھے جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ پہلے یوسف کو دکھانے کے لئے تبدیل کرے اور پھر کوئی معقول عذر کر کے از سر نو وہی جوتے پہن لے۔ اس طریقے سے وقت آسانی سے گزر جائیگا۔ اس نے ایک گہری سانس لی کیونکہ اس کمرے سے باہر آ کر اسے ذرا سکون قلب نصیب ہوا۔ شاید دور رہنے سے وہ مجرمانہ خواہش رفع ہو جائیگی یوسف اپنے راستے چلا جائیگا۔ ابراہیم خدا سے چاہتا تھا کہ وہ تنہا چلا جائے۔ کیونکہ اس طرح ارتکاب جرم کا موقع نکل جائیگا مگر ہیرے ....؟

اس نے اپنے جوتوں کے بند کھولتے ہوئے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ابراہیم، یوسف کو میز کے قریب باورچی خانے کی طرف پشت کئے بیٹھا دیکھ سکتا تھا۔ وہ چائے پی چکا تھا اور اطمینان سے بیٹھا ہوا سگرٹ بنا رہا تھا۔ ابراہیم نے ایک گہری سانس لی اور ایک جوتا اتار کر کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا یوسف کی پشت کو دیکھتا رہا۔ پھر دوسرا جوتا اتارا لیکن اُس کی نظریں اپنے بے خبر مہمان پر گڑی ہوئی تھیں۔

یوسف نے سگریٹ بنا کر سرے پر لب لگایا۔ تمباکو کی تھیلی جیب میں رکھی تمباکو کے ریزے اپنے گھٹنوں پر سے جھاڑ دیئے اور جیب میں دیا سلائی تلاش کرنی شروع کی یکایک ایک زبردست جذبے سے مغلوب ہو کر ابراہیم اٹھا اور آہستہ آہستہ کمرے کی طرف بڑھا۔ پیر دل میں جراب پہنی تھی۔ بلی کی طرح دبے پاؤں وہ آگے آیا اور کمرے کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ اسکا چہرہ سرخ ہو گیا اسکی کشادہ آنکھیں لمپ کی روشنی میں چمکنے لگیں اور خون اس کے کانوں میں سنسنانے لگا۔

یوسف نے دیا سلائی روشن کی، سگرٹ سلگایا۔ اور دیا سلائی بجھا کر آتشدان میں پھینک دی نیا سلائی کا بکس جیب میں رکھکر سگریٹ پینا شروع کیا۔

بلی کی طرح آہستہ آہستہ دبے پاؤں بلا کسی آواز کے ابراہیم کمرے میں آیا۔ یہاں تک کہ وہ یوسف کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

وہ اتنا قریب تھا کہ اگر وہ اپنا منہ پھیر لیتا تو اس کا۔ سانس یوسف کے سر کے بالوں کو جنبش دیتا۔ نصف منٹ تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ جری قاتل کی مانند خوفناک روشن آنکھوں سے بے خبر تاجر جواہر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کا سانس تیزی سے لیکن بلا کسی آواز کے اس کے کھلے ہوئے منہ سے گزر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں بیتابی سے متحرک تھیں اور پھر ایسی ہی خاموشی کے ساتھ وہ الٹے پاؤں دروازے تک واپس آیا اور منہ پھیر کر جلدی سے باورچی خانے میں چلا گیا۔ اور وہاں پہونچکر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ معاملہ نازک ہوچکا تھا۔ یوسف کی جان بچ ہی گئی۔ ورنہ مار دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب وہ یوسف کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا۔ کوئی چھری ہوتا تو .... اس نے باورچی خانے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی اور اس کی نظر ایک لوہے کی سلاخ پر پڑی جسے وہ مزدور وہاں پڑا چھوڑ گئے تھے جنھوں نے باورچی خانے میں جنگلہ لگایا تھا۔ یہ ایک فٹ لمبی اور ایک انچ مربع موٹی تھی۔ اگر ایک منٹ پہلے اس کے ہاتھ میں یہ سلاخ ہوتی تو ....

اس نے سلاخ کو اٹھا لیا۔ ہاتھ میں تول کر دیکھا اور اپنے سر کے چاروں طرف گھمایا۔ بڑا مخدوش ہتھیار تھا۔ آواز ہونے کا بھی خطرہ نہ تھا اور اس نے جو ترکیب اپنے ذہن میں ترتیب دی تھی اس کے موافق بھی تھا۔ لاحول ولا قوۃ! کیا بیہودہ خیال ہے! مجھے اسے یہیں ڈال دینا چاہیے ـــــ اس نے خیال کیا۔

لیکن اس نے سلاخ کو پھینکا نہیں۔ وہ دروازے تک آیا اور یوسف کو اسی طرح بیٹھے ہوئے اور اطمینان سے سگرٹ پیتے ہوئے پایا۔ اس کی پشت ہنوز باورچی خانے کی طرف تھی۔

یکایک ابراہیم پر ایک دوسری کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا چہرہ تمتما گیا اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ اس کے چہرے پر خوفناک وحشت نمایاں ہوگئی۔ اس نے اپنی جیب سے نکال کر گھڑی کو بغور دیکھا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔ پھرتی لیکن خاموشی سے بیٹھنے کے کمرے کی طرف بڑھا۔

اپنے شکار کی کرسی سے ایک قدم پیچھے وہ رکا اور احتیاط سے نشانہ لیا۔ سلاخ ہوا میں گھومی لیکن اس کی حرکت سے خفیف سی سرسراہٹ کی آواز ہوئی کیونکہ یوسف نے اک دم چہرا پھیر کر دیکھا جس سے قاتل کا وار اوچھا پڑا اور سلاخ یوسف کے سر میں اچٹتی ہوئی لگی اور معمولی سا زخم آیا۔ یوسف فوراً اچھل کر کھڑا ہوگیا اور حملہ آور کے بازو غیر معمولی سختی سے پکڑ لئے موت کے خوف نے اس کے اعضا کو توانائی دیدی تھی۔

دونوں آدمی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے اور کشمکش شروع ہوگئی آپس کی کشتی میں کرسی ٹوٹ گئی اور میز پر سے چائے کی بلوری پیالیاں گر کر چکنا چور ہوگئیں۔ یوسف کا چشمہ بھی گر کر پیروں میں کچل گیا۔ یوسف کے منہ سے تین مرتبہ ایک خوفناک، یاس آمیز وحشت زدہ چیخ نکلی اور باوجود اس کے کہ ابراہیم پر خون سوار تھا وہ خوفزدہ ہوگیا کہ مبادا کوئی اتفاقی راہگیر ان چیخوں کو نہ سن لے۔

اس نے اپنی تمام طاقت آخری کوشش کے لئے مجتمع کرکے یوسف کو میز پر پٹخ دیا اور میز پوش کا ایک کونہ اس کے سر پر ڈالدیا اور پھر جو یوسف نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو وہی میز پوش اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ دو منٹ تک دونوں اسی طرح بے حس پڑے رہے رہے۔ جب سانس کی حرکت بالکل بند ہوگئی تو ابراہیم نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور یوسف کا مردہ جسم پھسل کر زمین پر گر پڑا۔

یوسف کا قصہ تمام ہوگیا تھا انجام خواہ نیک ہوا یا بد۔ ابراہیم کھڑا ہوا ہانپ رہا تھا اور اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجنے میں صرف ایک منٹ تھا۔ ساری کارروائی میں کچھ اوپر تین منٹ صرف ہوئے تھے۔ گاڑی جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور ابراہیم کو تمام کام اسی دوران انجام دینا تھا۔ مال گاڑی جس کا اس تدبیر قتل سے بہت تعلق تھا سات بجکر بیس منٹ پر مکان کے عقب میں صرف تین سو گز کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ مگر وقت ضائع کرنا ٹھیک نہ تھا اب ابراہیم کی طبیعت بالکل مطمئن تھی۔ اسے فکر تھا تو یہ کہ لین یوسف کی چیخیں کسی نے سن لی ہوں اور اگر کسی نے نہیں سنیں ...... پھر کیا تھا!

اس نے جھک کر آہستہ آہستہ میز پوش نعش کے منہ سے نکال کر احتیاط سے اسکی جیبوں کی تلاشی لینی شروع کی اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی مطلوبہ شئے کو پالیا۔ اس نے کاغذ کے پیکٹ کو دبا کر دیکھا۔ سنگ ہائے بیش بہا کی کرکراہٹ سے اس کی تمام پشیمانیاں خوشی میں تبدیل ہوگئیں۔

پھر وہ باقاعدگی اور پھرتی کے ساتھ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن گھڑی کی طرف بار بار دیکھتا جاتا تھا۔ خون کے چند بڑے بڑے قطرے میز پوش پر گر گئے تھے اور نعش کے سر کے قریب قالین پر بھی لہو کا ایک بڑا داغ پڑ گیا تھا۔ ابراہیم باورچی خانے سے تھوڑا سا پانی، کپڑا، اور سخت بالوں کا برش لایا۔ میز پوش پر سے تمام دھبے دھو ڈالے اور میز پوش کے نیچے تختے پر جو داغ ہوگئے تھے ان کو بھی صاف کیا۔ قالین کو بھی صاف دھویا اور بھیگے ہوئے مقامات کو کپڑے سے خشک کر دیا۔ نعش کے سر کے نیچے ایک کاغذ رکھدیا تاکہ پھر قالین پر خون نہ گرے میز پوش کو عمدہ طریقے سے بچھا دیا۔ کرسی کو سیدھا کیا۔ ٹوٹی ہوئی عینک کو فرش پر سے اٹھاکر میز پر رکھا۔ آدھا جلا ہوا سگریٹ جو ہاتھا پائی کے دوران میں پامال ہوگیا تھا اٹھاکر آتشدان میں پھینک دیا شیشے کے تمام ٹکڑے جو فرش پر پڑے تھے یکجا کرلئے۔ کچھ تو پیالیوں کے ٹکڑے تھے اور کچھ ٹوٹی ہوئی عینک کے ریزے اس نے سب کو کاغذ کے ایک تختہ پر رکھکر نہایت احتیاط سے دیکھکر عینک کے تمام بڑے بڑے ٹکڑے جو شناخت میں آسکتے تھے علیحدہ کاغذ پر رکھے اور کچھ مختلف ذرے ان میں آمیزش کئے۔ شیشے کے باقی ماندہ ریزوں کو اس نے مکان کے عقب میں کوڑے کے ڈھیر پر ڈالدیا۔

چلنے کا وقت ہوگیا تھا۔ ابراہیم نے جلدی سے ڈوری کے گچھے میں سے ایک ٹکڑا نکال کر یوسف کا بیگ اور چھتری ایک جگہ باندھکر اپنے شانے پر لٹکائی۔ عینک کے شیشوں والے کاغذ کی پڑیا باندھکر مع چشمے کے فریم کے اپنی جیب میں رکھی۔ نعش کو

کندھے پر ڈالا۔

یوسف دبلا پتلا آدمی تھا۔ وزن میں ڈیڑھ من سے زیادہ نہ تھا اور اتنے وزن کا اٹھا لینا ابراہیم جیسے توانا اور تنومند کسرتی آدمی کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

رات بالکل تاریک تھی اور جب ابراہیم نے اپنے بنگلے کے عقبی دروازے سے اس اُجاڑ میدان پر نگاہ ڈالی جو بنگلے سے ریل کی لائن تک پھیلا ہوا تھا تو اسے مشکل سے بیس گز فاصلہ کی چیز نظر آتی تھی۔ کچھ دیر احتیاط سے کان لگا کر سنا اور جب کوئی آواز نہ سنائی دی تو وہ باہر نکلا۔ دروازہ آہستہ سے بند کیا اور تیز لیکن محتاط قدموں سے ناہموار میدان کو طے کرنا شروع کیا۔ اسکی رفتار اتنی خاموش نہ تھی جتنی کہ وہ چاہتا تھا کیونکہ اگرچہ وہ چھوٹی چھوٹی گھاس جو وہاں اُگی ہوئی تھی اس کے قدموں کی آواز کی مانع تھی۔ لیکن بیگ اور چھتری جو اس کے شانے پر آویزاں تھے نہایت پریشان کن طریقے سے کھڑکھڑاتے تھے اور اسکی رفتار کی بہ نسبت وزن کے یہ دونوں اشیا زیادہ مخل ہوتی تھیں۔

ریل کی لائن تک تقریباً تین سو گز کا فاصلہ تھا۔ عام طور پر وہ اس فاصلے کو تین چار منٹ میں طے کر سکتا تھا لیکن اب جبکہ وہ اپنے بوجھ کی وجہ سے احتیاط کے ساتھ چل رہا تھا اور کبھی کبھی جھک کر کسی آہٹ کو سننے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی آ تو نہیں رہا ہے اس فاصلے کے طے کرنے میں پورے چھ منٹ لگے اور وہ ان تاروں تک پہونچ گیا جو میدان کو ریل کی لائن سے جدا کرتے تھے یہاں پہونچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر توجہ کے ساتھ کان لگا کر سنا اور تاریکی میں ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر اس سنسان مقام پر نہ کوئی ذی روح موجود تھا نہ کسی کی آواز لیکن بہت دور سے انجن کی سیٹی کی آواز آرہی تھی جو اس کے لئے پھرتی کا پیغام تھی۔

اُس نے آسانی سے نعش کو تاروں کے جنگلے کے اوپر اٹھایا اور چند گز کے فاصلے پر لے گیا جہاں ریلوے لائن میں خم تھا۔ اُسنے نعش کا منہ نیچے کو کرکے اس کی گردن اپنی طرف کی پٹری پر رکھدی۔ جیب سے چاقو نکال کر اس نے وہ گرہ کاٹ ڈالیں جن سے چھتری اور بیگ بندھے ہوئے تھے اور جب چھتری اور بیگ کو نعش کے قریب لائن پر ڈال دیا تو اس نے احتیاط سے ڈوری کو جیب میں رکھ لیا مگر گرہ کاٹنے کے وقت ذرا سا ٹکڑا زمین پر گر گیا اور ابراہیم سے نظر انداز ہو گیا۔

آنے والی مال گاڑی کی آواز اور انجن کی چھک چھک اب بخوبی سنی جا سکتی تھی۔ ابراہیم نے جلدی سے عینک کا فریم اور شیشے کی پڑیا جیب سے نکالی۔ فریم نعش کے قریب ڈالدیا اور شیشے کے ٹکڑے پڑیا میں سے نکال کر عینک کے چاروں طرف بکھیر دیئے۔

یہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے یہ سب بالکل ٹھیک وقت پر انجام دے لیا۔ کیونکہ انجن کی آواز بالکل قریب آگئی تھی۔ پہلے تو اسے

خیال ہوا کہ تھوڑے فاصلے پر جاکر اس واقعے کو دیکھے جس کی وجہ سے قتل ایک معمولی واقعہ، خودکشی کی صورت میں تبدیل ہونیوالا تھا لیکن یہ خطرناک تھا۔ اس لئے یہی بہتر تھا کہ وہ آس پاس نہ رہے۔ وہ جلدی سے تاروں کے جنگلے کو کود کر میدان کو طے کرنے لگا اور مال گاڑی شور مچاتی اُس طرف کو آئی۔

وہ مشکل سے عقبی دروازے تک پہونچا ہوگا کہ ریل کی لائن کی طرف سے آنے والی آواز نے اس کے قدموں کو باندھ دیا۔ یہ ایک لمبی سیٹی، یکایک بریک کے لگنے کی وجہ سے پہیوں کے رگڑنے اور گاڑیوں کے ٹکرانے کی آواز تھی انجن کے فراٹے کی آواز بند ہوگئی تھی اور اس کے بجائے اب تیزی سے بھاپ نکلنے کی آواز آرہی تھی — گاڑی رک گئی تھی!

ایک لمحے کے لئے ابراہیم کا تنفس بند ہوگیا منہ کھلے کا کھلا رہگیا گویا اسے سکتہ ہوگیا تھا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھا دی۔ وہ واقعی ڈر گیا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ نعش دیکھ لی گئی تھی۔ مگر اب کیا ہو رہا تھا؟ کیا وہ اس کے بنگلے کی طرف آرہے تھے؟ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر آواز سننے کی کوشش کی کیونکہ اسے خیال تھا کہ کوئی آدمی آکر معلوم کس وقت دستک دے۔ وہ بیٹھنے کے کمرے میں گیا اور چاروں طرف نظر ڈالی ہر چیز با ترتیب تھی۔ گو وہ لوہے کی سلاخ وہیں پڑی تھی جہاں اُس نے اسے کشتی لڑنے کے دوران میں پھینک دیا تھا۔ اُس نے اُسے اٹھایا اور لمپ کے قریب لیجا کر دیکھا۔ خون کے نشانات اسپر بالکل نہ تھے مگر دو ایک سر کے بال لگے ہوئے تھے۔ بلا سوچے سمجھے قریب قریب غیر ارادی طور پر اس نے ان کو میز پوش سے صاف کر دیا اور باورچی خانہ سے نکل کر وہ عقبی باغچہ میں گیا اور سلاخ کو پھینک دیا جہاں وہ جھاڑیوں میں جا پڑی سلاخ میں کوئی بات اتہام انگیز تو نہ تھی لیکن چونکہ ابراہیم نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا اس لئے اسکی نظروں میں اس سلاخ کی اہمیت ذرا نامساعد سی ہوگئی تھی۔

اب اُس نے محسوس کیا کہ اسوقت اسٹیشن کو چلدینا ہی بہتر ہوگا۔ وقت تو ابھی نہیں ہوا تھا کیونکہ سات بجکر صرف پچیس منٹ گزرے تھے لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر کوئی آئے تو اسے مکان پر پائے۔ اس کی ٹوپی کوچ پر رکھی تھی اور اس کا بیگ چھتری بھی وہیں موجود تھی ٹوپی سر پر رکھکر بیگ ہاتھ میں لیکر وہ دروازے کی طرف چلا۔ لیکن لمپ کی روشنی دھیمی کرنے کے لئے واپس آیا۔ اور اسوقت جبکہ وہ بتی نیچی کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا اس کی نظر حسن اتفاق سے اس تاریک گوشے کی جانب گئی جہاں یوسف کی ٹوپی کرسی پر رکھی تھی جہاں مرحوم نے کمرے میں داخل ہونے کے وقت اسے رکھدیا تھا۔

ابراہیم چند لمحوں کے لئے ساکت کھڑا رہگیا اور مہلک خوف کیوجہ سے اس کی پیشانی سرد پسینے کے بڑے بڑے قطروں سے تر ہوگئی۔ ذرا سی دیر اور ہوجاتی تو وہ لمپ گل کر کے اسٹیشن کا راستہ لیتا اور پھر......... وہ کرسی کی طرف گیا ٹوپی اٹھا کر اسکے اندر دیکھا۔ کرمچ کی پٹی پر نام صاف لکھا ہوا تھا "سیٹھ محمد یوسف" اگر وہ اس ٹوپی کو چھوڑ کر چلا جاتا اور پھر یہ برآمد ہوتی تو ابراہیم

کی توخبر بھی اسے پھانسی پر لٹکا دینے کے لئے کافی تھی!۔

اس ہولناک خیال سے اس کا تمام جسم کانپ گیا لیکن باوجود خوف کے اس نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باورچی خانے میں سے تھوڑی سی پتلی پتلی لکڑیاں لایا جو اس کا ملازم آگ سلگانے کے لئے رکھتا تھا۔ اور انھیں لاکر اس نے بیٹھک کے کمرے کی آتشدان میں ڈال دیا گو آگ بجھ چکی تھی لیکن راکھ میں چنگاریاں باقی تھیں۔ جو کاغذ اُسنے یوسف کے سر کے نیچے رکھا تھا تاکہ قالین پر دھبہ نہ آئے اور جسپر اب اسنے پہلی مرتبہ دیکھا کہ خون کا چھوٹا سا داغ تھا اس کاغذ کو تہہ کرکے لکڑیوں کے نیچے رکھا اور ایک دیاسلائی جلاکر اسمیں آگ لگادی۔ جب لکڑیاں بھڑک اٹھیں تو اس نے اپنے جیبی چاقو سے ٹوپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور سب کو آگ میں ڈال دیا۔

اس دوران میں خوفِ انکشاف سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ٹوپی کے ٹکڑے اشتعال پذیر نہ تھے بلکہ جلنے کے بجائے آگ میں پڑکر اینٹھتے، سلگتے، دہواں دیتے، اور بڑی تیز بدبو پیدا کرتے تھے۔ اس بدبو اور دہوین کو منتشر کرنے کے لئے اسے باورچی خانے کا دروازہ کھولنا پڑا کیونکہ سامنے کا دروازہ کھل نہیں سکتا تھا وہ لکڑیاں توڑ توڑ کر آگ میں ڈال رہا تھا لیکن ان کے چٹخنے کی آواز کے علاوہ کسی اور آواز کے سننے کے لئے وہ ہمہ تن گوش تھا۔ مخدوش قدموں کی آواز، دروازے پر دستک کی آواز۔ جو اس کے لئے موت کا پیغام ہوگی۔

وقت گزرا جارہا تھا۔ آٹھ بجنے میں صرف اکیس منٹ باقی تھے۔ چند منٹ کے اندر اسے روانہ ہوجانا چاہئے ورنہ گاڑی چھوٹ جائیگی۔ وہ بھاگ کر اوپر کی منزل پر گیا تاکہ دو منزلے کی کھڑکی کھول دے کیونکہ جانے سے پہلے باورچی خانے کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ جب وہ واپس آیا تو ٹوپی کے آخری ٹکڑے بل کھاکر کوئلے کی مانند سیاہ ہوچکے تھے اور چربی کی طرح سن سن کرکے جل رہے تھے اور متعفن دہواں اُن میں سے نکل نکل کر چمنی کی طرف جارہا تھا۔ آٹھ بجنے میں انیس منٹ! چلنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے کرچھا اٹھاکر ٹوپی کی راکھ کو کوٹ کر چورا چورا کردیا اور پھر منتشر کرکے لکڑیوں کی راکھ اور انگاروں میں ملا دیا۔ ظاہرا طور پر آتشدان سے کوئی غیر معمولی بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ خطوط اور دوسری اشیا بیٹھک کے آتشدان میں جلانا ابراہیم کا روزانہ کا معمول تھا اس لئے اس کا ملازم کوئی غیر معمولی بات محسوس نکریگا۔ اور غالباً ملازم کے واپس آنے سے پہلے ہی ٹوپی کے تمام انگارے بجھ کر راکھ ہوجائیں گے۔ یہ اسنے پہلے ہی غور سے دیکھ لیا تھا کہ ٹوپی میں کوئی فلزئی حصہ نہیں تھا جو جلنے سے باقی رہگیا ہو۔

اس نے اپنا بیگ پھر اٹھایا اور چاروں طرف ایک سرسری نگاہ ڈال کر لمپ دھیما کیا۔ دروازہ کھول کر چند منٹ انتظار کیا اور باہر نکل کر دروازے کو مقفل کیا (کیونکہ ملازم کے پاس دوسری چابی موجود تھی) اور تیز قدمی سے اسٹیشن کی راہ لی۔

وہ وقت سے کافی پہلے پہونچ گیا اور ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ گاڑی آنے کا سگنل نہیں ہوا تھا لیکن اسٹیشن پر غیر معمولی ہنگامہ اور انتشار تھا۔ تمام مسافر پلیٹ فارم کے ایک سرے پر جمع تھے اور سب ریل کی لائن کی طرف دیکھ رہے تھے اور جیسے ہی وہ پریشان کن تجسس کے ساتھ انکی طرف بڑھا تاریکی میں دو آدمی پلیٹ فارم کے ڈھال پر چڑھے جن کے کندھوں پر ترپال سے ڈھکی ہوئی ارتھی کی قسم کی کوئی شے تھی۔ ترپال کے نیچے سے ارتھی پر لیٹے ہوئے آدمی کے جسم کا نقشہ نظر آتا تھا اور تمام مسافر جب ارتھی لانے والوں کو راستہ دینے کے لئے ہٹے تو انھوں نے متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جب ارتھی اسٹیشن کے ایک کمرے میں پہونچ گئی تو تمام مسافروں کی توجہ اس قلی کی طرف مبذول ہوئی جو کچھ ہی دور ایک بیگ اور چھتری لئے آرہا تھا۔

یکایک ایک مسافر چلاکر آگے بڑھا۔ "کیا یہ اس کی چھتری ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں"، قلی نے رک کر اور چھتری اس کی طرف بڑھا کر جواب دیا۔

"اوہو!" وہ چلایا اور پھر پلٹ کر ایک دراز قد آدمی سے جو قریب ہی کھڑا تھا گھبرا کر بولا "یہ تو یوسف کی چھتری ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ آپ بھی تو یوسف کو جانتے ہوں گے؟" دراز قد آدمی نے سر ہلایا اور اس مسافر نے پھر قلی کی طرف رخ کرکے کہا۔ میں اس چھتری کو شناخت کرتا ہوں جس شخص کی یہ چھتری ہے اس کا نام یوسف ہے۔ اگر تم اس کی ٹوپی میں دیکھو گے تو اس کا نام لکھا ہوا پاؤ گے۔ وہ اپنا نام اپنی ٹوپی میں ہمیشہ لکھ لیتا ہے"

"ابھی ٹوپی تو ملی نہیں" قلی نے کہا۔ "لیجئے اسٹیشن ماسٹر صاحب بھی آگئے" وہ اپنے افسر کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ قریب آگیا تو کہا "حضور انھوں نے اس چھتری کو شناخت کیا ہے"

"اچھا"، اسٹیشن ماسٹر نے کہا، "کیا آپ چھتری کو پہچانتے ہیں؟ تو بہتر ہوگا کہ کمرے میں جاکر آپ نعش کی بھی شناخت کرلیں"

مسافر خوف زدہ سا ہوکر ذرا ٹھٹکا۔

"اس کے بہت زیادہ ضرب تو نہیں آئی؟" اس نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"ضرب؟ یہ تو آپ خود خیال کرسکتے ہیں" جواب ملا "انجن اور چھ گاڑیاں اس کے اوپر سے گزر گئیں قبل اس کے کہ گاڑی روکی جاسکے۔ واقعہ یہ ہے کہ سر تن سے جدا ہوگیا ہے"

"چہ چہ چہ"، مسافر نے از راہِ تاسف سر ہلاکر کہا "میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ مصر نہ ہوں تو میں کمرے میں نہ جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب، کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ میرا شناخت کرنا ضروری ہے؟"

"ہاں یقیناً ضروری ہے" دراز قد آدمی نے جواب دیا "جتنی جلدی شناخت ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے"

"خیر تو پھر مجبوری ہے" مسافر نے کہا۔

بہت بیدلی سے وہ اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ کمرے میں گیا اور اسی وقت گھنٹے نے بمبئی کی گاڑی کی آمد کی اطلاع دی ابراہیم بھی پیچھے پیچھے پہونچا اور مسافروں کے ہجوم کے درمیان بند دروازے کے باہر کھڑا ہوگیا۔ چند ہی لمحون میں مسافر باہر نکلا اس کا چہرہ زرد تھا۔ خوف اور دہشت اسپر غالب تھی۔ وہ اپنے دوست کی طرف لپکا " وہی ہے! یوسف ہی ہے! بیچارہ یوسف! بیچارہ یوسف اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے یہان ملیگا اور میرے ساتھ بمبئی چلیگا "

" اس کے پاس کچھ سامانِ تجارت تو نہ تھا؟" دراز قد آدمی نے دریافت کیا۔ ابراہیم نے شور و غل میں بمشکل جواب کو سنا

" ہان اس کے پاس کچھ ہیرے تھے تو ضرور لیکن مجھے معلوم نہیں کہ کتنے اوسکے کلرک کو ضرور معلوم ہوگا۔ اور .... ڈاکٹر صاحب کیا آپ میرے حال پر عنایت کرکے اس معاملے کی نگہداشت اپنے سر لین گے؟ یہ یقین کرنے کے لئے کہ یہ درحقیقت حادثہ تھا — یا کچھ اور — مین اور یوسف مدتوں سے دوست تھے۔ آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ کے باشندے تھے۔ ہم دونوں احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں امید کرونگا کہ آپ اس معاملہ پر نظر رکھینگے "

" اچھا" دوسرے نے جواب دیا " میں اپنا اطمینان کرلونگا کہ واقعاتِ ظاہری کے پردے میں کچھ اور پوشیدہ نہیں ہے اور پھر اطلاع دونگا کیا یہ کافی ہوگا؟"

" وہ شکریہ جناب کی بڑی عنایت ہوگی۔ اچھا گاڑی آگئی۔ یہاں قیام کرنے اور اس معاملے کی تفتیش میں آپ کا کوئی ہرج تو نہ ہوگا؟"

" نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ ہمین اٹاوے کل دوپہر تک پہونچنا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں کل ضروریات کو معلوم کرکے وقت مقررہ تک وہان پہونچ سکتا ہون "

ابراہیم نے کچھ دیر تک بڑے غور سے اس دراز قد، مرعوب کن آدمی کی طرف دیکھا جو گویا اس کے مقابلے میں شطرنج کھیلنے کے لئے بیٹھ رہا تھا۔ ابراہیم کی جان داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ظاہرا تو وہ بڑا زبردست حریف معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھین اس کا سنجیدہ چہرہ اس کی متانت، بردباری، استقلال سب اس بات کی دلیل تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ابراہیم نے پھر ایک مرتبہ اپنے مقابل کی طرف دیکھا اور بڑی تشویش کے ساتھ یوسف کی ٹوپی کا خیال کرکے یہ امید کرنے لگا کہ اس سے کوئی اور فروگذاشت تو نہیں ہوئی ہے۔ (ترجمہ) (شہاب برنی) باقی ——— باقی

اکثر حضرات

پرچہ نہ پہونچنے کی جب اطلاع دیتے ہین۔ تو نمبر خریداری نہین لکھتے ایسی صورت مین ہمارے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہین ہے کہ ایسے خطوط کے جواب مین صرف سکوت اختیار کرین۔ (مینجر)

تحفۂ محبت

(فشا)

ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ بس یہی سرمایہ تھا ان میں سے ۶۰ سینٹ پینی کی شکل میں تھے۔ ایک ایک دو دو پینی بنئے بقال قصاب کے سودے میں حجت و اصرار کرکے بچائی گئی تھیں، جو بظاہر بخل و دناءت کی حد کو پہونچ گیا تھا ڈیلا نے تین مرتبہ گنا۔ ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ، اور کل کرسمس کا دن ہے۔

اب سوا اس کے کیا چارہ تھا کہ چھوٹے کوچ پر گر پڑے اور رونے لگے ڈیلا نے یہی کیا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی گریہ آہ۔ اور تبسم سے مرکب ہے جن میں آہ کو غلبہ و کثرت حاصل ہے۔

اٹھ ڈالر فی ہفتہ کرایہ کا مکان فقر کا نمونہ تو نہ تھا لیکن عیش و راحت کی شان بھی نمایاں نہ تھی دروازے پر لیٹر بکس لگا ہوا تھا لیکن خطوط سے ہمیشہ بے نیاز رہتا تھا۔ برقی بٹن بھی لگا ہوا تھا لیکن کوئی انسانی انگلی اس میں سے آواز پیدا نہ کرسکتی تھی ایک تختی بھی آویزاں تھی جس پر "مسٹر جیمس ڈلنگھم ینگ" کا نام لکھا ہوا تھا۔ سائن بورڈ کے نقوش کبھی روشن و نمایاں بھی رہ چکے تھے جب اس کے مالک کی آمدنی تیس ڈالر فی ہفتہ تھی۔ اب جبکہ یہ رقم بیس ڈالر رہ گئی تھی تو حروف اسم کی تابانی نے بھی سستی کی بے رونقی کا ساتھ دیا تھا۔

لیکن جب مسٹر جیمس ڈلنگھم ینگ دفتر سے گھر واپس آتا تھا تو مسز جیمس یعنی ڈیلا "جم" کہکر اس کا استقبال کرتی تھی اور جم بادۂ محبت سے سرشار ہوکر خمار افلاس کو بالکل بھول جاتا تھا۔

ڈیلا، رو ہوکر اٹھی آنسو پوچھے اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔ سوچنے لگی کہ کل کرسمس ہے اور صرف ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ موجود ہیں۔ اور جم کے لئے بڑے دن کا تحفہ خریدنا ہے، دیر تک غور کرتی رہی ان تھوڑے سے داموں میں کیا چیز آسکتی ہے جو چیز نفیس اور عمدہ ہو اور جم کے قابل۔ کھڑکیوں کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا۔ ڈیلا کو کچھ خیال آیا اور دفعتاً شیشہ کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ آنکھیں ایک خاص کیفیت کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ لیکن چہرے کا رنگ بیس سکنڈ ہی کے عرصہ میں فق ہوگیا۔ اس نے جلدی سے بال کھول کر چھوڑ دیئے اور شیشے میں دیکھنے لگی۔

ان میاں بیوی کی ملکیت میں دو چیزیں تھیں جن پر دونوں کو بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ ایک جم کی طلائی گھڑی جو باپ دادا سے ترکہ میں ملی تھی۔ دوسری ڈیلا کے بال۔ اگر ملکۂ سبا کا محل ڈیلا کے مکان کے مقابل ہوتا اور ڈیلا کھڑکی میں کھڑی ہوکر سکھانے کی غرض

سے اپنے بال لٹکا دیتی تو ملکہ کا کوئی مرصع زیور اُن کا مقابلہ نہ کر سکتا - اگر حضرت سلیمان اپنا تمام بیش قیمت خزانہ نکال کر بیٹھتے اور جم ادھر سے گزرتے وقت جیب سے اپنی گھڑی نکال کر دیکھتا تو ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھکر حضرت اپنی داڑھی کھجانے لگتے -

ڈیلا کے خوبصورت بال اس کے جسم کے گرد لٹکے ہوئے تھے گویا سنہرے پانی کا دریا موجین مار رہا ہے - بال ڈیلا کے زانو سے نیچے تک پہونچتے تھے اور اس کے لئے لباس کا کام دیتے تھے - اس نے جلدی سے کانپتے ہوئے ہاتھون سے بالون کو لپیٹ کر باندھ لیا - ایک منٹ کے لئے ٹھٹکی، خاموش کھڑی رہی اور ایک دو قطرۂ اشک میلی سُرخ دری پر ٹپک پڑے - لیکن یہ تامل صرف ایک لمحہ کا تھا - دوسرے لمحہ مین میلی جیکٹ اور پرانی ٹوپی پہن زینہ سے اتری اور سڑک پر آگئی - اور ایک طرف کو روانہ ہوگئی چلتے چلتے جس دکان پر ٹھہری اُس پر آویزان تھا -

میڈم سوفرونی
بالون کا بنا ہوا ہر قسم سامان

ڈیلا زینہ پر چڑھی اور ایک عورت کے سامنے جا کھڑی ہوئی - اور پوچھا -

"میرے بال خریدو گی" ؟

"مین یہی کاروبار کرتی ہون ہیٹ اُتارو کہ اک نظر دیکھ لون"

آن واحد مین چمکدار سنہرے بالون کا دریا لہرانے لگا -

میڈم نے ماہر و مشاق ہاتھون مین بالون کو لیکر کہا - "بیس ڈالر"

ڈیلا نے فوراً کہا "جلد عنایت کرو"

آئندہ دو گھنٹے ڈیلا نے جم کے لئے تحفہ تلاش کرنے مین صرف کئے - تمام اسٹور چھان مارے - ساری دکانین دیکھ ڈالین آخر تحفہ مل گیا - وہ تحفہ جو گویا جم ہی کے لئے بنا تھا - یعنی گھڑی کا چین پلیٹنم کا بنا ہوا - قیمتی - نفیس - نازک - جس کے بیش قیمت ہونے کے لئے قیمتی دھات کا نام ہی کافی تھا - یہ چین جم کی گھڑی کے لئے نہایت موزون تھا - ڈیلا دیکھتے ہی پھڑک گئی - یہ چیز جم کے قابل ہے - سادہ و گران بہا جیسا جم ہے ویسا ہی یہ چین بھی ہے - اکیس ڈالر چین کی قیمت طلب کی گئی - فوراً ادا کر دی اور ۸۷ سینٹ لیکر گھر چلی آئی - یہ چین گھڑی مین لگا ہوگا تو جم ہر جلسے مین بار بار وقت دیکھنے کیلئے بیچین ہوگا - گھڑی اسقدر بیش قیمت و شاندار تھی کہ چمڑے کے تسمہ سے جم کو ندامت ہوتی تھی -

ڈیلا گھر پہونچی روشنی کی - اور زلف پیچ سلاخ آہنی نکال کر اس نقصان کی تلافی مین مصروف ہوگئی جو فیاض محبت نے اس صورت مین پیدا کر دیا تھا - چالیس منٹ کی محنت سے اس سر پر چھوٹے چھوٹے گھونگر نظر آنے لگے اور وہ اسکول سے

بھاگا ہوا لڑکا معلوم ہونے لگی ۔ آئینہ مین اپنی شکل دیکھی اور دیر تک نقادانہ نگاہ سے دیکھتی رہی پھر دل ہین کہنے لگی " اگر جم دوسری نگاہ ڈالنے سے پہلے مجھے ہلاک نہ کردے تو کہے گا کہ مین جزیرہ کونی کی رقاصہ لڑکی معلوم ہوتی ہون ۔ لیکن مین کیا کرسکتی تھی ۔ ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ مین کیا ہوسکتا تھا ۔

جم ہمیشہ وقت پر گھر پہونچتا تھا ۔ ڈیلا نے چین مٹھی مین دبالیا اور دروازے کے قریب میز کے سامنے بیٹھ گئی ۔ زینہ پر جم کے پاؤن کی آہٹ سنی اور ایک لمحہ کے لئے اس کا رنگ سفید ہوگیا ۔ اسکی عادت تھی کہ ذرا ذراسی باتون کے لئے بھی دل ہی دل مین دعائین مانگا کرتی تھی ۔ اسوقت اس نے کہا " خدایا ۔ اس کے دل مین ڈال دے کہ مین اب بھی خوبصورت ہون "

دروازہ کھلا ۔ جم داخل ہوا ۔ اور کواڑ بند کردئے ۔ وہ خلاف معمول مضمحل اور خاموش تھا ۔ آہ ! صرف بائیس سال کی عمر اور متاہل زندگی کے افکار ! اس کو نئے اوورکوٹ کی ضرورت تھی ۔ اس کے پاس دستانے بھی نہ تھے ۔ جم نے اندر قدم رکھا اور اسکی آنکھین ڈیلا پر جم گئین ۔ آنکھون سے کچھ ایسا مضمون ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیلا مطلق نہ پڑھ سکی اور ڈرسی گئی ۔ جم کے چہرے پر نہ غصہ تھا نہ تعجب ۔ نہ ملامت نہ خوف ۔ کوئی ایسا جذبہ نہ تھا جسکے لئے ڈیلا پہلے سے تیار تھی ۔ صرف نگاہین ڈیلا پر جمی ہوئی تھین اور چہرے کا ایک خاص انداز تھا ۔

ڈیلا میز سے اٹھی اور اسکی طرف بڑھتے ہوے کہا " پیارے جم ! اس طرح نہ دیکھو ۔ مین مجبور تھی ۔ بال کٹوا دیے اور بیچ ڈالے کیونکہ ممکن تھا کہ کرسمس گزر جاے اور تمھین تحفہ نہ دون ۔ بال پھر بڑھ جائین گے ۔ ان کا خیال نہ کرو ۔ کیون پیارے ! خفا ہو ۔ میرے بال تو بہت جلدی بڑھتے ہین ۔ جم ! کرسمس کی مبارکباد دو اور خوش ہو ۔ تمھین خبر نہین مین تمھارے لئے کیسا نفیس تحفہ لائی ہون "

جم بڑی مشکل سے بولا " بال کٹوا دئے ؟ " معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اسقدر غور و تامل کے وہ ابھی اس حقیقت تک پہونچ سکا تھا ۔

" کٹوا دئے اور بیچ ڈالے ۔ کیا مین یون خوبصورت نہین معلوم ہوتی ؟ بغیر بالون کے بھی مین مین ہی ہون ۔ نہین ہون ؟ "

" تم کہتی ہو کہ بال نہین رہے ؟ " جم کا انداز ظاہر کررہا تھا کہ وہ ابتک کچھ نہین سمجھا ۔

" ڈیلا بولی ۔ " آپ بالون کو کیا ڈھونڈھتے ہو ۔ وہ تو بیچ دئے گئے ۔ مین کہتی ہون کہ بال رخصت ہوے ۔ آج کرسمس کی شام ہے ۔ پیارے خوشی مناؤ ۔ بال تمھارے ہی لئے گئے ہین ۔ ممکن ہے کہ میرے سر کے بال شمار کئے جاسکین ۔ لیکن میری محبت کا اندازہ نہین ہوسکتا ۔ جم کھانا پکاؤن ؟ "

جم کی وہ کیفیت یکایک دور ہوگئی ۔ اور اس نے جلدی سے ڈیلا کو سینے سے لگا لیا ۔ دس سکنڈ کے لئے ہم دوسری طرف نظر پھیر لیتے ہین ۔ آٹھ ڈالر فی ہفتہ ہون یا دس لاکھ سالانہ ۔ حساب محبت کی روسے ان مین کچھ فرق نہین ۔ ریاضی دان فرق بتائے گا ۔ لیکن اسکی رائے غلطی ہے اور غلط ۔

جم نے اوور کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا - اور میز پر ڈال کر بولا "ڈیل! میری نسبت کسی قسم کی غلط فہمی نہ کرو - بالوں کا کٹنا، منڈنا - چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا سب برابر ہے - میری محبت ایسی نہیں جو ان باتوں سے کم ہو جائے - لیکن تم اس پیکٹ کو کھولوگی تو معلوم ہوگا کہ مین پہلے کیون کھویا گیا تھا"

خوبصورت - سفید - تیز انگلیوں نے ڈورے اور کاغذ کو توڑ کر پھینک دیا - پیکٹ کا کھلنا تھا کہ ڈیلا کے منھ سے فرط مسرت سے ایک چیخ نکلی - اور اس کے بعد گریۂ نسائیت شروع ہو گیا - جسکی تسکین کے لئے شوہر کو انتہائی قوت محبت صرف کرنی پڑی - پیکٹ کے اندر کنگھے تھے - پہلو و پشت سر کیلئے کنگھوں کا سٹ - خوبصورت شیل کا بنا ہوا - کناروں پر مرصع کار ڈیلا کے حسین بالوں کے لئے کسقدر موزون تھا - ڈیلا کو مدت سے ان کی تمنا تھی - بارہا دکانوں پر دیکھکر اس کے دل مین شوق و آرزو کا دریا اُمڈا - لیکن تنگدستی نے مجبور رکھا - اب کنگھے میسر آئے تو بال نہ رہے - اس نے بے اختیار کنگھوں کو سینے سے چمٹا لیا اور دیر تک پیار کی نگاہوں سے دیکھتی رہی دیر کے بعد چشم پرنم اور تبسم پر قوم کے ساتھ نظر اٹھا کر "جم میرے بال بہت جلدی بڑھ جاتے ہین"

اتنے مین یکایک اچھل کر کھڑی ہوگئی اور بے اختیار زبان سے نکلا "او ہو!"

جم نے ابھی اپنا خوبصورت تحفہ نہیں دیکھا تھا ڈیلا کی مٹھی میں دبا ہوا تھا - ہاتھ کھول کر جم کو چین دکھایا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے نور دھات مین ڈیلا کے جوش و شوق سے روشنی پیدا ہوگئی - چین دکھا کر بولی -

"جم کیسا خوبصورت ہے - مین نے اس کی تلاش مین تمام شہر چھان مارا - اب تم دن مین سو سو بار وقت دیکھا کروگے لاؤ گھڑی دو - دیکھون اس مین کیسا معلوم ہوتا ہے"

گھڑی دینے کے بجائے جم کوچ پر گر پڑا - اور سر کے نیچے ہاتھ رکھکر مسکرا کر کہنے لگا -

"ڈیل! ہم کو اپنے اپنے تحفے کچھ عرصے کے لئے رکھ چھوڑنے چاہئیں - یہ اتنے نفیس اور اعلیٰ ہین کہ ابھی استعمال نہیں ہو سکتے مین نے تمھارے کنگھے خریدنے کے لئے گھڑی بیچ دی - اچھا اب کھانا پکاؤ"

(حامد حسین قادری)

لکھنؤ کی پھبتیان

تشبیہ کی ایک قسم کو پھبتی کہتے ہین، تشبیہ کُل ہے اور پھبتی جُز، تشبیہ تو وہ ہے جس مین کمتر چیز کو بہتر چیز کے ساتھ نسبت دیجائے ۔ اور پھبتی وہ جس پر بدتر شئے کے ساتھ نسبت دی جائے یعنی پھبتی مین مثال بدتر چیز سے دی جاتی ہے اور اس مین ایسا حسن کلام پیدا کیا جاتا ہے کہ سننے والا حقیقت حال سے آگاہ ہوجاتا ہے ۔

اس لحاظ سے پھبتی حقیقت مین علم بیان کا ایک جز ہے ۔ پھبتی ہمیشہ مجازی معنی مین صرف ہوتی ہے اور کبھی پھبتی استعارہ بن جاتی ہے جب مشبہ کو چھوڑ کر مشبہ بہ کو بیان کرتے ہین تو ایسی پھبتی کو استعارہ کہنا چاہیئے اور عمدہ پھبتی کی تعریف بھی یہی ہے کہ جس پر پھبتی کہین اس کا نام نہ لیا جائے ۔ اور سمجھنے والے بخوبی سمجھ لین ۔ کیونکہ اسمین بعض قرائن ایسے ہوتے ہین جن سے سننے والے کا ذہن اسطرف جلد منتقل ہوجاتا ہے ۔ شعرا کی اکثر پھبتیان بطور استعارہ ہوتی ہین ۔

نواب یوسف حسین خان یوسف لکھنوی شاگرد منشی مظفر علی اسیر "ذومعنی، ضلع جگت" کے استاد تھے اور پھبتی بمثل کہتے تھے ان کے دوست شبیر حسن خان رسا دراز قد، گورے، کرنجے، دُبلے پتلے آدمی تھے ۔ دور سے دیکھتے ہی اپنے احباب سے کہنے لگے ۔۔۔ "وہ دیکھنا **سیپ لگا بگلا** آرہا ہے" پھبتی کی لطافت اور نزاکت کو سمجھنا ہو تو مشبہ اور مشبہ بہ کی ایک ایک چیز کا مقابلہ کرو اول تو یہ بات سمجھ لو کہ یہ پھبتی مرکب ہے مشبہ کی کرنجی آنکھون، لاغری جسم اور درازی قد سے یہی باتین مشبہ بہ یعنی مستعار منہ میں بھی ہین کہ بگلا کرنجا ہوتا ہے دُبلا ہوتا ہے اور جسمین سیپ لگی ہوتی ہے وہ اور بھی دُبلا ہوتا ہے دراز قد ہوتا ہے لمبی لمبی ٹانگین رکھتا ہے ۔ یہ بڑی پھبتی مرکب ہے ۔ چند مخصوص باتون سے پھبتی کے مدارج بہت ہین ۔ شعرا اور خواص کی پھبتی، عام اور عوام کی پھبتی سب الگ الگ ہین ۔

مرزا رفیع سودا پھبتی کہنے مین مشاق تھے ان کی ہجوین مشہور ہین اور ان مین اکثر کہ یہ پھبتیان نظم کی ہین لیکن غزل مین بعض پھبتیان لطیف لکھی ہین مثلاً : ۔

آنکھون کے گرد میرے مژگان کی ہے یہ صورت ۔ جیسے کنار دریا خس بہ کے آرہا ہے ۔

مژگان پہ خس کی پھبتی کہی ۔

میر وزیر علی صبا "پھبتی مین، کمال رکھتے تھے مگر نہایت تہذیب کا پہلو لئے ہوئے" فرماتے ہین ۔

ہے کی جو اس گل نے ہمارے پانچ دیوان کی نہ سیر مصرع تر اپنا ہر اک خشک ڈالی ہوگیا

مصرع تر پر خشک ڈالی کی پھبتی کہی ۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گولا گنج، دکوا اور ایک شاخ چاندنی چوک دہلی مین ہے

میر علی اوسط رشک تلمیذ ناسخ

مانگ کر تلوار اپنے چہرہ بخت زار پر | پھبتی کہتے ہین سیہ اطلس پہ اُتّو ہو گیا

شیخ محمد جان شاد کسی کی ہجو مین کہتے ہین :۔

کیا محتسب شہر کے نائب کا لکھون حال | نخاس کا دلاّل ہے کشمیر کا رمّال
کپھو کا بساطی ہے مکپنور کا ابدال | یا قوم مکیری سے مسلمان ہے یہ بقال

تشبیہ نئی کیا ہو طبیعت نہین لگتی
بجنور کا عطار ہے قنوج کا گندھی

پنجاب کا سائیس ہے یا ہے یہ شتربان | موچی کی پشاور مین ہے کمبخت کی دکان
گمراہی مردم کے لئے غول بیابان | ابلیس کی صورت ازلی دشمن انسان

یہ بوم نہ بندر ہے نہ کھوسٹ ہے نہ خر ہے
سب شکل ہے لنگور کی اک دم کی کسر ہے
مونچھون کو دم سگ سا جڑ ہائی ہے دو ٹیڑھی
کنکوے کی جھلجھل کی طرح لٹکی ہے ڈاڑھی

اس سے معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ شعرا جب کسیکی ہجو کہتے ہین تو عوام کی پھبتیون سے بھی کام لیتے ہین ۔ اور جب کسی اور صنف سخن مین موزون کرتے ہین تو خواص کی پھبتیان استعمال کرتے ہین ۔

جان صاحب ؎ اور کیا پھبتی کہون بن آئے ہے لنگور سے | ڈاڑھی منڈ واؤ مین باز آئی خدا کے نور سے

جرات ع۔ اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی ۔

شیخ ناسخ سیاہ فام گران ڈیل کثرتی تھے ہر روز بارہ سو چھیاسی ڈنڑ پیلتے تھے خوراک تین سیر تھی ۔ نواب مرزا تقی علی خان ترقی سالار جنگی آتش کی شاعری کے معتقد تھے خود بہادر تھے اور بہادرون کے قدردان تھے آتش بھی بانکے تھے اونچی بنے رہتے تھے ۔ غازی الدین حیدر بادشاہ نے مشاعرہ کیا اور لکھنؤ کے تمام شعراء مدعو ہوے ناسخ بھی آئے آتش بھی آئے ۔ جسوقت نواب ترقی نے ناسخ کو دیکھا کہنے لگے، دیکھنا یہ **دم کٹا بھینسا** کہان سے آگیا' لوگون کو یہ پھبتی ایسی پسند آئی کہ اُس دن سے ناسخ کو دم کٹا بھینسا کہنے لگے ۔

نواب فدا پھبتی کہنے مین بہت مشہور تھے نواب شیش محل کے ایک مصاحب خاص ضعیف العمر گول چہرہ سانولے چیچک رو تھے

منھ مین کوئی دانت نہ تھا اس لئے ہونٹ اندر کو دھنسے ہوئے تھے آپ نے ان پر چونچ ٹوٹے اُلّو کی پھبتی کہی اور ایسی کہی کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹی۔

حسن باندی طوائف سیاہ فام بدشکل فربہ اندام گاؤ دیدہ مگر حسن اخلاق مین مشہور تھی پڑھی لکھی تھی موسیقی مین بھی کمال رکھتی تھی اور فیاض بھی تھی اس کی تعریف مین جان صاحب نے قصیدہ کہا تھا اس نے اپنی عالی ہمتی سے جان صاحب کو سو روپیہ قصیدہ کا صلہ دیا تھا ایک دفعہ کسی محفل مین صبح کے وقت مجرا کر رہی تھی مسی کی دھڑی تو گہری گہری ہونٹون پر جمی تھی مگر پان کا لکھوٹا نہ تھا اس لئے مسی کی سیاہی کالی رنگت کے ساتھ ملکر بدنمائی پیدا کر رہی تھی یہ جلسہ نواب ممتاز الدولہ بہادر کے دولتکدے پر تھا سید حسن لطافت بھی شریک جلسہ تھے نواب کو مخاطب کر کے کہنے لگے حضور ملاحظہ فرمائیے آج تو بطخ کیچڑ کھا کر آئی ہے اور انکھیون سے طوائف کی طرف اشارہ کیا نواب اس پھبتی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

یہ تو شعرا اور خاص لوگون کی پھبتیان تھین اب عام کی پھبتیان بھی سُنیے۔

بےکس کا لگا - لمبے آدمی کو کہتے ہین۔

لاسا لگی چھڑ - دُبلے پتلے نحیف الجثہ کمزور دراز قد آدمی کو کہتے ہین۔

مولا بخش طبلہ سازکے یہان ایک کوتہ قامت دبلا پتلا اضلیہ آتا تھا اسے سب لوگ سڑک کوٹنے کا **دُرمٹ** کہتے تھے آخر یہی اس کا نام پڑ گیا۔

ایک صاحب کی گردن موٹی اور چھوٹی تھی اور دہانہ کسی قدر کھلا رہتا تھا چہرہ پر چیچک کے داغ تھے ان پر **شیر دہان** سے **منڈے** کی پھبتی موزون کی۔

ایک صاحب گران ڈیل پستہ قامت جتنے چوڑے اتنے ہی لمبے تھے۔ ان کو **مولوی کچھوا** کہدیا۔

ایک شخص گدہی کے بال منڈواتے تھے ان سے کہا حضرت آپ نے **شیطان کی کھڈی** کیون بنوائی۔

ایک طوائف نہایت لاغر تھی مگر قد مائل بہ بلندی تھا اس پر ایک صاحب نے پھبتی کہی **سکتے کی چھوڑی ہڈی**۔

ایک مجتہد صاحب تھے جن کے یہان تمام شہر کے مسلمان مردے کے چالیسوین کا اسباب بھیجتے تھے اور نماز روزہ کا نقد روپیہ دیتے تھے لوگون نے ان کا نام رکھا **جنت کے پٹواری**۔

ایک اور مجتہد صاحب جو ہمیشہ باریک تنزیب کا کرتہ اور سفید باریک دوپٹہ سفید صافہ سفید عبا زرد خملی کفش استعمال فرماتے اور خود بھی گورے چٹے تھے۔ ایک خوش اعتقاد نے ان کا نام **نہر فرات کا بگلا** رکھدیا۔

چوک مین ایک طوائف تھی جو خود بہت گوری تھی اور سفید لباس سے آراستہ رہتی تھی، ایک دن کوٹھے پر محو خرام تھی کہ ایک صاحب نے

کہا کہ دیکھو سفید چیل منڈلا رہی ہے۔

ایک نواب صاحب تھے جو ہمیشہ اپنی عسرت کا رونا رویا کرتے تھے ان کا نام رکھا **نواب فاقہ**

ایک حکیم صاحب دراز قد لاغر اندام قومی کامون مین بہت دلچسپی رکھتے تھے ان پر پھبتی کسی **قوم کے شتر بے مہار**۔

واضح رہے کہ تشبیہ اور پھبتی مین یہ فرق ہوتا ہے کہ تشبیہ مین حرف تشبیہ بھی لاتے ہین جیسے وہ آدمی حسن مین چاند کے ٹکڑے کے مانند ہے لیکن پھبتی مین نہ حرف تشبیہ آتا ہے نہ وجہ تشبیہ بیان کی جاتی ہے نہ مشبہ آتا ہے یعنی کسی آدمی کا نام بھی نہیں لیتے اس سے معلوم ہوا کہ پھبتی وہی اچھی ہے جو استعارہ بن جائے تشبیہ نہ رہے جیسے سست رفتار آدمی کو کہین او وا اُن **کا توتا**۔

یہ بھی واضح رہے کہ پھبتی باعتبار اخلاق و اطوار، تعلقات پیشہ وغیرہ کے بھی کہی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ پھبتیاں باعتبار صورت وضع قطع لباس کے موزون کی جاتی ہین ایک ٹین ساز تھے جو آخر زمانہ مین جب ضعیفی نے پاؤن پھیلائے اور کام کرنے مین معذور ہو گئے تو سبز پگڑی باندھکر شاہ صاحب بن گئے۔

اول تو نحیف الجثہ گورے آدمی دوسرے پان اسقدر کھاتے تھے کہ دہانہ باچھون تک لال رہتا تھا اسپر سبز پگڑی ایک صاحب نے **توتا شاہ** کی پھبتی کہی آخر توتا شاہ ان کا نام ہو گیا اور شاہ صاحب تمام لباس سبز پہننے لگے۔

عام کی پھبتیاں تو آپ سن چکے اب عوام کی پھبتیاں بھی گوش زد فرمائیے۔

ایک مصائب خوان تھے نہایت گورے بے انتہا کریہہ کسیقدر چیچک رو ان کا نام **دودھیا بھٹا** رکھا گیا۔

ایک نواب صاحب نہایت سیاہ فام تھے ان کو سب **نواب کوا** کہتے تھے۔

ایک صاحب بونے اور فربہ تھے انھین **چراغ رکھنے کا ڈیوٹ** کہتے تھے۔

ایک طویل القامت پر پھبتی کسی **کمسریٹ کا اونٹ** ایک صاحب گھبرائے ہوے جارہے تھے دوسرے صاحب پوچھتے ہین خیر تو ہے **آج کٹے ہوے کنکوے کی طرح** کہان جاتے ہو۔

لمبی گردن کے ایک بیرسٹر صاحب ولایت سے پاس ہو کر آئے اور گردن ہلا ہلا کر شانے پھڑکا پھڑکا کر تقریر کرنے لگے۔ ان کو **حاجی لق لق** کا خطاب دیا گیا۔

ایک طوائف تھی گران ڈیل مگر زیادہ عمر کی پیٹ کی کھال لٹک آئی تھی جسم کے بوجھ سے چلنا پھرنا دشوار تھا لوگون مین **چھکڑا بائی** کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ایک ماما نوکری سے برطرف ہو گئی تو محلے بھر مین پھر کر تیرا میرا کام کر کے بچون کو پالتی تھی سگھڑی اس گھر مین گھڑی اُس گھر مین لوگ اسے **جلے پاؤن کی بلی** کہتے تھے۔

ایک معمر عورت شاہانہ جوڑا پہنے جا رہی تھی کسی نے پھبتی کہی۔ **بڈھی گھوڑی لال لگام**
پرانی پتیلی پر قلعی یہ پھبتی اسی عورت پر کہتے ہیں جو ضعیفی میں بناؤ سنگار کرتی ہے۔

کاہل آدمی کو کہتے ہیں یہ تو بکی بیری تلے مرنے والے ہیں۔

میاں لائے پتیلی بی بی نے پھبتی کہی یہ **دیوالی کی کلھیا** مجھے پسند نہیں پتیلی اتنی تو ہو کہ آدھ سیر خشکہ پک جائے
چھوٹی پتیلی کو **دیوالی کی کلھیا** کہا۔

ایک صاحب انگرکھا اُجلا پائجامہ میلا پہنے ہوئے جا رہے تھے ان کے دوست نے کہا آہا آج تو تم **دھوبی کے چھیلا**
بنے ہوئے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دھوبی اجلے میلے جیسے کپڑے ججمان کے ہوتے ہیں پہن لیتے ہیں۔ اس لئے میلے اُجلے پر
دھوبی کے چھیلا کی پھبتی کہی۔

جو آدمی مارا مارا پھرتا ہے اُسے دھوبی کا کتا کہتے ہیں جسکا ایک جگہ قیام نہیں رہتا۔ کبھی گھاٹ پر کبھی گھر میں۔
میر نفیس نے اپنے مرثیے میں پھبتی کا استعمال کیا ہے۔

گر نیزہ دیو بھی جس سے کرے وہ فتنہ شوم　　　سیہ کلائی تھی یا فیل مست کی خرطوم

اس میں کلائی کو فیل مست کی خرطوم کی پھبتی کہی۔

نسیم　　زنبور سیاہ خال اس کے　　　برگد کی جٹائیں بال اُس کے

خال پر زنبور سیاہ اور بال پر برگد کی جٹاؤں کی پھبتی کہی۔

خیر　　شکل مت پوچھو کھانے کا ہے بلی　　　منھ ہے چیٹوں سے جیسے روٹی جلی

چیٹے دار منھ پر جلی ہوئی روٹی کی پھبتی کہی۔ اس میں مشبہ بہ مرکب ہے۔

صندمنی دیگ ہے شکم اس کا　　　نفس اژدہا ہے دم اُس کا

شکم کو صدمنی دیگ کہا اور دم کو نفس اژدہا کہا۔

گال کلیجے سے پھر تو اسے سیاہ　　　کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

گال کو کلیجے سے اور کاسۂ سر کو اوندھے کڑاہ سے تشبیہ دی۔

توند کالی جو کھول جائے لیٹ　　　آہنی ہے تنور اس کا پیٹ

پیٹ کو لوہے کا تنور کہا۔

کہ وہ زلف اور لڑیاں موتیوں کی　　　سیہ ناگن ہے یا انڈوں پہ بیٹھی

زلف اور موتی کو سیہ ناگن اور انڈوں سے تشبیہ دی۔

صبح جون ناگن گلون پر چاٹنے اوس آتی ہے　　زلف یون روے عرق آلودہ پر لہراتی ہے

زلف کو روے عرق پر لہرانے سے ناگن کو پھولوں کی اوس چاٹنے سے تشبیہ دی۔ اس مین مشبہ مشبہ بہ دون مرکب ہین۔

ایک خوبصورت عورت کو کالے بدشکل نواب نے ملازم رکھا مرزا مچھو بیگ نے پھبتی کہی

پہلو رہین لنگور خدا کی قدرت　　زاغ کی چونچ مین انگور خدا کی قدرت

ایک حسین خوبصورت نوجوان رئیس نے ایک موٹی بھدی کالی چڑیل کو اپنا نوکر رکھا شاعر نے پھبتی کہی۔

ع۔ نانک شتے کی توپ پہ گوروں کا پہرہ ہے۔

فارسی اور عربی کے علم بیان مین تشبیہ اور پھبتی مین کوئی فرق نہین ہے نہ پھبتی کے لئے کوئی دوسرا نام ہے۔ وہ لوگ پھبتی کو بھی تشبیہ کہتے ہین جیسے صفت موصوف مین اچھی بات کو بھی صفت کہتے ہین اور برائی کو بھی صفت کہتے ہین۔ اور اس کی پیروی اُردو کے اہل زبان بھی کرتے ہین لیکن تشبیہ مین جو امتیاز اُردو نے قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ اچھی تشبیہ کو تشبیہ اور بری تشبیہ کو پھبتی کہتے ہین، اور اس کو استعارے کی حد تک پہونچا دیا ہے یعنی نہ حروف تشبیہ کا بیان کرتے ہین، نہ مشبہ کا ذکر کرتے ہین صرف مشبہ بہ کے ذکر سے استعارہ بنالیتے ہین یعنی مشبہ بہ کو عین مشبہ بنا کر استعمال کرتے ہین۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے لوگ پھبتی کو استعارہ بنا کر استعمال کرتے ہین مثلاً:۔

کشمیری محلے مین ایک حکیم صاحب تھے نہایت نحیف الجثہ لاغر نازک اندام دو قدم چلنے مین سیکڑون بل کھاتے تھے بات آہستہ آہستہ کرتے تھے نواب شیش محل کی سرکار سے ان کا تعلق تھا، لوگون نے ان کا نام حکیم مرمرا رکھ دیا اور یہ نام کچھ ایسا پھلا پھولا کہ بہت کم ایسے لوگ ہین جنکو حکیم صاحب کا اصلی نام معلوم ہو۔ جسقدر ہتنے بیان کیا اس مین اکثر ایسی پھبتیاں ہین جو استعارہ بن گئی ہین۔ لیکن ایسی پھبتیاں بھی ہین جو تشبیہ کی حد مین داخل ہین۔ جیسے مٹکا سا پیٹ۔ چھکڑا سا ڈیل ڈول۔ گردہ سے ہونٹ۔ پھاوڑا سے ہاتھ پاؤن۔ سن سی ڈاڑھی۔ اپلا سے گال۔ چیان سی آنکھین

ایک صاحب منھ چور تھے احباب کی صحبت مین بیٹھنا جلسون مین شریک ہونا گھر سے سیر تماشے کو نکلنا۔ ان کے لئے دشوار تھا۔ ان پر پھبتی کہی کڑک مرغی۔

جس آدمی کے متعلقین زیادہ ہون اور ان سب کا خرچ اسی ایک شخص کے ذمہ ہو اسے چونٹیون بھرا کباب کہتے ہین۔

یہ ایسی عام پھبتی ہے کہ آجکل محاورہ بن گئی ہے۔

بعض پھبتیاں ایسی ہین کہ ان کو حد استعارہ مین نہین لا سکتے۔ جیسے

وہ ہنستا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پرانی جوتی کے ٹانکے ٹوٹ رہے ہین ۔

لڑکا تو بالکل ٹیڑی ہو رہا ہے ۔ لڑکی بالکل دہان پان ہے ۔ طبیعت تولہ ماشہ ہو رہی ہے ۔

جس طرح اہل عجم پھبتی کو بھی تشبیہ کہتے ہین اور کوئی دوسرا نام انکی اصطلاح مین اسکا نہین ہے ۔ اور اسی تشبیہی تعلق سے جب ادات تشبیہ دور ہو جاتے ہین اور مشبہ کو ترک کرکے مشبہ بہ کا ذکر کرتے ہین تو وہ استعارہ بن جاتا ہے ۔ اسی طرح متقدمین اردو تشبیہ کو پھبتی کہدیتے تھے ۔ چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ نے ایک مطلع مین کہا ہے ۔

اس پری رخسار پہ پھبتی کہی ہے حور کی ۔ سچ تو یہ ہے سوجھتی ہے کیا ہی مجھکو دور کی

اس مین پری رخسار مشبہ ہے ۔ حور مشبہ بہ ہے ۔ وجہ شبہ دونون کی خوبصورتی ہے ۔ لیکن اصطلاح فصحاے اردو مین اسے پھبتی نہ کہین گے بلکہ تشبیہ کہین گے اس لئے کہ اصول مقررہ سے پھبتی وہی ہے جس مین کوئی معیوب مثال دی گئی ہو ۔

جیسے ایک حکیم صاحب تھے جو نہایت لاغر طویل القامت نحیف الجثہ ، ان کو چیونٹے سے تشبیہ دی پھر ایسا ہوا کہ لوگون نے ان کا نام لینا موقوف کردیا اور سب حکیم چیونٹا کہنے لگے ۔

پھبتی کی نزاکت سب سے زیادہ یہ ہے کہ وہ کنایہ بن جاے ایسی پھبتیان شاذ ہوتی ہین ۔ کنایہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز یا کسی آدمی کی صفت بیان کرین جو موصوف کی عادت یا شکل وصورت سے تعلق رکھتی ہو اور اس سے مراد موصوف کی ذات ہو جیسے سست کاہل آدمی کی نسبت ایک پھبتی کہتے ہین ۔ پکی بیری تلے کا مرنے والا اور مراد اس صفت سے کاہل آدمی لیتے ہین ۔ جو چاہتا ہے کہ مجھے بغیر ہاتھ پاؤن ہلاے کھانے کو مل جائے اسی واسطے پکی بیری کے تلے لیٹتا ہے تاکہ جو بیر گرے وہ آپ سے آپ منھ مین چلا جائے ۔ کبھی خیالی پھبتی بھی کہتے ہین ۔ امانت

صندل اسکی ہے مانگ مین کیا خوب ۔ راہ ظلمات مین یہ دلدل ہے ۔

ناسخ کی طرح اور شعرانے بھی تشبیہ کو پھبتی کہدیا ہے

سر کے تعویذون پہ تیرے ہین کہون پھبتی نئی ۔ خوشۂ پروین ہے یہ اے مہربان بالاے سر

سر کے تعویذ کو خوشۂ پروین سے تشبیہ دی ہے اسے تشبیہ کہنا چاہئے کیونکہ تعویذ کی مدح ہے مذمت نہین ہے ۔

ایک خدمت گار سیاہ فام پستہ قامت گول جسم مائل بہ فربہی ایک ایسے عارضہ مین مبتلا ہوا جس سے اس کے پاؤن سوگئے بیٹھے بیٹھے چلتا تھا ۔ ایک صاحب نے اسپر پھبتی کہی جلی ہوئی مڈھی یہ پھبتی ایسی مبارک ہوئی کہ اس غریب کا نام جلی ہوئی مڈھی ہو گیا

ایک وکیل صاحب دراز قد ، فربہ اندام ضعیف العمر تھے ۔ بیچارے دو قدم چلتے تھے اور سو دفعہ ہانپتے تھے ان پر ٹوٹے ہوے چھکڑے کی پھبتی موزون کی گئی ۔

ایک نواب صاحب پستہ قامت گران ڈیل تھے ان پر حیدر جان کا پاٹھا کی پھبتی کہی -

پاٹھا اصطلاح مین ہاتھی کو کہتے ہین اور حیدر جان چونے والی ایک مشہور طوائف تھی جسکے یہان ایک ہاتھی پلا تھا -

ایک مشاعرے مین ایک لیڈر صاحب بھی لالٹین کے سامنے بیٹھے ہوے تھے - لالے کی روشنی آپ کے چہرے پر پڑتی تھی - آپ گندمی رنگ فربہ جسم طباقی چہرہ چیچک رو دراز ریش کر بجے تھے - ایک شاعر بولے آج کے مشاعرے مین شاہانہ اہتمام ہے لالے کے سامنے سورج مکھی بھی ہے -

رجب کی نوچندی ہے تال کٹورے کی کربلا مین ماتم داران حسین جمع ہین بیرونی عمارت کی چھت پر لوگ کھڑے ہوے آنے والوں کی سیر دیکھ رہے ہین اتنے مین پھاٹک سے ایک برقع پوش طویل القامت گران ڈیل عورت آتی ہوئی دکھائی دی' جسکے برقع مین ہوا بھری ہوئی تھی اس ہیئت کو دیکھکر ایک صاحب نے پھبتی کہی - ارے بھائی دیکھنا تو یہ حسین آباد کے غلاف پوش جھاڑ کون لے آیا - حسین آباد کے غلاف پوش جھاڑ کی پھبتی اسکے قدو قامت پر ایسی موزون ہوئی کہ سب لوگ بے اختیار ہنس دیے -

ایک صاحب بدگلو کریہ الصورت تھے - اُنپر پھٹے ہوے ڈھول کی پھبتی کہی -

خواجہ عبد الرؤف عشرت

کام کی باتین

معزز ناظرین ! یون تو اس وقت ملک کے عرض وطول مین صدہا بک ایجنسیان یا بک ڈپو قائم ہین اور اگرچہ ان مین سے اکثر کا یہ ادعا بھی ہے کہ وہ کتابین ارزان نرخ پر فروخت کرتے ہین - لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قیمت اور رعایت کے ساتھ ہمارا یہ چھوٹا سا بک ڈپو ہر قسم اور ہر علم و فن کی کتابین "خواہ وہ کسی زبان کی ہون" آپ کو دے گا - دوسرون سے اگر ناممکن نہین تو محال ضرور ہے - اور یہی سبب ہے جو نسبتاً آنہ دو آنے فی روپیہ کی رعایت ایک معمولی سی بات ہے - مفصل حالات و اسباب رعایت اور نادرۂ روزگار کتب کی فہرست کے لئے آدھ آنہ کا ٹکٹ ارسال فرمایئے فقط والسلام -

المعلن - آپ کا مخلص (ایچ - ایم) عزیز الدین احمد قریشی جنرل منیجر و پروپرائٹر "مفید علم بکڈپو لکھنؤ"

قصے کا خط کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر خط لکھنؤ سے منگائیے -

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(مسلسل)

ناکامی کی معذرت

۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء کی میری سیاحتِ ہند گزشتہ اوراق میں بیان ہو چکی ہے اور جن اصحاب نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ میں نے کیونکر ایک بہت بڑے موقع کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا جو میرے پیش نظر تھا، اور جوش میں میں نے اپنے لئے مقرر کر رکھا تھا اسکی تکمیل کرنے کے لئے دوسرے سال کیوں نہیں آیا۔ میں خود بھی اپنے دل سے یہی سوال کرتا ہوں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں میں جو رسوخ مجھے حاصل ہو گیا تھا اس کا خیال جب کبھی آجاتا ہے تو میرے دل میں رنج و غم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں کہ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ کیوں نہیں اُٹھایا۔ اگر میں استقلال کے ساتھ اس راستہ پر گامزن رہتا جس پر میں جا رہا تھا اور اگر میں نتیجہ نکلنے تک مستقل مزاجی سے جما رہتا تو مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستانی باشندوں کے لئے دائمی بھلائی کا کوئی کام کر سکتا تھا اور ممکن ہے کہ اگر سیاسی اصلاح نہیں تو کم سے کم حقیقی معاشرتی اور ذہنی اصلاح کے لئے مسلمانوں کو ابھار سکتا تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ میں ساری زندگی وقف کر دیتا، اور دیگر امور اور خانگی معاملات کو بالائے طاق رکھ دیتا۔ اس کام پر آمادہ کرنے کے لئے ہمدردی سے بڑھکر ایک شے کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے کہ مجھ میں اُس جوش و اعتقاد کی کمی تھی جسکے بغیر کسی کام کی جانب کامل توجہ نہیں مبذول کی جا سکتی۔

بہر حال بمبئی سے رخصت ہوتے وقت میرا خیال یہ تھا کہ میں آئندہ موسم سرما میں لوٹ آؤں گا اور مجوزہ اسلامی یونیورسٹی فنڈ کے لئے ضروری روپیہ کی فراہمی کی غرض سے دورہ کروں گا۔ مجھے تین لاکھ کے وعدے مل چکے تھے جس کا بیشتر حصہ میرے دوست راجہ امیر حسن لکھنوی عنایت کرنے والے تھے۔ نظام کی سرپرستی اور لارڈ رپن کی رضامندی سے کم از کم میری تجاویز کی تکمیل حیطۂ امکان میں ضرور آگئی تھی اور اگر اسمیں رکاوٹ پیدا ہوئی تو سارا الزام مجھ پر عائد نہیں ہو سکتا۔ سال بھر میں بدقسمتی سے بہت سے واقعات ایسے پیش آگئے کہ اسکیم ناکام رہ گئی۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگرچہ لارڈ رپن حیدر آباد میں ایسے موافق حالات پیدا کر چکے تھے جن کے باعث اصلاح کا کام آسان ہو گیا تھا تاہم وہ کلکتہ کے دفتر خارجہ کو اپنی مرضی کے ماتحت لانے سے قاصر رہے۔ اگرچہ ٹریویلین حیدر آباد سے واپس ہی چلا گیا لیکن بحیثیت مجموعی ریزیڈنسی کا عملہ جوں کا توں رہا۔ کارڈری کو رہنے کی اجازت مل گئی اور پرانی سازشیں بجزہ موقع کے ساتھ شروع ہو گئیں۔ [illegible] رزیڈنٹ نے مفید صلاح و مشورہ نہیں دیا اور ان کی توجہ [illegible] اور کم تجربہ کی بنا پر جو غلطیاں ان سے سرزد

ہوئین۔اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے مین ان کے دشمنون نے کوئی کسر باقی نہین رکھی۔جو اعتماد ابتدا سے نظام کو ان کی ذات پر تھا اسے تباہ کر دیا گیا اور دونون کے بہترین ارادون کے راستہ مین رکاوٹین پیدا کر دی گئین جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھون نے اپنے اپنے فرائض سے غفلت برتنی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی جو ان کی قوتون کے لئے بالآخر تباہ کن ثابت ہوئی اس طرح سے مین ان اطلاعات کی مدد سے جو مجھے وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہین اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ نظام کی سرپرستی پر اعتماد نہین کیا جا سکتا۔

دوسری مصیبت یہ تھی کہ لارڈ رپن نے اپنی مدت میعاد ختم ہونے سے پیشتر ہی استعفا دیدیا۔یہ دیکھکر کہ ہندوستان مین آزاد انسٹیٹیوشنون کی بنا ڈالتے مین ہر طرف سے روڑے اٹکائے جاتے ہین اور انگلستان کی گورنمنٹ کی جانب سے بھی حقیقی تائید و حمایت مفقود ہے، انھون نے اپنے قیام کو بڑھانا بے سود سمجھا اور ہندوستانی باشندون کو آہ و بکا کی حالت مین چھوڑ کر شکست خوردہ شخص کی طرح (اور مین یہ نہین کہونگا کہ مایوس آدمی کیطرح) انگلستان روانہ ہوگئے۔

ان کے جانشین لارڈ ڈفرن (کے زمانۂ حکومت) مین صورتِ حالات اپنی قدیم روش پر آگئی اور سیاسی اصلاحات کی ساری امیدین منقطع ہوگئین۔جہان تک سرکاری ملازمتون کا تعلق ہے، جدید وائسرائے نے مسلمانون کے ساتھ خصوصیت برتی لیکن انھین سخت کارروائی کرنے سے منع کیا گیا۔جب سرکاری رجحان نے جذبات ٹھنڈے کر دئے تو ایسی آزاد یونیورسٹی کا خیال جسکے اپنے ذرائع آمدنی ہون اور جو سرکاری اثرات سے بالکل پاک ہو، قدرتاً کم ہوتا گیا اور بالآخر ان بزدل اشخاص نے جنھین مین نے دلیری اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی، اس سے قطعی دست برداری کرلی۔ہندوستان مین یہ بات شاذ و نادر ہی دیکھنے مین آتی ہے کہ جس کام کی سرپرستی گورنمنٹ نہین کرتی، اس مین استقلال یا دوام کی صورت پائی جائے یہ اسکیم اس وقت بالکل مردہ ہوگئی جبکہ راجہ امیر حسن جنھون نے لکھنؤ مین اپنے شیعہ ہم مذہبون کے لئے کالج کھولنے کے خیال مین استقلال کا اظہار کیا تھا، بیمار ہوگئے جسکا نتیجہ بالآخر جنون کی شکل مین نکلا۔اگر مین ہندوستان مین واپس بھی آجاتا تو مجھے شک ہے کہ مین ان مصائب کو روک سکنے مین کامیاب ہو سکتا۔انھین باتون کا نتیجہ تھا کہ مین ہندوستانی اسکیم کی جانب سے ناامید ہوگیا اور مین نے اپنی قوتین اس کام پر لگائین جسے مین موقع و وقت کے اعتبار سے عملی سمجھتا تھا۔

۱۸۸۴ء کے موسم خزان مین مین نے قسطنطنیہ کا جو دورہ کیا۔اس مین میرا ابتدائی جوش بہت کچھ سرد پڑ گیا میرا خیال تھا کہ اگر یونیورسٹی کو سلطان المعظم کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو پھر اس مین جان پڑ سکتی ہے عبد الحمید کے کیرکٹر سے واقف ہونے کے باوجود میری یہ رائے تھی کہ اگر مجھے ان سے بات چیت کرنے کا موقع مل گیا تو مین انھین اس امر پر مائل کر سکونگا کہ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے جو رسوخ انھین اسلامی ممالک مین حاصل ہے اسے کام مین لائین۔لیکن میری یہ سیاحت ناکامیاب رہی مین نے یہ دیکھا کہ سلطان المعظم سے ملاقات نہین کیجا سکتی اور اگر ہو بھی سکتی ہے تو ان ذرائع سے جنھین مین استعمال کرنا نہین چاہتا تھا۔مزید برآن اس مین بہت کچھ وقت اور روپیہ ضائع کرنا پڑتا تھا قسطنطنیہ مین رشوت ستانی کا خوب دور دورہ تھا اور سردار اسلام کے ساتھ در باریون کی سازش کے بغیر ملاقات ناممکن تھی جب مین ان واقعات کا

نتیجہ شائع کرون گا تو اسوقت معلوم ہو جائیگا کہ محل کی آب و ہوا سنجیدہ خیالات کے کسقدر مخالف تھی۔ اور مین اس یقین کو لیکر قسطنطنیہ سے رخصت ہو گیا کہ ان حالات کا مقابلہ کرنا یا ناممکن کام کرنے کی کوشش کرنا بالکل بے سود ہے۔ دوسرے معاملات نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا مثلاً مصری حالت یا خرطوم مین گارڈن کی مصیبت، ۱۸۸۵ء کے عام انتخاب نے اور اسوقت مین نے پارلیمنٹ مین داخل ہونے کا ارادہ کر لیا اس طریقہ سے اگرچہ مین ہندوستان کے معاملات سے دلچسپی لیتا رہا لیکن اس مین نمایان حصہ نہین لے سکا۔

لیکن ساتھ ہی میرا خیال ہے کہ مین ہندوستانی مسلمانون کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرتا رہا۔ ۱۸۸۳ء کے موسم بہار مین انگلستان واپس آنے پر مین لارڈ رینڈولف چرچل سے ملا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پارلیمنٹ مین اسلام کا حامی ہونے کی حیثیت سے میری تجاویز کی تائید کرین گے۔ میرے ہی کہنے پر انھون نے موسم سرما مین ہندوستان کا سفر کیا اور جو تعارفی خطوط مین نے انھین دیدئے تھے وہ ایک حد تک ان کی کامیابی کے ذمہ دار تھے انجام کار ان کی سیاسی دلچسپیان اسقدر وسیع ہو گئین کہ کسی ایک کام کے لئے مستقلاً وقف رکھنا ناممکن تھا۔ ان کی سیاحت کے وقت سے ہندوستانی مسلمانون کی جانب سرکاری پالیسی مین تبدیلی کی گئی ہے جس پر ہمیشہ عملدرآمد ہوتا رہا ہے بہ حیثیت قوم ہندون کی کانگریس کا اثر زائل کرنے کی غرض سے ان کی ہمت افزائی کی گئی اور جو خیال مین نے "مستقبل اسلام" مین ظاہر کیا تھا اُسے گورنمنٹ نے رفتہ رفتہ اختیار کر لیا ہے۔

جو وعدہ مین نے اپنے ہندو دوستون سے کیا تھا۔ یعنی یہ کہ اُن شکایات کو اپنے ہم ملکیون سے بیان کرون جنھین مین بچشم خود دیکھ چکا ہون، اس سے بھی مین غافل نہین رہا۔ وہ شکایات یہ ہین۔ اس ملک کے باشندون کی خوفناک غربت، ہمارے ہاتھون اُن کی اقتصادی تباہی کا انجام پانا لگان کی ظالمانہ نوعیت جسمین ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے جنگلات کے قوانین۔ اور نمک کا محصول سرکاری حکام کا غرور و تمکنت انگریزون اور ہندوستانیون مین باہمی نفرت و حقارت کی موجودگی۔ ۱۸۸۴ء مین مین نے ان تمام شکایات پر "فارٹ نائٹلی ریویو"[۱] مین سلسلہ مضامین لکھا اور انھین بعد مین چھوٹی سی کتاب[۲] کی صورت مین دوبارہ شائع کر دیا۔ چونکہ وہ اب ناپید ہے لہذا مین اسے اس ڈائری مین تتمہ کے طور پر شامل کئے دیتا ہون۔

اس مین ملکی اصلاحات کے بارے مین اسکیم بھی ملے گی جسے پورے ایک نسل کے وقفہ کے بعد انڈیا آفس بددلی کے ساتھ نافذ کر رہا ہے۔ جو تبدیلیان اس عمل مین آئی ہین ان کے بارے مین تشریحی نوٹ بھی لگا دیئے گئے ہین۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی تبدیلیان شاذ و نادر ہی بہتری کی صورت رکھتی ہین۔ مجمل طور پر ہندوستان کی اقتصادی حالت ویسی ہے جیسی کہ لارڈ رپن کے زمانہ مین تھی۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ مسلسل قحط اور وبا نے مفلسی کے بوجھ مین اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

ہندوستان کے قحط زیادہ شدید رہے ہین اور بار بار وقوع مین آئے ہین، اسکی زراعتی مفلسی زیادہ پائدار ہو گئی ہے اسکی زراعتی آبادی زیادہ مقروض ہو گئی ہے اور اسکی ناامیدی نے زیادہ خوفناک شکل اختیار کر لی ہے۔ لگان اراضی مین وقتاً فوقتاً تخفیف کرنے کی پالیسی مین کوئی تغیر نہین ہوا

[۱] Fortnightly Review ۔ [۲] اس کتاب کا نام Ideas about India ہے۔

نمک کا محصول اگرچہ کسی قدر ہلکا کر دیا گیا ہے، تاہم غربا کے لئے وبال جان بنا ہوا ہے - بھوک اور وہ وبائین جو بھوک کا لازمی نتیجہ ہین وسیع تر رقبہ پر پھیلتی جاتی ہین - دکن کا کسان غالبًا دنیا مین غریب ترین آدمی ہوتا ہے - نظام مالیات مین کوئی تبدیلی عمل مین نہین آئی اور نہ کسی قسم کی کفایت ہی برتی جاتی ہے - جو بات ۴۲ سال پیشتر خراب تھی، آج بدتر حالت مین ہے - بہر صورت سابق کی طرح اب بھی ہندوستانی خام اجناس غیر ملکی معدودن کی غذا بن رہے ہین - قحط اور طاعون جس مین یہ بات بھی شامل ہے کہ برطانوی ہند دیہات کے ساہوکارون کے قرض کی غلامی مین جکڑا ہوا ہے، ایسے واقعات ہین جنھین خوشحالی کے بارے مین سرکاری اعداد مسترد نہین کر سکتے -

۱۸۸۴ء مین مین نے نفرت وحقارت کے جو واقعات دیکھے تھے وہ اب اور بڑھ گئے ہین - اس مین کچھ شبہ نہین کہ ان ۴۲ سالون مین رنگدار اقوام کے ساتھ سفید اقوام کے طرز عمل مین نمایان تبدیلی ہو گئی ہے - عیسوی مذہب کی قدیم مذہبی تلقین جس پر عیسائیت کو اسقدر ناز ہے، یہ تھی کہ تمام انسان کم سے کم خدا تعالیٰ کی نظر مین مساوی درجہ رکھتے ہین لیکن اسکی جگہ ایک اور اصول نے جو نیم سائنٹیفک ہے - لے لی ہے یعنی یہ انسانی اقوام بنیادی طور پر غیر مساوی ہین - ممکن ہے کہ یہ ٹھیک ہو، لیکن اس کو مبالغہ آمیز طریقہ سے بیان کیا گیا ہے اور اُسے سیاسی مقاصد کے لئے بدین غرض استعمال کیا گیا ہے ———— کہ سفید اقوام کی خود غرضی اور غلبہ کے لئے بہانہ مل سکے اور دنیا کی رنگدار اقوام پر سفید اقوام کی جابر حکومت کے دعوے کو تقویت پہونچ سکے - مین نے اسے نیم سائنٹیفک اس بنا پر قرار دیا ہے کہ دنیا کے قدرتی قانون مین اس قسم کی کوئی شئے موجود نہین - ڈاروِن[1] کا اصول کشمکش حیات اس دعوے سے معرا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے فوقیت رکھتی ہے اور یہ کہ اسے باقی اقوام پر حکومت کرنی چاہئے - اور نہ دنیا کی تاریخ مین ایک قوم نے کسی دوسری پر اسطرح غلبہ حاصل کیا ہے - کوئی قوم اگر زندہ رہی ہے تو اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ زیادہ طاقتور تھی، یا یہ کہ زیادہ جابر تھی بلکہ اس لئے کہ اس مین مقامی حالات کے موافق زندگی بسر کرنے کا زیادہ مادہ موجود تھا - باوجود اسکے یہ بات عام طور پر دیکھنے مین آ رہی ہے کہ سند کے طور پر ڈارون کے اصول کو ایسے ممالک مین جو یورپ مین زندگی کے لئے موزون نہین ہین - امپیریل غلبہ واقتدار اور نسلی تعصب اور بردباری کے جواز مین پیش کیا جاتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ قطع نظر پادریون کے مشرق مین جو انگریزی دکھائی دیتے ہین وہ برائے نام ہی عیسائی ہین اور ان کا رجحان یہ ہے کہ جون جون موجودہ خیالات کی ترقی ہوتی جائے وہ عیسائیت سے اور دور ہٹتے جائین -

برخلاف اس کے ہندوستانی اقوام جن مین سے اکثر ذہنی لحاظ سے یورپین اقوام کی ہمسر ہین، خاموش بیٹھی ہوئی نہین ہین قطع نظر اس تعلیم کے جو وہ سرکاری اسکولون اور کالجون مین حاصل کر رہی ہین، مغربی اصول اور طریقے یورپین سیاحون کے ساتھ دن بدن زیادہ میل جول رکھنے کے باعث ان مین زیادہ عام ہو رہے ہین اور سفر کی اُن سہولتون سے انھین واقفیت ہو رہی ہے جنھین انھون نے از خود حاصل کیا ہے - اگر ہندوستان کا ہر سرکاری مدرسہ بند کر دیا جائے اور ہر اخبار کو دبا دیا جائے تو مجھے شبہ ہے کہ اس قسم کی معلومات ترقی کرنے سے رک جائیگی - ایسی معلومات تحریر کے بجائے تقریر کے ذریعہ ایک دوسرے تک پہونچتی رہے گی اور بہر صورت یہ یقینی امر ہے کہ کم سے کم

[1] Darwin

شہرون مین اصلی قیمت پہچان لی گئی ہے اور ہر شخص پر حتی کہ غریب ترین شخص پر اُن کی اخلاقی کمزوریون اور ذہنی کمیون کا حال اچھی طرح سے واضح ہو گیا ہے۔

مجھے اقرار ہے کہ مین یہ معلوم کرنے سے قاصر ہون کہ انیگلو انڈین سول سروس کے نام قواعد وغیرہ نافذ کرنے سے یہ ناخوشگوار صورت حالات کس طرح سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ مین اسکی جانب سے بالکل مایوس ہو گیا ہون اسلئے کہ اسی قسم کی تباہ کن نشو ونما مین مصر مین بھی دیکھ چکا ہون۔ انگریزی قبضۂ مصر سے سات سال قبل انگریزون اور مصریون کے باہمی تعلقات نہایت اچھے تھے دونون مین مراسم قائم تھے اور دونون ایک دوسرے کا ادب و وقار ملحوظ رکھتے تھے' اور انگریزی سیاحون کو (جنکی تعداد اُس زمانہ مین بہت کم تھی) اس امر پر فخر ہوتا تھا کہ قاہرہ کے مالدار مسلمان انھین اپنے یہان مدعو کرتے ہین اور دیہات کے غربا تو ہر وقت انھین خوش آمدید کہنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ لیکن ۱۸۸۲ء کے قبضہ سے ہمارے اہل ملک نے جو غلط پوزیشن حاصل کر لی ہے یعنی حاکم اور محکوم کی اور جس مین حاکم تو غیر ملکی ہین جو ملک کے باشندون کے خلاف نسلی امتیازات برتنے کے خواہشمند ہین۔ اُس نے گزشتہ صورت حالات کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔ خوشگوار معاشرتی تعلقات صرف اُن لوگون مین جاری رہ سکتے ہین جہان متعلقہ اشخاص مساویانہ طریقہ سے مل جل سکین اور تمام امتیازات مین نسلی امتیاز ہی ایسی شے ہے جو مساویانہ تعلقات مین حائل ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان مین معاملات یہانتک ترقی پا چکے ہین کہ میرا خیال ہے کہ تاوقتیکہ ملک کا انتظام کلیتہً ہندوستانی ہاتھون مین نہ دیدیا جاے' سول سروس کو مخصوص جماعت کی حیثیت سے موقوف نہ کر دیا جاے اور یوروپینون کو محض اعلی تنخواہ پانے والے ملازمین (نہ کہ آقا) کی حیثیت نہ دیدی جائے اس وقت تک انگریز اپنی برتری و فوقیت کے دعاوی سے دست بردار نہ ہون گے۔

آخری باب ("سلیف گورنمنٹ کا مستقبل") پر مین کچھ راے زنی کرنا نہین چاہتا اس لئے کہ یہ مضمون پچیس سال قبل لکھا گیا تھا۔ تاہم اخبارات کے متعلق جدید قواعد کے ذریعہ ہندوستان مین جس تحریر وتقریر اور اظہار راے کی آزادی کو سلب کیا جا رہا ہے اور از سر نو استبدادانہ طریقہ سے گرفتاریان عمل مین آ رہی ہین اور لوگون کو مقدمہ چلائے بغیر قید کیا جا رہا ہے' یہ ایک ایسی کارروائی ہے جس پر مین صداے احتجاج بلند کئے بغیر نہین رہ سکتا۔ مبادا میری خاموشی کا یہ مطلب لیا جائے کہ مین اسے پسند کرتا ہون حکومت کے یہ طریقے نہ صرف میرے نزدیک قابل نفرت ہین بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ بیکار ہین اور اُن کا اثر بُرا ہو گا اور ان کو جاری رکھنے کے یہ معنی ہون گے کہ جو گورنمنٹ اُن پر اعتماد رکھتی ہے وہ سچی ترقی پیدا کرنے والی اصلاحات کے نفاذ کا سنجیدہ ارادہ نہین رکھتی۔

ض۔ ا۔ ب۔ برنی

ضبطِ آرزو

اتنی کہاں مجال کہ تجھ پر نظر کریں
ایسے کہاں نصیب ترے دل میں گھر کریں

کیونکر شرف یہ پائیں کہ ہوں تجھ سے ہمکلام
اظہار حال کس طرح اے بے خبر کریں

پیدا کریں کہاں سے وہ تابِ سکوت سوز
جو ہم بیانِ کلفتِ دردِ جگر کریں

بے چینیوں کی کھینچ دیں تصویر کس طرح
کیا ذکر نالۂ شب و آہ سحر کریں

کیونکر دکھائیں منظر خوں گشتگی اشک
ہم کیا کریں جو تیری نگاہیں ادھر کریں

کیونکر یقین دلائیں کہ دل میں لگی ہے آگ
پیدا کہاں سے نالۂ پُر از شرر کریں

کس شکل سے دکھائیں تجھے سوزشِ دروں
کیونکر تری نظر کو حقیقت نگر کریں

ٹھہرا جب التفات ہی تیرا دوا اے دل
پھر کس غرض سے منتِ ہر چارہ گر کریں

تیرے سوا کسی سے نہیں واسطہ تو پھر
کسکو بتائیں راز کسے نامہ بر کریں

کہنے کو کہہ بھی جائیں اگر کچھ تو کسطرح
پھر تیرے ذہن میں بھی اُسے معتبر کریں

کیونکر وہ لفظ پائیں جو تصویرِ درد ہوں
کس طور سے بیان میں پیدا اثر کریں

گھل گھل کے جان دیں جو یہی ہو رضا تری
غم کا گلا نہ اب سے کبھی عمر بھر کریں

رو رو کے کاٹ دیں سحر و شام زندگی
جل جل کے جتنی عمر رہی ہے بسر کریں

تصویر شمع بن کے رہیں ہم جہاں بھی ہوں
جس حال میں ہوں اُف نہ زباں سے مگر کریں

تجھکو بھلا دیں دل سے نہیں تو یہ بس کی بات
جو کچھ بھی ہو مگر نہ خیالِ دگر کریں

سن کر یہ حالِ مختصر کلفتِ شمیم
جو کچھ کریں حضور ذرا سوچ کر کریں

شمیم خیرآبادی

غزلیات

نکہت بی اے

نظرم طرفِ چمن بر گل خندان افتاد　　بہوایش دل سودا زدہ ام شد برباد
چشم شوقم ہمہ وا ماند بنظارۂ او　　غنچۂ خاطرم از جلوۂ حسنش نہ کشاد
دستِ شوقم بہ سرش برد دلآویزیٔ او　　ساغر گل دلِ آشفتہ ام از دست نہ داد
چیدم از شاخ گل و بر زدمش سینۂ او　　بہوا داریٔ وصلش ہمہ تن بودم شاد
یادم آمد گہے از بوئے دلآویز کسے　　مست بودم ز غم و فکر دو عالم آزاد

گل خوشرنگ دلم برد و ندانستم من　　ہمہ نیرنگیٔ این دام گہِ کون و فساد
رفت خارے بہ دلم با گلِ خندانِ چمن　　می رسد از دل خون گشتہ ام اینک فریاد
گل رسیدہ بخزان در دو دردم باقی است　　خلشے یا بم و این نیست ہمہ بے بنیاد
سرِ عشق است بہ عالم نتوان افشا کرد
دولتِ خاص بہر کس نتوان نکہت داد

نظیر لودھیانوی

ہر طفلِ نازنین ترا بیداد گر ہے آج　　اے برہمن وہ نرم خرامی کدھر ہے آج
ہمراہ میکدہ میں جو وہ فتنہ گر ہے آج　　اک گام ہے زمین پہ اک عرش پر ہے آج
مقتل میں اڑ رہی ہے یہ افواہ صبح سے　　یا تیغ آبدار ہے یا میرا سر ہے آج
گلشن میں کل اسی کا ہما ہمصفیر تھا　　صیاد کے قفس میں جو بے بال و پر ہے آج
قاتل نے قتل گہ میں مجھے کیا پلا دیا　　دنیا کا کچھ پتہ ہے نہ اپنی خبر ہے آج
ارمان کے چراغ جلائے ہیں عشق نے　　یا آنسوؤں میں سرخیٔ خونِ جگر ہے آج
گو لطف سے تہیں ہے سرِ کیں سا ہے مگر　　میں خوش ہوں اس طرف بھی کسی کی نظر ہے آج

شاخِ ستم بھی ہوگئی بار آور ای فلک　　نیزہ پہ قتلگاہ میں عاشق کا سر ہے آج

بے اعتدالیوں کے مضامین کی مانگ ہے　　حیرت یہ ہے کہ عیب بھی یا رب ہنر ہے آج

کل جن کا آستاں تھا فلک سے بلند تر　　ان سب کا سجدہ گاہ ترا سنگِ در ہے آج

آبِ رواں، ہجومِ گل و لالہ، وقتِ صبح　　تصویر تیرے حسن کی پیشِ نظر ہے آج

اے کاش کوئی حضرتِ واعظ کو دے خبر　　کیفیتِ بہشت مری بام پر ہے آج

تم بھی سیاہ کار تھے کل تک تو اے نظیر
کیا ہوگیا کہ ساغرِ مے سے حذر ہے آج

مجنوں گورکھپوری

ڈر ہے کہ روزِ محشر کچھ رنگ پھر نہ لائیں　　خونِ گشتہ آرزوئیں ردکردہ التجائیں

یہ کس کے رنگ ڈوبے معمور ہیں فضائیں!　　چھپ رہنے والے ہم سے آ ہم تجھے دکھائیں

اک دوسرے کے یونہی گرویدہ ہوتے جائیں　　تم بار بار روٹھو رہ رہ کے ہم منائیں

پھر کہہ رہی ہے وحشت لے راہِ کوہ و صحرا　　پھر جامۂ خرد کی چل دھجیاں اڑائیں

پھر ہوک اٹھ رہی ہے پیہم دلِ حزیں میں　　پھر یاد آرہی ہے اس شوخ کی ادائیں

اک محشرِ تمنا رگ رگ میں پھر بپا ہے　　پھر ہوں وہی وفائیں پھر ہوں وہی جفائیں

بیدار کر دیا ہے خوابیدہ حسرتوں کو　　آ فتنۂ قیامت تجھکو گلے لگائیں

مناقی گری کے صدقے ہاتھ اب رکے نہ ساقی
جب تک کہ دم میں دم ہے یونہی پئیں پلائیں

جگر بریلوی

دلِ مرحوم کی اک اک وصیت راز رکھتا ہے　　نہ پوچھو ہم سے ساری عمر گزری کیسی الجھن میں

کسی کی یاد ہے آنکھوں میں آنسو لب پہ خاموشی　　لئے بیٹھا ہوں دل کی خاک کو میں اپنے دامن میں

تمیزِ نیک و بد کا اے محبت وہ کرشمہ ہے　　نظر آنے لگا ہمکو جمال دوست دشمن میں

صفائے قلب سے ہم تو جگر معذور ہو جاتے　　اگر ہوتی نہ داخل عیب بینی خوئے دشمن میں

دل بہت بیقرار رہتا ہے　　موت کا انتظار رہتا ہے

کبھی دل میں چھپا تھا جو کانٹا — اب رگ جاں کے پار رہتا ہے

میں بُرا ہو کے ہو گیا تیرا — یہ بہت ناگوار رہتا ہے

تھا یہی دل کبھی حیات نواز — اب جو زار و نزار رہتا ہے

کیا تبسم میں اس کے دیکھ لیا
کیوں جگر اشکبار رہتا ہے

یوسف گجراتی

جفاؤں پر جفا ہے اور میں ہوں — دل صبر آشنا ہے اور میں ہوں

گئے وہ دن کہ شکوے تھے جہاں کے — اب اپنا ہی گلہ ہے اور میں ہوں

ہزاروں آرزوئیں تھیں مگر اب — دل بے مدعا ہے اور میں ہوں

نشانہ تھا کبھی بیتابیوں کا — پھر اب صبر و رضا ہے اور میں ہوں

سہارے ہو چکے سارے جہاں کے — خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

اثر ہے لذت بیداد کا یہ — تمنائے جفا ہے اور میں ہوں

اٹھائے رنج دنیا کے ہیں یوسف
غم روز جزا ہے اور میں ہوں

استفسارات

حجر اسود۔ امام مہدی

(جناب منظور الہٰی صاحب۔ کلکتہ)

(۱) حجر اسود کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ یہ پتھر کہاں سے آیا اور اس قدر قابل احترام کیوں شمار کیا جاتا ہے۔

(۲) امام مہدی کب آئیں گے۔ کیا آیات قرآنی ان کے نزول کی شاہد ہیں، اگر ہیں تو کون کونسی، آپ کے نزول کی کیا نشانیاں ہوں گی مفصل تحریر فرمایئے۔

(نگار) آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ عبادت کی اولین رسمی صورت جو دنیا میں قائم ہوئی وہ قربانی تھی، جسکا ثبوت خود قرآن پاک سے ملتا ہے (ملاحظہ ہو واقعۂ ہابیل و قابیل) اُس وقت تک کہ انسان ڈانواڈول زندگی بسر کر رہا تھا اور کسی جگہ اس کے قیام کا ٹھکانا نہ تھا رسم قربانی ادا کرنے کے لئے بھی کوئی متعین جگہ نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن جب اس میں آثار تمدن پیدا ہوئے اور اس نے اپنے قیام کے لئے جگہ مقرر کی تو قدرتاً قربانی کے لئے بھی کوئی مقام اس کو مختص کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ جائے قربانی کی تعین کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے اور انھوں نے بھی حسب دستور قربانگاہ، یا مذبح جسے مقدس ترین معبد کی حیثیت حاصل تھی، قائم کی۔

قربانگاہ یا مذبح کی صورت یہ تھی کہ ایک پتھر بطور نشان کے قائم کر لیتے تھے اور اسی جگہ کو خدا کا معبد سمجھکر قربانیاں کیا کرتے تھے، چنانچہ توریت مقدس سے ابراہیم اور آل ابراہیم کا اس طرح پتھر نصب کرکے مذبح بنانا پوری طور پر ثابت ہے (ملاحظہ ہو کتاب پیدایش (باب ۲، آیت ۷)، (باب ۱۳، آیت ۸) (باب ۲۶ آیت ۲۵)، (باب ۲۸، آیت ۱۸، ۱۹، ۲۲) اور کتاب خروج (باب ۲۴ و ۲۵)

جب حضرت ابراہیم سرزمین مکہ میں تشریف لائے تو انھوں نے یہاں بھی اسی دستور کے مطابق ایک پتھر قربانی کی جگہ متعین کرنے کے لئے نصب کیا جس کو حجر اسود کہتے ہیں۔ اخبار مکہ میں ارزقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر جبل بوقیس سے حاصل کیا گیا تھا۔ بعد کو جب ابراہیم کی اولاد نے اس جگہ مستقل مکان (مذبح) بنایا تو اس پتھر کو لیکر اسی دیوار میں لگا دیا جس سے مقصود یہ تھا کہ طواف کے شروع اور ختم کرنے کی جگہ متعین ہوجائے۔ پھر چونکہ حجر اسود حضرت ابراہیم کی یادگار ہے اس لئے

اس کا تاریخی، اثری اور مذہبی احترام ظاہر ہے۔

اب یہ پتہ چلنا بہت دشوار ہے کہ یہ پتھر اصل میں کتنا بڑا اور کس رنگ کا تھا کیونکہ اول تو کثرت مس سے اس کی سطح بالکل چکنی ہوگئی ہے اور دوسری یہ کہ دو دفعہ کعبہ میں آگ لگنے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی سیاہ ہوگیا ہے۔

حجر اسود کے متعلق جو اور بہت سی روایات پائی جاتی ہیں کہ وہ پہلے سفید تھا اور انسان کے گناہوں نے اسے سیاہ کردیا یا یہ کہ وہ بہشت کا لعل تھا یا یہ کہ قیامت کے دن اس کی آنکھ اور زبان ہوجائے گی اور وہ لوگوں کے بوسہ دینے کی شہادت دیگا یہ سب مجروح اور ناقابل اعتبار ہیں۔ کلام مجید میں کسی جگہ اس پتھر کا ذکر نہیں آیا ہے اور اسی سے اس کی عدم اہمیت ظاہر ہے۔

(۲) امام مہدی کے نزول کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے اور نہ میں اس کا قائل ہوں

مسلمانوں اور عربوں کا علم الکیمیا؟

(جناب سید فضل رسول صاحب۔ بھاگلپور)

کہا جاتا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں نے علم الکیمیا میں بڑی ترقی کی تھی، لیکن اس وقت ان کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ کیا آپ اس امر کی زحمت فرمائیں گے کہ اس مسئلہ پر بسیط نظر ڈال کر یہ بتائیں کہ مسلمانوں یا عربوں میں اس علم سے کیا مقصود تھا، ان کے کیا اصول تھے۔ اس فن کے جاننے والے کون تھے، کونسی کتابیں انھوں نے تصنیف کیں اور ان کے اصول علم الکیمیا کیا تھے؟

(نگار) علم الکیمیا نے جو ترقی اس عہد میں کی ہے، وہ یقیناً اس سے قبل کبھی نہیں پائی جاتی تھی، اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا کیونکہ علوم کی ترقی رفتہ رفتہ صدیوں میں جاکر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کے کارنامے اس علم میں بھی کم قابل احترام نہیں ہیں۔ آپ کا سوال نہایت بسیط گفتگو چاہتا ہے کیونکہ بحث کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک مستقل موضوع سخن بن سکتا ہے لیکن اسوقت میں صرف مختصر مقالہ پر قناعت کرونگا اور کوشش کرونگا کہ کم سے کم الفاظ میں آپ کے سوال کے تمام اشارات کا احاطہ کرسکوں۔

کیمیا کا مفہوم اول اول عربوں میں یہ تھا کہ ایک دھات دوسری دھات میں تبدیل ہوجائے اسی لئے لفظ کیمیا، اکسیر کا مترادف ہوگیا اور بعد کو اس مفہوم نے قدر وسعت اختیار کرلی کہ ہر وہ ذریعہ جس سے کوئی شے حاصل ہوسکے کیمیا کہلا یا جانے لگا، چنانچہ الفاظ کیمیاء السعادت، کیمیاء القلوب وغیرہ کی ترکیب اس پر شاہد ہے۔

فن کیمیا کے نام ان کے ہاں متعدد تھے اور صناعۃ الکیمیا، صناعۃ الاکسیر، علم الصناعۃ، علم الاکسیر وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے بعض نے اس کو علم المیزان، اور علم المفتاح سے بھی تعبیر کیا ہے۔

اس علم کی ابتدا کے متعلق بعض مسلمان مصنفین کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے آدم کو سکھایا اور اس کے بعد شیث، ابراہیم ادریس، داؤد، سلیمان، موسیٰ، سے منتقل ہوتا ہوا نبی آخرالزمان تک پہونچا اور پھر ان سے حضرت علی کو ملا، لیکن خیر یہ تو شاعری ہی شاعری ہے حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے زیادہ تر اس فن کو یونانی کتابوں سے حاصل کیا جو ہرمس و دیمقراطس سے لیکر فیثاغورس اور بطلیموس کے عہد تک لکھی گئی تھیں۔

فہرست ابن ندیم، کشف الظنون، الوافی فی تدبیر الکافی، المصباح فی علم المفتاح میں مسلمان ماہرین کیمیا کی فہرست اور ان کی تصانیف کا حال درج ہے جنمیں خاص خاص یہ ہیں:-

(۱) خالد بن یزید شاہی جو خاندان بنی امیہ میں سے تھا ۸۵ھ میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فردوس الحکمۃ ایک عمدہ کتاب علم الکیمیا پر لکھی تھی۔ (۲) جابر بن حیان اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جنمیں سے خاص خاص کتاب الموازین الصغیر، کتاب التجمیع، الزیبق الشرقی ہیں۔ (۳) ابن الوحشیہ جن کا نام ابوبکر احمد بن علی الکلدانی تھا۔ یہ دوسری صدی ہجری میں پایا جاتا تھا اس نے متعدد رسالے علم الکیمیا پر لکھے (۴) ابوبکر محمد بن زکریا الرازی یہ تیسری صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد کا نہایت مشہور طبیب تھا۔ علم الکیمیا پر اس کی تصنیف "کتاب الاسرار" خاص چیز ہے۔ (۵) ابن امیل التمیمی۔ آٹھویں صدی میں ہوا ہے اس کی کتاب مفتاح الحکمۃ العظمیٰ مشہور ہے۔ (۶) مسلمہ بن احمد المجریطی جو چوتھی صدی ہجری میں ہوا ہے اور اس کی کتاب طبقات العلما، قابل ذکر ہے (۷) ابوالحکیم محمد بن عبدالملک صاحب عین الصناعۃ وعون الصناع۔ (۸) موید الدین الطغرائی مشہور وزیر و شاعر۔ کتاب الانوار والمفاتیح۔ مفاتیح الرحمۃ، نور الحکمۃ اور جواہر المنیر فی صناعۃ الاکسیر اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ (۹) ابوالحسن بن موسیٰ صاحب شذور الذہب۔ (۱۰) ابوالقاسم محمد بن احمد العراقی صاحب المکتسب (۱۱) علی بن ایدمر۔ (۱۲) ابوالاصبع بن تمام العراقی اور (۱۳) فارابی۔

یہاں اصول پر گفتگو کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن خود ان کی اصطلاحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک مکمل تھے چنانچہ الفاظ تبخیر، تدخین، تمریخ، تحلیل، ترکیب، تدقیق، تقطیر، تصفیہ، تدبیر، تعقید، تجمید، ترجیم، تشمعہ، تکلیس تجسید، تصعید، تخنیق، الغام وغیرہ سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں علم الکیمیا کس قدر وسیع تھا۔ جوہر اڑانا، منجمد کرنا، سیال بنانا، صاف کرنا، اجزاء علٰحدہ علٰحدہ کرنا، مرکب کرنا، صاف کرنا، مقطر کرنا، چونہ کی شکل میں تبدیل کرنا موم کی طرح نرم بنانا۔ یہ سب ان کے علم میں تھا اور کرتے تھے۔ تمام اعمال کیمیا دی کے لئے انھوں نے آلات بھی بنائے تھے

جن کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔ کوتوال بھی بازار کی اشیا کی جانچ انھیں اصول سے کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ ان میں کوئی میل تو نہیں ہے۔ عطر سازی کا فن بہت ترقی پر تھا۔ خصوصیت کے ساتھ دمشق و ایران میں، اسی طرح شکر سازی، مختلف قسم کی روشنائیاں بنانا، تعمیر کا مسالہ طیار کرنا اور نقلی جواہرات بنانا یہ سب نہ صرف ان کی علم میں تھا بلکہ ان میں سے ہر ایک فن پر علحدہ علحدہ وہ مبسوط تصانیف چھوڑ گئے ہیں۔

علم الکیمیا جاننے والے دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک اس بات کا قائل تھا کہ ایک دھات دوسری دھات میں تبدیل ہوسکتی ہے اور دوسرا اس کا مخالف تھا، اول الذکر جماعت میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے لوگوں کو دھوکا دینا شروع کیا، اور ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علم الکیمیا کی کتابوں کی ایک بڑی فہرست مرتب ہوسکتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جو ہم تک پہونچی ہیں اور اس لئے اس وقت تک مسلمان کیمیا دانوں کے کارنامے صحیح و مکمل روشنی میں پیش نہیں ہوسکے مسلمانوں نے اس فن کو زیادہ تر یونان والوں سے حاصل کیا، لیکن اس میں بعد کو بہت کچھ ابداع و اختراع سے بھی کام لیا اور متعدد آلات و طریقے ایسے پیدا کئے جو اس سے قبل وجود میں نہ آئے تھے۔

جواہرات کا بادشاہ ہندوستان کے مشہور جوہری مسٹر گنیش لال برج موہن حال میں لندن پہونچے ہیں وہاں ان کو "شاہ جواہرات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی صدری کے جیب میں ہر وقت ۵ لاکھ پونڈ کے جواہرات لئے پھرتے ہیں ان کے ساتھ ان کی حفاظت کے لئے ہر وقت چار مسلح ہندوستانی جاسوس موجود رہتے ہیں۔

فلیڈ یلفیا میں جہاں انھوں نے اپنے جواہرات لوگوں کو دکھلائے ۱۸۰ آدمی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ لیکن اسقدر سخت حفاظت اور نگرانی کے باوجود ایک چور ہوٹل میں پہونچ ہی گیا۔ لیکن ناکام رہا۔

مسٹر لال ہندوستان کے ایک مشہور جوہری ہیں اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں انھوں نے ڈیلی کرانیکل کے نمائندہ سے دوران ملاقات میں بیان کیا کہ وہ یہ جواہرات اپنے چند دوستوں کو دکھلانے کے لئے لائے ہیں حسب ذیل جواہرات انکے پاس موجود ہیں۔

مشہور تاج محل ہار کا وہ وسطی زمرد جس کا وزن ۹۳ قیراط ہے اور جس کی قیمت ساٹھ ہزار پونڈ ہے

ایک نیلم ان کے پاس ۸۸ ۱/۲ ۷۷ قیراط کا ہے جو دنیا بھر میں بے مثل مانا گیا ہے اور جس کی قیمت ۱۲۰۰۰ پونڈ ہے۔ انکے پاس ۴۰ زمرد کے دانوں کا ایک ہار ہے جس میں ہر ایک دانہ آٹھ قیراط کا ہے اور جس کی قیمت ۸۵۰۰۰ پونڈ ہے۔

مسٹر لال کہتے ہیں کہ "سات ماہ تک فلیڈ یلفیا کی نمائش میں ہمارے ہندوستانی کیمپ میں لوگ جواہرات دیکھتے رہے اور شکاگو اور دیگر شہروں میں ہم بغیر کسی حادثے کے گئے اور آئے ہیں ۲۵۰۰۰ میل کا سفر طے کرچکا ہوں اور ان جواہرات کو اپنی جیب میں رکھے ہوئے ہوں۔ جب ہم فلیڈ یلفیا کی نمائش میں اپنے کیمپ میں تھے تو تیس ۳۰ آدمیوں چھپ کر ہمارے کیمپ کی نگرانی کرتے تھے۔ جب نمائش بند ہوئی تو ۱۸۰ آدمی دو صد روز تک میری حفاظت کرتے رہے۔ میرے ہندوستانی محافظ ہر وقت کراماً کاتبین کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں جب میں رات کو سوتا ہوں تو ایک آدمی ہمیشہ مجھے اور جواہرات کو دیکھتا رہتا ہے۔ میرے ملازمین خنجروں سے مسلح ہیں وہ خنجروں کو ریوالور پر ترجیح دیتے ہیں۔

بعض اوقات جواہرات میں اپنے ملازمین میں سے کسی کے پاس رکھ دیتا ہوں جیسا موقع ہوتا ہے اسی مناسبت کے لحاظ سے میں انکی حفاظت کرتا ہوں۔

ضعیف حافظہ کا علاج انگلینڈ کے ایک ڈاکٹر نے حال ہی میں ایک ایسے عجیب وغریب مریض کا علاج کیا ہے جو اپنی قوت حافظہ کھو چکا تھا۔ کہ اکٹر دنیک بیچ نے انسولن کے ذریعے اس کا علاج کیا جس سے مریض کو بہت فائدہ ہوا۔ علاج سے قبل مریض کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ کونسا موسم گذر رہا ہے آخر انسولن کے کئی انجکشن کرنے کے بعد اس کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اپنے فراموش شدہ خاندان کی یاد تازہ ہوگئی اور وہ جاننے لگا کہ وہ کہاں ہے بالآخر کچھ عرصہ بعد اس کی قوتِ حافظہ بالکل اپنی اصلی حالت پر آگئی۔

پتنگوں کی قوت شامہ امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے عرصہ کے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ پتنگوں اور کیڑوں میں مختلف بو یا خوشبو پائی جاتی ہے ایک دوسرے کو اسی خوشبو کے ذریعہ سے پہچان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ سیلون کے بعض کیڑوں میں عطر یاسمن کی خوشبو پائی جاتی ہے اور بعض میں چاکلٹ کی۔ جنوبی امریکہ کے بعض کیڑوں میں لونگ کی خوشبو ہوتی ہے اور آسام کا ایک کیڑا بالکل مشک کی خوشبو رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوشبو کیڑوں کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسے روشنی انسان کے لئے۔ چونکہ کیڑوں کی نگاہ بہت کمزور ہے اور اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے اس لئے وہ صرف خوشبو سے تمیز کرتے ہیں اور اسی سے اپنی مادہ کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ شہد کی ملکہ قوت شامہ ہی سے خاص شہد کی تمیز کرتی ہے اور چیونٹیاں بھی سونگھ ہی کر اپنے خاندان کے افراد کو پہچانتی ہیں۔

ایک عجیب عورت فرانس میں سب سے زیادہ عجیب وغریب عورت مادام دیلی نامی ہے جس کے ڈاڑھی اور مونچھیں دونوں موجود ہیں اس کو دیکھنے کے لئے تماشائیوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ بالخصوص نقاش اور مصور ضرور اس کی تصویر لینے کے لئے آتے ہیں اس کے دیکھنے کے لئے ٹکٹ کی ایک رقم مقرر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ فرانس کا ایک مشہور متمول شخص اس ڈاڑھی مونچھ والی عورت کا گرویدہ ہے۔

اس کی ایک لڑکی بھی ہے۔ لیکن ڈاڑھی اور مونچھ کی نعمت سے محروم ہے۔

زمین کی بہشت فردوس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہاں سوائے حسن وجمال کے قبح کا کہیں نام بھی نہ ہوگا، اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس خصوصیت کے لحاظ سے کرۂ ارض کی بہشت سرزمین سویڈن و ناروے ہے جہاں کی آبادی میں ایک شخص بھی مکروہ صورت یا سقیم اعضاء کا نہیں ہے۔ اب سے دو سال قبل صرف ایک انسان وہاں ایسا پایا جاتا تھا جو لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ آخر کار قدرت نے رُخِ زیبا پر خال کا ہونا بھی گوارا نہ کیا اور اسے اٹھا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت یہ شخص مرا سارا ملک خوشی سے اچھل پڑا اور بڑے بڑے جشن مسرت منائے گئے

خطرات تمدن یورپ و امریکہ نے حفظانِ صحت میں جس قدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ گذشتہ ۵۰ سال کے

اندر وہاں انسانی عمر کا اوسط دوچند اور موت کا اوسط نصف سے کم ہوگیا ہے۔ امراض مفقود ہوتے جارہے ہیں اور صحت و توانائی بڑھتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نتیجہ یہی ہونے والا تھا کہ زمین ان کی آبادی کے لئے تنگ ہوجاتی لیکن قدرت نے جو اپنا ٹیکس کسی نہ کسی طرح وصول کرلیتی ہے، وہاں کے انسان کو مکانکیات کا دلدادہ بنادیا اور ان سے موٹر ایجاد کرادی، جسکا روشن پہلو ہر اس شخص کو زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو اس سے محروم ہوتا ہے لیکن اس کے تاریک پہلو کو اگر دیکھنا ہے تو امریکہ کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمایئے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں بیماریوں سے اتنے آدمی نہیں مرتے، جتنے موٹروں سے ہلاک ہوتے ہیں، چنانچہ سال گزشتہ وہاں صرف ایک صوبہ ایلینوے میں ۱۵۸۷ آدمی مختلف امراض سے ہلاک ہوئے اور ۱۲۴۷ موٹروں کے نذر ہوئے۔

پیرس میں قیامتوں کا اضافہ

۷ مارچ ۱۹۲۶ء کو جو مردم شماری پیرس کی ہوئی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی آبادی ۲۸۷۱۴۲۹ ہے اور شہر پیرس میں ۳۳۰۰۰۰ عورتیں، مردوں سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر عورتوں کی آبادی اس نسبت سے بڑھتی رہی تو ایک وقت وہ آئے گا جب پیرس میں مرد کی جنس بالکل ناپید ہوجائیگی اور سارا ملک حوا کی بیٹیوں سے بھر جائیگا، پھر کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب مشکل ہے، کیونکہ جس سرزمین کی ایک ایک عورت اب بھی دنیا کو تباہی کا چیلنج دی سکتی ہے، وہاں اگر اتنی کثیر قیامتوں کا اضافہ ادا ہوگیا تو نتیجہ جتنا بھی ہولناک ہو کم ہے

چیونٹی کی زندگی

چیونٹی کی عقلمندی، محنت اور پیش بینی مشہور ہے، لیکن یہ انکشاف حال ہی میں ہوا ہے کہ اس کی عمر بھی بہت بڑی ہوتی ہے۔ سرجان لبوک نے ایک چیونٹی کی پرورش کی جو پندرہ سال تک زندہ رہی۔

چیونٹی نہایت سخت جان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے تمام اعضاء کو علٰحدہ کردیا جائے تو بھی اس کے سر کا حصہ زندہ رہیگا۔

ایک پروفیسر نے چیونٹی کو آٹھ دن تک برابر پانی نے اندر ڈبوئے رکھا لیکن جب باہر نکالا تو زندہ تھی، اسی طرح ایک اور پروفیسر نے چیونٹی کے سارے اعضاء علٰحدہ کردئے اور اس کا سر ۴۴ دن تک زندہ رہا۔ دوسری چیونٹی کو اس نے ۹ مہینے تک بند رکھا اور پھر نکالا تو وہ زندہ تھی۔

ایک ڈاکٹر نے دو چیونٹیاں لیکر سر جدا کئے اور ایک کا سر دوسرے میں پیوست کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اسی حال میں زندہ رہیں۔

برقعہ نو ایجاد

جس کی اختراع پر اکیس سال کے عرصہ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی نمائشوں سے بارہ طلائی و نقرئی تمغہ مل چکے ہیں۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے لوگوں میں روز بروز زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔

خوبصورت۔ آرام دہ۔ زمانے کے حسب حال اور مکمل پردہ دار ہے۔

ہمارا ہی یہ خیال نہیں ہے بلکہ ہزارہا خواتین جو اس کو زیب تن کرتی ہیں اور ہزارہا مرد جو اس کا معائنہ کر چکے ہیں ہمارے ہم خیال ہیں۔

وضع

اس کی وضع عام پرانی وضع کے برقعوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دو حصوں پر منقسم ہے بالائی حصہ سر سے شروع ہو کر ہاتھوں تک رہتا ہے۔ اسمیں ہماری ایجاد کردہ کمانی دار ٹوپی لگی ہوئی ہے۔ زیرین کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنوں تک رہتا ہے اس کی وضع بالکل ڈھیلے ڈھالے کافی گھیر دار کوٹ کی مانند ہے۔ سامنے کے رخ بٹن لگے ہوئے ہیں

ہر خاتون کو ہر جگہ اس کی ضرورت ہے

آج ہی بشرط واپسی منگوائیں

کندھے سے قد کی لمبان۔ اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں اور بشرطِ واپسی منگوا کر خود معائنہ کریں اور پردہ نشین خواتین کو پسند کرنے کا موقع دیں

قیمت

سفید	رنگین نرما	رنگین دبیز	ٹسر	چینی ریشم
۱۲؏	۲۰؏	۲۵؏	۳۵؏	۴۵؏ تا ۵۰؏

ملنے کا پتہ

خاتون اینڈ بے بی اسٹورز نمبر ۲ فتحپوری۔ دہلی

مسز آب بلقیس (اسمیرہ صلواتہ) نے نکاح کرکے ان کو ہدایتیوں میں طاقت بھانے کے نتائج پر دلچسپ روشنی ڈالی گئی ہے اور تحقیق و تدقیق کا دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جو جو اصلاح ملکی یا میونسپل قوانین کے ذریعہ سے ممکن ہیں ان کی صراحت کی گئی ہے وہ ایک تدمی انگہ کے حالات کا خاکہ کھینچا گیا ہے قیمت ۱۰

قاری محمد سرفراز حسین صاحب مسلم مشنری کی دیگر مشہور و معروف تصانیف

(انگریزی میں) :-

اسلام قاری صاحب کے ان متصوفانہ مضامین کا مجموعہ جو امریکہ کے ممتاز رسائل میں شائع ہوئے تھے ان مضامین کی مقبولیت کو دیکھکر انہیں کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے اور اسکے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں قیمت ایک روپیہ (خوبصورت جلد)

(اردو میں) مذہبی - اخلاقی اور اصلاحی کتب

"اسلام پرانا ہو گیا" یہ صدائے بے ہنگام یورپ میں طنزاً نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیمیافتہ مسلمان یورپ کی تقلید میں اس معصیت آمیز آواز میں شریک ہو گئے ہیں اس نے قاری صاحب کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ جدید علم الہیات و علم النفس کی روشنی میں **"فضائل اسلام"** پر ایک کتاب لکھیں چنانچہ آپنے اس کتاب میں نہایت تحقیق و تدقیق سے جدید علوم عقلیہ و جدید دلائل و استدلال کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ اسلام ہی ساری دنیا اور ہر وقت کے واسطے خسر الدنیا والآخرۃ سے نجات دلانیوالا واحد مذہب ہے۔ اسکی تعلیم فطرت کے مطابق ہے وہ بہترین شائستگی اور اعلی ترین تمدن کا سرچشمہ ہے۔ غالباً کٹھ ملا اس کتاب کو پسند نہ کرینگے لیکن یہ ان کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ تو انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کیلئے ہے اور اسمیں انکے زعم باطل کو توڑا گیا ہے اگر تعلیم یافتہ حضرات اس کتاب کو پڑھیں تو ان کا **اعتقاد درست ہو جائیگا** - یہ اردو زبان میں اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے - قیمت آٹھ آنے (۸/)

ہندوؤں میں جذب نہ ہو لیکن ہندی نہ ہو یہ ہے قاری صاحب کی اجتہادی تصنیف "احیاء ملت" کا مقصد - قاری صاحب کی یہ وہ کتاب ہے جس کے خیالات پر مخالفت کا ایک طوفان بپا ہوا ہے قاری صاحب نے اس کتاب میں علمائے امت کیلئے امت اسلامیہ کیلئے احیاء کیلئے اجتہادی اور اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں جسکے متعلق ہندوستان کے مشہور تبلیغی رسالہ درویش کے ریویو کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی عالمگیر مسلم مشنری سیاح جاپان و انگلستان کے نام سے علمی و ادبی دنیا روشناس ہے آپ کے دل میں اصلاح ملت اسلامیہ کی ایک ایسی تڑپ موجود ہے جو کم سینوں میں ہوگی یہی درد اور تڑپ ہے جس نے ان سے اس اہم موضوع پر متعدد تصانیف شائع کرائی ہیں احیاء ملت جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس سلسلہ کی ایک ایسی کڑی ہے جس میں انتہائی غور و فکر کے بعد چند ایسی تجاویز متعلق احیاء و اصلاح ملت پیش کی گئی ہیں جو اپنے رنگ میں بالکل نئی ہیں اور شائد قاری صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کی اشاعت کی جرأت نہ پڑتی بالخصوص موجودہ عہد میں جبکہ ہندو مسلم منافقات مہلک درجہ تک ترقی پذیر ہو چکے ہیں مگر ہم کو یقین کرنے میں غلطی نہ کھانی چاہئے کہ ان تجاویز کی پیش کرنے والی جو چیز محرک ہوئی ہے وہ قاری صاحب کا وہ درد اور وہ تڑپ ہے جو اصلاح ملت کے لئے ان کو ہمہ وقت بیقرار رکھتا ہے۔

اس رسالہ میں قاری صاحب نے نہایت قیمتی تجاویز پیش کی ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملت اسلامیہ کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کیا صورت ہے، ہمارا جمود، ہماری غفلت اور اپنے قومی تنزل سے مجرمانہ بے پروائی یہ ایسے امراض ہیں کہ پہلے ان کا علاج ہونا چاہئے۔

گو قاری صاحب کی پیش کردہ تجاویز نہایت قیمتی ہیں تاہم بعض تجاویز سے ہمیں اختلاف ہے - قاری صاحب نے یہ تجویزیں بغرض غور و فکر ملک کے سامنے پیش کی ہیں ضرورت ہے کہ جس قدر ایسی تجاویز ہیں جن پر کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ان کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کی جائے اور جن پر کسی وجہ سے اختلاف ہو ان پر غور و خوض کرکے کسی فیصلہ پر پہنچا جائے قاری صاحب نے بعض ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن سے کٹر قسم کے مولویوں کو سخت اختلاف ہوگا مگر ہمارے نزدیک حالات حاضرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ٹھنڈے دل سے ہمیں ان پر غور کرنا چاہئے قاری کا یہ منشا نہیں ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بے کم و کاست اور بغیر کسی ترمیم کے آغوش عمل میں لے لیا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ زاویہ نگاہ کو وسیع کرکے ان مسائل پر غور و فکر کیا جائے احیاء ملت کی راہ پیدا کی جائے - ہمارے نزدیک یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہر ایک مسلمان اس کو غور سے پڑھے - قیمت آٹھ آنے (۸/)

قلب اسلام مضبوط ہونا چاہئے اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ غریب مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلائی جائے۔

مسلمان مرتد کیوں ہوتے ہیں ؟	افلاس کی وجہ سے !
مسلمان بھیک کیوں مانگتے ہیں ؟	افلاس کی وجہ سے !
جیلخانوں میں مسلمانوں کی تعداد کیوں زیادہ ہے ؟	افلاس کی وجہ سے !
مسلمانوں کی موجودہ حالت کی ۹۰ فی صدی	وجہ صرف افلاس ہے !
اگر مسلمانوں کی ترقی مقصود ہو تو صرف	افلاس کا علاج کیجئے !

قاری صاحب نے اس نکتہ کو سمجھ کر "انیس الغرباء" تصنیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب مسلمان غرباء کی بہبود و اصلاح کی تجاویز کا مفید مجموعہ ہے اس میں مسلمانوں کے مفلسی دور کرنے کی عملی تجاویز درج ہیں قیمت صرف ۸/

تعلیم اسلام کے نتائج فضیلت اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی کے متعلق "فغان قاری" میں عجیب و غریب خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے اسلام بذریعہ اپنی سادہ اور عملی تعلیم کے انسان کو کس مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے کتاب میں ایک نقشہ دیکر مندرجہ بالا نظریہ کو ثابت کیا ہے۔

جو حضرات کتابوں کی فرمائش کرتے وقت اس رسالہ کا نام لکھ دینگے جس میں انہوں نے یہ اشتہار پڑھا ہے تو انکو انکی مطلوبہ کتابوں کے علاوہ ایک کتاب مفت بھیجی جائیگی رسالہ کے نام کے ساتھ یہ بھی لکھنا چاہئے کہ کونسے ماہ کے رسالہ میں انہوں نے یہ اشتہار پڑھا

(تمام کتابیں - کا پتہ قاری عباس حسین ڈالنوالہ دہرہ دون

نقشہ کے عنوانات :۔ زندگی کے مختلف تعلیم وتربیت اسلام۔ اعتدال ملحوظ رکھنے کے مفید نتائج۔ نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ۴ر

آپس کی لڑائی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے درد مسلمانوں کا دل اس واقعہ پر خون کے آنسو روتا ہے چنانچہ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر قاری صاحب نے ایک رسالہ "اقل قلیل اسلام" کے نام سے لکھا ہے جس میں ملت اسلامیہ کے مختلف فرقوں میں رواداری پیدا کرنے کی تجاویز پیش کی ہیں۔ قیمت ۲ر

دلچسپ ادبیات

اگر میں مرد ہوتی؟
تو
کیا کرتی؟

ایک عجائب خانہ جذبات۔ اس میں کیا ہوتا؟ اس کا جواب آپ کو "ادبستان" نامی کتاب میں ملے گا۔ جو خاص ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں "اگر میں مرد ہوتی" کے علاوہ حسب ذیل دلچسپ مضامین بھی ہیں۔
تیرا پہلے کی شادی۔ "ہائے یہ نظریں" مجھے دیکھا کیوں؟ ہاں دیکھا؟ انسان فرشتہ کی عینک سے"۔ قیمت ۱ر

دل کا عجائب خانہ رمز شناس لوگ اس پر متفق ہیں کہ انسان کا دل بڑا پُر لطف عجائب خانہ ہے
اگر آپ اس عجائب خانہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ مختلف طبقوں کے افراد کے دلوں میں کس کس قسم کے جذبات موجزن ہوتے ہیں تو کتاب "عجائب خانہ" پڑھیے اس میں قاری صاحب نے اپنے خاص رنگ میں خدا پرستی بدی نیکی۔ پاکیزگی۔ خود پرستی۔ غرور وغیرہ کی زندگی کے مناظر دکھائے ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ چھ آنے (۶ر)

لطف زندگی قاری صاحب کے سحر نگار قلم کا نکلا ہوا ایک نہایت دلچسپ مگر مختصر قصہ قیمت دو آنے (۲ر)

قاری صاحب کی ایک نئی تصنیف جو زیر طبع ہے

کتاب تیار نہیں صرف آرڈر لئے جائینگے

ہندو دھرم اور اسلام ہر دو مذاہب کی صحیح تعلیم کا مرقع تعصب اور جہالت کا قلع قمع کر کے ہندو مسلم اتحاد کی صحیح بنیاد۔ اس اخلاقی جرأت اور نیک نیتی کے ساتھ تصنیف کی ہوئی۔ اس مضمون پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے قیمت ۱۰ر

سراب زندگی ایک صابر و شاکر خاتون کی داستان جسنے بیکسی و بے بسی کی حالت میں زمانہ ناموافق حالات کا مردانگی سے مقابلہ کیا ایک شریف لڑکی کا افسانہ غم جس کو باپ نے لالچ میں آکر ایک بری جگہ بیاہ دیا تھا عبرتناک نتائج دردناک اور پُر اثر واقعہ قیمت ۵ر

تصانیف مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری

عظیم الشان آتشزدگی دنیا آج اس بدنصیب ہستی کا ماتم کر رہی ہے جو شامت کے نام سے دنیا میں پیدا ہوئی اس کی آہ کا دھواں عالم بالا پر دھواں دھار گھٹا بنکر پہنچا فرشتوں نے اسکی آواز پر صدائے لبیک بلند کی اور آسمانی کائنات کا ذرہ ذرہ بلبلا کر رب العزت کے قدموں میں انتقام کا ملتجی ہوا اور وہ سنگدل باپ جو اصل نسل مغل اور اس خاندان کی لڑکی جس کا آنچل آنکھ فرشتوں کو دیکھنا نصیب نہوا بھرے مجمع میں اس گناہ پر کہ نکاح ثانی کیا عدالت تک گھسیٹ کر جیلخانہ پہنچانے کے بعد باغ باغ ہے وہ پتھر دل جس نے ۹ مہینہ پیٹ میں رکھنے ۲۰ برس پرورش کرنے کے بعد معصوم اور بیگناہ بچی کو یہ دیکھ کر نکاح ثانی کے جرم میں بھیجا اور بے قصور لڑکی قید کی مصیبتیں جھیل رہی ہے دو زندہ روحیں نظام دنیا کے سلسلہ میں عذاب قید سے مردوں کے قریب پہنچ چکی ہیں کہ نظام قدرت اپنا ہاتھ بلند کرتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ اس کا جواب اس کتاب میں ملیگا جو مصور غم علامہ راشد الخیری صاحب کی زبردست اور بے مثل تصنیف ہے

نوحہ زندگی کا پانچواں ایڈیشن ختم ہو چکا ہے یہ چھٹا ایڈیشن ہے اس میں آپکو ایسا قبرستان ملیگا جسمیں ایک عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور غیرت پر قربان ہونیوالی اپنے دو معصوم بچوں کو چھاتی سے لگائے گہری نیند سو رہی ہے کتاب نہیں ایک جادو ہے جسکا ہر لفظ مرثیہ ہے اور یہ حق رکھتا ہے کہ ہر ایک مسلمان اگر ممکن ہو اسکو پڑھے اور دیکھے بیوہ اور اسکی زندگی نے اسلام میں کیا صورت اختیار کی نوحہ زندگی باطل پرستوں کو حق پرستی سکھائیگی اور مسلمانوں کو بتائیگی کہ ایک مسلمان کیلئے رسم و رواج نہیں مذہب اور صرف مذہب ہی ایک چیز ہے نوحہ زندگی ظالموں کو رحم دل بنائیگی۔ قیمت ۱۲ر

درِ شہوار تیسرا ایڈیشن لوگ مولانا کو ٹریجیڈی کا بادشاہ سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ آپ گھریلو حالات اور عورتوں کے جذبات کا فوٹو اتارنے میں کامل ہیں لیکن اس کتاب میں آپکو ان دونوں باتوں کے علاوہ حسن و عشق کی چاشنی بھی ملیگی اسمیں زندان سیستان اور ایران کی لڑائیوں کے جو نقشے مولانا نے کھینچے ہیں وہ قابل قدر ہیں قیمت ۱ر

تصانیف المرتّم جناب ضیا بانو بیگم صاحبہ دہلوی

سراب زندگی ایک صابر و شاکر خاتون کی داستان جس نے بیکسی اور بے بسی کی حالت میں زمانہ کے ناموافق حالات کا مردانگی سے مقابلہ کیا ایک شریف لڑکی کا افسانہ جسکو باپ نے لالچ میں آکر ایک بری جگہ بیاہ دیا تھا۔ عبرتناک نتائج دردناک اور پُر اثر واقعہ قیمت ۵ر

تصانیف حضرت غماز

مسٹر بھاری بھرکم کی ڈائری خود غرض بیوی مجبور اختیار شوہر کی سرگذشت دلنشیں واقعات کی تشریح برجستہ بیجا ہے خود مکمل ہو اور تفنن سے لبریز قیمت صرف چھ آنے ۶ر

مسٹر مجنون ۲۶ء میں مبنی تفریح اور سنجیدہ تفنن کے دلچسپ پیرایہ میں زندگی کے ہر شعبہ پر ایک پُر کیف تنقید قیمت صرف ۶ر آنے

ارتقائے نسواں ۱۹۵۵ء میں شہر میں عورتوں کی موجودہ آزادی کیا رنگ لائیگی ایک مکمل مسئلہ کا حل قیمت ۶ر

؟
آپ نے یہ اشتہار کس ماہ کے کونسے رسالہ میں پڑھا اس کا جواب آنے پر ہم آپکی خدمت میں وُمن لٹریچر کا ایک عجیب مجموعہ مفت پیش کرینگے — منیجر تمدن بک ایجنسی دہلی

تمام کتابیں ملنے کا پتہ قاری عباس حسین ڈالمنوالہ دہرہ دون

مرتبہ

یاز فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ — بسم اللہ — جلد ۱۲۔ شمارہ ۵

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ ہندوستان میں صہ ر ہندوستان سے باہر عہ ر

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۷ء

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۲) | نومبر ۱۹۲۷ء | شمار (۵)

ملاحظات

معاصر خیابان نے اگست (اکتوبر؟) کی اشاعت میں نقطۂ نظر کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے خیابان کے فاضل مدیر کو نقطۂ نظر کی صحت میں شک تھا اس لئے انھوں نے جناب طباطبائی کو حکم بناکر اس کا فیصلہ چاہا اور صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کردیا کہ

"نظر، انگریزی کے محاورہ میں نقطہ ہو تو ہو، اردو کے محاورہ میں تار نظر اور مد نظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے، خط ہے۔ یہ خیال زبان میں فلاسفہ قدماء کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے کہ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے تار نظر نکل کر مرئیات پر پڑتا ہے، گو بعد میں یہ مذہب غلط ثابت ہوا مگر زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہو سکتا......

غرض نقطۂ نظر کہنے کی کوئی صورت ہماری محاورہ میں نہیں ہے۔ ہاں نظر کی صفت نکتہ دان، نکتہ بیں، نکتہ سنج آتی ہے اس اعتبار سے نکتۂ نظر کہنا درست ہے"

مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے سخت اختلاف ہے۔ نقطۂ نظر انگریزی کے پوائنٹ آف ویو (Point of View)

کا ترجمہ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو ہدف نظر یا منتہائے نگاہ کا ہو سکتا ہے۔ اس میں حقیقت رویت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ اس کا اثر اُس پر پڑ سکتا ہے۔

ہم جب کسی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کسی مخصوص و متعین چیز پر پڑتی ہے۔ اسی طرح جب ہم غور و فکر یا کوئی تمنا کرتے ہیں تو کوئی مخصوص امر سامنے ہوتا ہے جس کے سمجھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی مخصوص و متعین چیز یا امر کو نقطۂ نظر و خیال یا ہدف نظر و خیال کہتے ہیں۔

جناب طباطبائی نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ نقطۂ نظر میں نظر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ خیال یا تمنا ہے اور اس صورت میں نظر کے نقطہ یا خط ہونے سے بحث کرنا یا خواہ مخواہ مناظر و مرایا کے اُن مسائل کو اس کی تحقیق میں داخل کرنا جن کی حقیقت کی طرف سے شاید جناب طباطبائی خود بھی مطمئن نہ ہوئے ہوں گے بالکل دور از کار بات ہے۔ اسی کے ساتھ نکتۂ نظر کے استعمال کو درست ظاہر کرتے ہوئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ نظر کی صفت چونکہ نکتہ داں یا نکتہ سنج ہوتی ہے اس لئے نکتۂ نظر کہنا چاہئے نکتہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اسکا مفہوم یہ ہے:۔

(۱) النقطة السوداء فی الابیض (و) البیضاء فی الاسود (۲) الاثر الحاصل من نکت الارض (۳) المسئلة الدقیقة اخرجت بدقة نظر و امعان فکر۔ ظاہر ہے کہ جناب طباطبائی نے تیسرے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کیونکہ نکتہ سنجی وغیرہ اسی مفہوم سے پیدا ہے۔ لیکن فاضل حکم کی نگاہ اس طرف نہیں گئی کہ لفظ نکتہ اسم ہے اور جب تک کوئی لفظ مصدری معنے کا نظر کے ساتھ مضاف نہ ہو۔ نکتہ سنجی وغیرہ کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر بجائے نکتۂ نظر کے نکتہ سنجی نظر، دقت نظر کہیں تو بیشک درست ہو سکتا ہے۔

اب لفظ نقطہ کے مختلف محل استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی میں اس کو انگریزی کے لفظ (Point) کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ (Point of differen[ce]) کا ترجمہ نقطة الاختلاف اور (Point of Weakness) کا نقطة الضعف زبان عربی میں رائج و مستعمل ہے۔ حالانکہ جناب طباطبائی کی تحقیق کے مطابق اس کو بھی غلط ہونا چاہئے کیونکہ ضعف یا اختلاف میں حقیقتاً نہ کہیں نقطہ کا وجود پایا جاتا ہے نہ خط کا

میں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مبادا نگار کے حلقہ میں غلطی یا غلط فہمی سے نکتۂ نظر کا رواج ہو جائے۔

چونکہ جنوری ۱۹۲۸ء کے رسالہ میں مومن کے متعلق ایک سے زائد تنقیدی مقالات شائع ہوں گے اور اسی کے ساتھ دیگر مضامین بھی ہوں گے اس لئے اُس کی ضخامت کا بڑھ جانا یقینی ہے اور یہ حجم غالباً ۱۵۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ لیکن باوجود اس کے خریداران نگار سے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید کوئی زائد قیمت نہ لی جائیگی، البتہ وہ حضرات جو نگار

کے خریدار نہیں ہیں اور صرف یہی رسالہ چاہیں گے اُن کو علاوہ محصول ایک روپیہ دینا ہوگا۔

منیجر نگار نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے خریداروں کو جذبات بھاشا بھی بالکل مفت دیجائے گی۔ وہ حضرات جن کا چندہ نومبر یا دسمبر میں ختم ہورہا ہے اُن کو صفحہ ۷۶ کا اعلان دیکھ کر اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس مہینے کے رسالہ میں میر شیر علی افسوس پر جناب سید محمد قادری بی اے نے اچھا مضمون لکھا ہے اس نوع کے مضامین اردو ادب کی بہترین خدمت شمار کئے جاتے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی کی ایک مثنوی پر حضرت ہوش نے اپنے مخصوص انداز میں کافی داد بیان دی ہے انھیں منیر کے دیگر اصناف سخن پر بھی توجہ کرنی چاہئے۔

"دھتیا" جناب مجنوں کا ایک ایسا افسانہ ہے جس پر اُن کو فخر کرنا چاہئے یہ فسانہ بلحاظ جذبات، انداز بیان بلکہ تجزیۂ سیرت، فلسفۂ اثر و تاثر اور نظریۂ فعل و انفعال کے لحاظ سے بھی ایک ایسی چیز ہے جو اردو فسانہ نگاری کی طرف سے بہترین نمونہ کی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ پلاٹ کے متعلق البتہ مجھے ایک جگہ کلام ہے، جوتشی کی پیشین گوئی کہ "سرلا اپنے شوہر کو بھی قتل کرے گی" جس انداز سے فسانہ میں پوری کرکے دکھائی گئی ہے وہ میرے نزدیک قابل اصلاح ہے۔ قتل کا وقوع اس طرح بھی ہوسکتا تھا کہ سرلا اُس کا قصد و اہتمام نہ کرتی، یا پھر اس سے پہلے اس کی دماغی حالت میں مخصوص اضطراب و ہیجان دکھانا چاہئے تھا جو ہندوستان کی ایک دہقانی عورت کی طرف سے اس حرکت کو ممکن الوقوع بنادیتا۔

شادی کا مضمون اجتماعی نقطۂ نظر سے اور ہندوستان کی معاشیات، اقتصادی زاویہ نگاہ سے قابل قدر مضامین ہیں۔

ارتقاء حقیقت، ہارڈی کی ایک نظم کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے گو لفظی نہیں ہے۔ تعین بحر اور تقسیم اوزان میں جناب فراق نے نہایت دلچسپ جدت سے کام لیا ہے۔

اعتراف کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی ہے وہ اسی قسم کی ہے جسمیں شاعر بے اختیارانہ لیکن کہیں کہیں نامناسب طور پر شعر کی حقیقت سے زیادہ اپنے آپ کو ظاہر کرجاتا ہے۔ جناب روش بہت ذہین کہنے والے ہیں۔

غزلیں یوں تو سب خوب ہیں لیکن جناب راز رامپوری کی غزل کا پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر، جناب حافظ غازیپوری کا چوتھا چھٹا شعر۔ جگر بریلوی کا پہلا، چوتھا، چھٹا اور آخری شعر، جناب فرخ بنارسی کا آٹھواں، بارھواں شعر، اور ثمر دربھنگوی کا چھٹا شعر خصوصیت کے ساتھ مجھے پسند آیا۔

نیاز فتحپوری

میر شیر علی افسوسؔ

عام طور پر اردو نثر کی ابتدا بارہویں صدی ہجری سے سمجھی جاتی ہے اور فضلی کی "دہ مجلس" کو جو محمد شاہ کے عہد حکومت میں ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی، اردو نثر کی پہلی کتاب بیان کیا جاتا ہے[1]۔ لیکن اردو نثر کا آغاز اس سے کئی سو سال پیشتر ہی ہو چکا تھا اور "دہ مجلس" سے قبل اردو نثر میں بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ جس طرح اردو نظم کی ابتدا دکن سے ہوئی، اردو نثر کی پہلی کتابیں بھی دکن ہی میں لکھی گئیں۔ آٹھویں صدی ہجری کے ختم ہونے سے تقریباً تیس سال قبل حضرت شیخ عین الدین گنج العلم رح (المتوفی ۷۹۵ھ) کے رسالے، حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز (المتوفی ۸۲۵ھ) کا رسالہ معراج العاشقین اور دیگر رسائل لکھے جا چکے تھے۔

حضرت گنج العلمؒ کے رسالے مذہبی احکام و مسائل کے متعلق ہیں اور ان کا ایک مجموعہ مدراس کے قلعہ سینٹ جارج کی کالج لائبریری میں موجود تھا۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی کتاب "معراج العاشقین" بھی تصوف میں ہے۔ اور مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کے دیباچہ کے ساتھ حیدرآباد کے تاج پریس سے شائع ہو چکی ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ بادشاہ گولکنڈا (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانہ میں ایک بزرگ مولانا وجہی گزرے ہیں ان کی سکونت گولکنڈہ میں تھی اور وہ شاہی دربار سے متوسل تھے ۱۰۴۵ھ میں انھوں نے ایک کتاب "سب رس" کے نام سے نثر اردو میں لکھی ہے۔ اس کی عبارت اول سے آخر تک مسجع و مقفٰے ہے۔ اور غالباً مولانا وجہی نے ملا ظہوری کی سہ نثر کا تتبع کیا ہے "سب رس" کی بنیاد فارسی کے ایک چھوٹے سے فسانہ "حسن و دل" پر ہے مگر مولانا وجہی نے اس کے ضمن میں اخلاق و تصوف، پند و موعظت کے بہت سے نکات بیان کئے ہیں، جسکے باعث یہ ایک ضخیم کتاب ہو گئی ہے[2]۔

"سب رس" اور "دہ مجلس" کے درمیان تقریباً ایک سو سال کا فصل ہے۔ اس عرصہ میں دکن میں بہت سی نثر کی کتابیں لکھی گئیں مگر ان پر بحث کرنا اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ "سب رس" کا طرز بیان دہ مجلس سے زیادہ سلیس ہے اور اگر بعض مخصوص دکھنی الفاظ کو نکال دیا جائے تو "سب رس" کی زبان "دہ مجلس" کی زبان سے زیادہ صاف و شستہ معلوم ہوتی ہے۔

شمالی ہند میں نثر یونہی ایک عرصہ دراز تک جمود کی حالت میں رہی اور پچاس ساٹھ سال کی مدت میں دو چار سے زیادہ نثری کارنامے سرانجام نہ ہو سکے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے افتتاح کے ساتھ اردو نثر نویسی کا حقیقی معنوں میں آغاز ہوا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ اور دیگر اردو دان انگریزوں کی سرپرستی نے ہندوستان کے بہترین مصنفوں اور ادیبوں کو کلکتہ میں جمع کر دیا۔ اور انکی مساعی جمیلہ سے بہت جلد اردو زبان میں نثری کتابوں کا ذخیرہ فراہم ہونے لگا۔

---

[1] سیر المصنفین از محمد یحییٰ تنہا صہ ۴۲
[2] اردوئے قدیم از سید شمس اللہ قادری حیدرآبادی ۱۹۳۰ء وغیرہ

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد کچھ زیادہ شاندار نہ تھا۔ اس کے بانی صرف یہ چاہتے تھے کہ جو انگریز ہندوستان میں مختلف عہدوں پر مقرر کر کے روانہ کئے جاتے ہیں، ان کا ملکی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ حکمرانی اچھی طرح ہو سکے اور ایسا نہ ہو "زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم" انگریزی زبان کو جو حاکم قوم کی زبان تھی ہندوستان میں پھیلانے اور باشندگانِ ہند کو اس میں ماہر بنا کر اپنی اغراض ملازمت پوری کرانے کا کام اس زمانہ میں بدرجہا دشوار تھا۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ مٹھی بھر والیتی حاکم ملک کی عام زبان سے آشنا ہو جائیں تو کسی نہ کسی طرح کاربراری ہو جائیگی۔ اس خیال سے ہندوستان کی زبانوں پر نظر ڈالی گئی تو کوئی زبان اردو کی طرح ملک کے طول و عرض میں دائر و سائر نہ دکھائی دی مگر اس کے لٹریچر کو دیکھا تو بجز نظم کے اور کچھ نہ پایا۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے یہ طے کیا کہ چند مستند علما کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے تصنیف و تالیف کا کام لیا جائے۔ نیز درس و تدریس انھیں کے ذریعہ کرائی جائے اس طرح اردو کو اغیار کی سرپرستی حاصل ہو گئی؛ وہ وجہ اس کی اساسی تحریک کے بانی قرار پائے۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔

اہل قلم اور مؤلفین کا انتظام کرنے کے بعد ایک اور سوال یہ درپیش ہوا کہ مستقل کتابیں لکھوائی جائیں فارسی و ہندی کی عام فہم اور مقبول کتابوں کا ترجمہ کرایا جائے؟ آسان کام اور سہل طریقہ ترجمہ کا تھا۔ چنانچہ فارسی و ہندی کی چیدہ چیدہ کتب کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا اور جن مضامین پر جیسے قواعد زبان، لغت، اور نظم میں مستقل تصانیف یا تصحیح کی ضرورت تھی ابتدائی رسالے لکھوائے گئے اور قدیم اساتذہ کے دواوین کا انتخاب و تصحیح عمل میں آئی۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج کی طرف سے کئی ایک دیوان بھی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفین میں میر شیر علی افسوس اپنے ترجمۂ گلستان کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔ افسوس سید علی مظفر خان کے بیٹے اور سید غلام مصطفیٰ خان کے پوتے تھے ان کے آبا و اجداد خواف[1] کے رہنے والے اور حضرت امام جعفر صادق رضہ کی اولاد سے تھے اور ان کے ایک جد اعلیٰ سید بدر الدین اور ان کے بھائی سید عالم الدین حاجی خان ابتداً ہندوستان میں وارد ہوئے اور آگرہ کے قریب قصبہ نارنول میں توطن اختیار کیا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) میں افسوس کے دادا اپنے دونوں بیٹوں سید علی مظفر خان اور سید غلام علی خان کو لیکر دہلی آئے اور تینوں نے نواب عمدۃ الملک امیر خان[2] کی ملازمت اختیار کر لی اسی زمانہ میں شیر علی افسوس دہلی میں پیدا ہوئے ان کا سنہ ولادت معلوم نہیں مگر ان کی پیدائش ۱۱۵۹ھ سے دو چار سال قبل کی ہوگی کیونکہ جیسا کہ خود افسوس نے لکھا ہے نواب عمدۃ الملک کی وفات کے تین چار سال بعد ان کے والد کے تلاش معاش کو نکلنے کے وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی عمدۃ الملک نے ۱۱۵۹ھ میں انتقال کیا اور اس لحاظ سے افسوس کی ولادت ۱۱۴۵ھ سے قبل کی ہونی چاہئے۔

---

[1] باغ اردو کے قدیم نسخہ مطبوعہ ۱۲۲۸ھ میں خواف کو خاف لکھا ہے نیز ایک قلمی مسودہ میں بھی املا ہے۔

[2] نواب امیر خان عمدۃ الملک المتخلص بہ انجام عہد محمد شاہی کے نامور امیر تھے اور محمد شاہ بادشاہ کے جلیس و ہم نشین۔ بادشاہ کے مزاج پر اس قدر تسلط حاصل تھا کہ دوسرے امرا و اعیان سلطنت ان کی قربت پر رشک و حسد کرتے تھے۔ آخر الامر حاسدوں کی چلی کٹی باتوں نے بادشاہ کا مزاج متغیر کر دیا اور بیچارے اپنے ہی ایک نمک حرام نوکر کے ہاتھ بادشاہ کے ایما سے ۱۱۵۹ھ میں قتل ہوئے انجام فارسی اور اردو شعر گوئی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور دہلی اور کرناٹک کے کئی میر تو استاد تھے۔ (تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۱۴)۔

افسوس کے والد اور چچا دونوں ایک عرصہ تک عمدۃ الملک کے ساتھ رہے۔ خصوصاً سید غلام علی خاں اپنی کارکردگی و معاملہ فہمی کی بدولت بہت جلد صاحب اقتدار ہو گئے اور جب ۱۱۶۲ھ میں عمدۃ الملک نے وفات پائی تو وہی منصرمانہ طور پر الہ آباد کے صوبہ دار بنا گئے ادھر محمد شاہ کی سلطنت برہم ہوئی اور عمدۃ الملک نے بھی وفات پائی اور چند روز بعد ہی غلام علی خاں بھی راہی ملک عدم ہوئے نہ اگلا سا زمانہ رہا اور نہ پہلے سے مربی۔ علی مظفر خاں ترک ملازمت کر کے چند سال خانہ نشین رہے اس کے بعد تلاش معاش کے لئے میر قاسم علی خاں نواب بنگالہ کے پایہ تخت پٹنہ کا رخ کیا اور یہاں پہنچ کر اس کے ہاں ملازمت کر لی اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ میر قاسم علی خان کے انتقال کے بعد اس کے جانشین جعفر علی خاں کی ماتحتی میں اس خدمت کے علاوہ اور بھی کسی عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۱۷۷ھ میں اس کے معزول ہونے تک اسی کے توسل سے رہے جس وقت افسوس کے والد نے پٹنہ کا رخ کیا، افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی اور گلستاں پڑھتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں "سیر دیوان دلی کی اکثر کرتا۔ طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعر اوقات مذکورہ میں بوضع تدراکیے تھے۔ یہ مطلع انہی میں سے ہے بیت

ارے پیارے ترے اس حسن رنگین کا خدا حافظ

تری اس زلف پر چین کا محمد مصطفےٰ حافظ [۱]

جعفر علی خان کو معزولی کے بعد پٹنہ سے نکل کر علی مظفر خاں نے نواب خان عالم بقاء اللہ خاں کی وساطت سے نواب شجاع الدولہ والی اودھ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء) کی سرکار میں تین سو روپیہ کا ملازم کرا دیا لیکن تین چار سال لکھنؤ میں رہنے کے بعد جب ملازمت کچھ پائیدار نظر نہ آئی تو دکن کا رخ کیا اور حیدرآباد جا پہنچے کئی سال حیدرآباد میں رہکر وہیں انتقال کیا۔

افسوس اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے بھتیجے نواب سالار جنگ کے ہاں ملازم ہو چکے تھے۔ اور ان کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں المخاطب بہ سرفراز جنگ کی اتالیقی کی خدمت اُن کے سپرد کی گئی تھی، افسوس نے اپنا دیوان سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد سرفراز جنگ نے اپنے حوصلہ کے موافق انکی قدردانی کی ان دنوں مرزا جوان بخت جہاندار شاہ ولیعہد سلطنت مغلیہ لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ انھوں نے جب افسوس کا کلام سنا تو ازراہ قدردانی طلب کر کے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ افسوس نے اس بے فکری کے زمانہ میں عربی کی تحصیل کی اور کتب متداولہ پر کافی عبور حاصل کر لیا۔

لکھنؤ اس زمانہ میں شعرا علما و فضلا کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، جرات، انشا وغیرہ شعرا کی صحبتوں نے افسوس کو بہت جلد ممتاز درجہ پر پہنچا دیا وہ اکثر ان اساتذہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور تحسین و آفرین کا صلہ حاصل کرتے تھے۔

---

[۱] باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۵۱ھ دیباچہ ص۹

[۲] مرزا جوان بخت جہاندار شاہ، تخلص جہاندار، شاہ عالم کے ولی عہد تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے آصف الدولہ نے بڑے عز و اکرام سے رکھا اور ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ شعرا کے بڑے قدردان گزرے ہیں اور خود بھی شعر گوئی کا چسکا رکھتے تھے۔ ۱۲۰۲ھ بنارس میں انتقال کیا۔ تذکرہ گلشن ہند ص۵۔

مرزا جواں بخت کو بھی افسوس کا کلام بہت پسند آیا اور انھوں نے ان کو اپنی بزم کا شاعر بنا لیا۔ افسوس کا یہ زمانہ نہایت فراغت اور لطف کیساتھ گزرا۔ جب شہزادہ جواں بخت نے دہلی کا ارادہ کیا تو افسوس کو بھی ساتھ لیجانا چاہا مگر افسوس نے لکھنؤ کی پرلطف صحبتیں چھوڑ کر اُجڑی ہوئی دلی میں جاکر رہنا پسند نہ کیا اور معذرت کر کے یہیں رہے۔

شہزادہ جواں بخت کے بعد نواب آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ) کے نائب حسن رضا خان المخاطب بہ سرفراز الدولہ نے افسوس کی سرپرستی کی اور اپنی داد و دہش سے فکر معاش سے مستغنی کر دیا۔ یہ سرفراز الدولہ وہی ہیں جن کی مرزا رفیع سودا نے مدح سرائی کی ہے۔ کلیات سودا میں دو قصیدے، ان کی مدح میں موجود ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں[۵۱]:-

صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام　　حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

ہے یہ عقل کو سودا کی بھی جدائی شاق　　سو اس کنے نہ پھر آیا ہے بسکہ تھا مشتاق

حسن رضا خاں نے افسوس کو کوئی خاص خدمت سپرد نہیں کی تھی بلکہ ایک قابل فرد کی تربیت کے خیال سے انکی سرپرستی کرتے تھے۔

افسوس نے شہزادہ جواں بخت کے دہلی چلے جانے اور لکھنؤ کے اساتذہ کے اٹھ جانے سے شاعری کا مشغلہ قریب قریب ترک کر دیا تھا اور ان دنوں انکا کام درس و تدریس تھا۔

انھی ایام میں انگریزی حکام کو فورٹ ولیم کالج کے لئے لایق منشیوں کی ضرورت داعی ہوئی اور وہ ان کی تلاش و انتخاب کرنے لگے اس سلسلہ میں میر تقی میر سے ملازمت کی خواہش کی گئی مگر خود دار "سرتاج شعرائے اردو" نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۰ء میں افسوس کا کرنل اسکاٹ سے تعارف کرایا اور انکی فضیلت علمی اور بلند پایہ کلام کی بے حد تعریف کی۔ کرنل اسکاٹ نے کلام سنا تو بے حد محظوظ ہوے اور فی الفور انکا انتخاب کر کے کلکتہ بھیجدیا۔

افسوس نے جیسا کہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے، قدیم ذکر کی شاعری سے تنگ آکر فکر سخن ترک کر دی تھی اور درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نیز لکھنؤ کے معاشرتی و اقتصادی حالات نے لکھنؤ سے اُن کی وابستگی اٹھا دی۔ اس لئے "صاحبان عالیشان" کی نوکری کو غنیمت سمجھا اور سیدھے کلکتہ کی راہ لی۔ کلکتہ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ نے جو خود کئی کتابوں کے مصنف اور مشہور اہل قلم تھے اُن کی قابلیت کا اعتراف کر کے دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر تصنیف و تالیف کے لئے مقرر کیا۔ افسوس نے کلکتہ میں کوئی آٹھ نو سال تصنیف و تالیف کا کام کر کے سنہ ۱۸۰۹ء میں وفات پائی۔ بیل نے اپنی کتاب میں افسوس کا سنہ وفات ۱۸۰۶ء بتایا ہے[۵۲] مگر گارساں دی تاسی اور تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے سنہ ۱۸۰۹ء لکھا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

مرزا علی لطف صاحب تذکرہ گلشن ہند افسوس کے نہ صرف معاصر بلکہ قدیمی دوست تھے انھوں نے اپنے تذکرہ میں افسوس کا سرسری سا

۵۱ کلیات سودا مطبوعہ نولکشور پریس ص ۱۳۱ و ص ۱۳۳

۵۲ بیوگرافیکل ڈکشنری از مسٹر بیل ص ۲۵ طبع دوم

حال لکھا ہے ان کا بیان بلحاظ ہمعصری چشمدید زیادہ قابل سند ہے مگر تاریخ ولادت ان کے ہاں بھی نہیں ہے اور چونکہ یہ تذکرہ ۱۸۰۱ء کا لکھا ہوا ہے اور اسوقت افسوس بقید حیات تھے اس لئے تاریخ وفات بھی اس میں نہیں ملسکتی افسوس نے لکھنؤ سے نکل کر پہلے مرشدآباد میں مرزا علی لطف کے ہاں چند روز قیام کیا اور ان سے بھی کلکتہ آنے کا وعدہ کیا۔ اغلب ہے کہ مرزا علی لطف انہی کے ایما سے کلکتہ آئے اور ڈاکٹر گل کرائسٹ کی نگرانی میں اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ لطف نے افسوس کے حالات بیان کرنے کے بعد یہ ریمارک کیا ہے جو ایک معاصر کے قلم کا ہونے کی وجہ سے نہایت معتبر و مستند ہے "فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانہ کے انتخاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکسار میں فرد کامل ہیں منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی ماہر ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں اقسام نظم میں" (گلشن ہند ص۱۹)

قیام کلکتہ کے زمانہ میں افسوس نے دو کتابیں مرتب کی ہیں ایک "باغ اردو" اور دوسری "آرائش محفل" اس کے علاوہ تصحیح و نظرثانی کا بہت سا کام کیا جس کی تفصیل آگے آئیگی اب ہم بلحاظ تاریخ انکی مولفات کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

دیوان افسوس نے اپنا دیوان لکھنؤ میں سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا اس لحاظ سے وہ ان کا پہلا کارنامہ ہے۔ نساخ نے لکھا ہے کہ شاعری میں افسوس کو میر حیدر علی حیران اور میر سوز سے تلمذ حاصل تھا[۵۱]۔ صاحب تذکرۂ گلشن ہند جو افسوس کے معاصر اور دوست تھے ان کے تلمذ کے متعلق لکھتے ہیں "اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے اور علی ابراہیم خاں[۵۲] مرحوم نے شاگرد اُن کو میر حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی[۵۳]" افسوس کا دیوان جملہ اصناف سخن پر مشتمل ہے اور عام دواوین کی طرح حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قصاید کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر قصیدے آنحضرت صلعم کی تعریف میں ہیں باقی نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) اور مارکوئیس ویلزلی گورنر جنرل ہندوستان (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) کی مدح میں ہیں۔ اس کے بعد چند سلام اور مرثیے دے ہوئے ہیں۔ دیوان کا دوسرا حصہ غزلیات کا ہے جسمیں حروف تہجی کی ترتیب پر تمام غزلیں لکھی گئی ہیں۔ غزلیات کے بعد چند مخمسات، رباعیات، ایک ترکیب بند اور ایک واسوخت ہے۔ اور سب سے آخر میں گیارہ قطعات کا مجموعہ ہے جس میں سے پہلے تین قطعے شہزادہ جوان بخت کی شادی، سفر شکار اور تہنیت عید کی تاریخ میں ہیں باقی آٹھ قطعوں میں مارکوئیس ویلزلی اور فورٹ ولیم کالج کے بعض پروفیسروں کی مدح ہے۔ ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ افسوس کا دیوان کن مطابع سے شائع ہوا ہے۔ مولوی سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر نے ۱۹۰۳ء میں "مختار اشعار" کے نام سے انتخاب شعرائے اردو کا ایک سلسلہ مدراس یونیورسٹی کے لئے قائم کیا تھا۔ اس سلسلہ میں قائم چاندپوری اور افسوس وغیرہ کے دواوین کے انتخابات شائع ہوئے ہیں۔ یہ انتخاب مولوی سید حسین بلگرامی کے کئے ہوئے ہیں۔ افسوس کے دیوان کا انتخاب بھی مولوی صاحب

---

۵۱ تذکرہ سخن شعرا - از عبد الغفور خاں نساخ ص۳۹
۵۲ علی ابراہیم خاں خلیل ساکن پٹنہ مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ
۵۳ تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی لطف مولفہ ۱۸۰۱ء ص۳۲

موصوف نے کیا تھا۔ آج کل اس کے نسخے نایاب ہیں ہمارے دوست مولوی عمر یافعی صاحب کے ہاں ۱۹۰۳ء کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک قدیم قلمی نسخہ ہے جو ہر طرح مکمل اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس میں سب اصناف سخن مذکورۂ بالا ترتیب پر دیے ہوئے ہیں اور قصاید سے پہلے فارسی میں بطور مقدمہ افسوس کے حالات بھی لکھے ہیں حالات تقریباً وہی ہیں جو خود افسوس نے اپنی "باغ اردو" کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ یہ مقدمہ میر حیدر بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آرائش محفل کی تالیف ۱۲۲۰ھ تا ۱۸۰۵ء سے قبل کا ہے کیونکہ اس میں افسوس کی اس تالیف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

سلسلۂ "مختار اشعار" کا انتخاب دیوان افسوس، حکیم سید محمد علی عرش نے شرح کیا تھا قاسم پریس حیدرآباد میں طبع کرایا تھا۔ میرے پاس اس کا ایک نسخہ ہے اس پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افسوس نے شاعری بالکل قدیم اساتذہ کے ڈھنگ کی ہے وہی خیالات اور وہی انداز بیان ہے۔ بعض بعض جگہ قدیم الفاظ جیسے "تک بمعنے ذرا، تلک، ٹک، ایے چیز بمعنے بسبب، وغیرہ بھی ہیں تذکرہ گلشن ہند اور تذکرہ سخن شعرا میں بھی افسوس کے بیس پچیس اشعار نمونتاً مندرج ہیں میرے پاس کے دیوان کے بعض شعر یہ ہیں۔ ان سے شاعر کا انداز کلام اور اسکا مرتبہ ظاہر ہو جائیگا۔

نہ ساقی ہے، نہ مینا ہے، نہ بر میں یار جانی ہے   حقیقت میں نہیں جیتے بصورت زندگانی ہے

ہوا کوٹھے پہ جو تھی جلوہ گر وہ برق وش دو بہی   کہا اک خلق نے دیکھو یہ آفت آسمانی ہے

نوازش پر مزاج آیا جہاں دی گالیاں مجھکو   کرم ہے آپکا خاطر عجائب مہربانی ہے

مرا زخم جگر جراح سے سلوائیں کیوں ہمدم   کسی شمشیر زن کے ہاتھ کی یہ تو نشانی ہے

سنو ٹک گوش دل سے قصہ جانسوز کو میرے   کہ جگ بیتی نہیں ہے آپ بیتی یہ کہانی ہے

عبث ہے سوچ تجھکو، نامہ بر دے شوق سے مجھکو   کوئی جھڑکی کوئی گالی اگر اسکی زبانی ہے

تو اپنے ہاتھ کا چھلا جو ہر اک سے چھپاتا ہے   بتا افسوس کس پردہ نشین کی یہ نشانی ہے

نالوں میں کبھی نہ دیکھی تاثیر   آہوں میں کبھی اثر نہ دیکھا

عرصۂ عمر بہت کم ہے دلا گل کی طرح   چمن دہر میں دن کاٹ تو ہنسکر اپنا

جی ہو کے تنگ سخت گھبرایا ہے   رکنا مرا ناک میں دم آیا ہے

روتا ہوں تری گلی میں دلکو کھو کر   کیا ہنستا ہے، کچھ تو نے پڑا پایا ہے

مصطفےٰ خاں شیفتہ نے افسوس کے یہ اشعار اپنے تذکرہ میں انتخاب کئے ہیں۔

قفس سے چھوٹنے کی امید ہی نہیں افسوس　　　حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

کیا لکھوں اسکو میں احوال یہ کہنا قاصد　　　بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں

دیکھتے ہی اسے حاضر ہوئے مرجانے کو　　　وہ جو اشخاص جو یاں آئے تھے سمجھانے کو

کیوں نہ ہو اسقدر گھمنڈ اس بت پُر غرور کو　　　صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو

اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی ہو　　　دیکھیے آگے آگے کیا ہوئے

صورت تجھے حق نے دی پری سی　　　پر آدمیت نہ دی ذری سی

کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف　　　مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

(تذکرہ گلشن بیخار صہ[۴۹])

باغ اُردو یہ افسوس کا شاہکار اور مقبول و معروف کارنامہ ہے اور سچ پوچھو تو آج کل انکا نام اسی سے زندہ ہے۔ یہ حضرت شیخ سعدیؒ (۱۱۸۴ھ تا ۱۲۹۱ھ) کی مقبول خاص و عام کتاب گلستان کا ترجمہ ہے اس کے ترجمہ کی تقریب خود افسوس نے اس طرح لکھی ہے "ایک دن صاحب موصوف (ڈاکٹر گل کرائسٹ) نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کرنے نے دھیان کیا کہ عبارت اسکی بظاہر صاف و باطن پیچیدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور البتہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی مصرع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سر عجز آگے دھروں پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل سمجھا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کروں۔ اگر بخوبی سرانجام ہوئی اور اہل معنی کو پسند پڑی تو فبہا والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہونگا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و عقلا و شعرا کہ یہاں تھے اُن کے پسند پڑا۔ تب اس ضعیف نے کمر ہمت بقوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔"[۵۱] "باغ اردو" اس کا تاریخی نام ہے اور اس سے خود افسوس نے لکھا ہے کہ تاریخ آغاز نکلتی ہے چنانچہ دیباچہ میں یہ قطعہ دیا ہوا ہے۔

میں تاریخ اسکی جوں چاہا معہ نام　　　کہوں دلچسپ یہ آئین نیکو

کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا　　　ہے آغاز اُردو سے "باغ اردو"

"باغ اردو" سے ۱۲۱۴ھ نکلتا ہے۔ اسی دیباچہ میں افسوس نے ایک جگہ اپنی تقریب ملازمت کا ذکر یوں کیا ہے "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کہ وہی سترہویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ تھی اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا۔"[۵۲] جب افسوس ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ آئے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے ۱۲۱۴ھ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم سے یہ کام شروع کیا۔

---

۵۱ باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۵۱ھ دیباچہ صہ ۱۲

۵۲ باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۵۱ھ دیباچہ صہ ۱۱

ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر کبھی ۱۲۱۳ھ میں اس خیال کی بنیاد ڈالی تھی اور چونکہ وہ شعر گوئی سے متنفر ہوکر درس تدریس کی طرف مائل ہو چکے تھے ممکن ہے انھوں نے کچھ ترجمہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں شروع کر دیا ہو اور پھر اُسے مشکل اور اپنے بس سے باہر کا کام سمجھکر چھوڑ دیا — غرض اس کتاب کے ترجمہ کا سنہ آغاز ۱۲۱۳ھ ہے اور خود افسوس نے اُسکو اپنے اہتمام سے ۱۲۱۵ھ تا ۱۸۰۲ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ سیر المصنفین کے مولف نے باوجود اوپر کا قطعۂ تاریخ اپنی کتاب میں نقل کرنے کے "باغ اردو" کا سنہ تالیف ۱۸۰۱ء بتایا ہے[۵۱] نیز مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے ایک جگہ یہی سنہ بتایا ہے[۵۲]۔ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ افسوس نے ۱۸۰۱ء سے بہت قبل "باغ اردو" اور "آرائش محفل" کا کام ختم کرکے دوسری کتابوں کی تصحیح دنظر ثانی شروع کر دی تھی علاوہ ازیں خاتمۃ الکتاب میں افسوس نے صاف تلوار پر لکھ دیا ہے کہ سن ہجری بارہ سے سولہ اور عیسوی اٹھارہ سو دو میں یہ ترجمہ کہ مسمی بہ باغ اردو ہے تمام ہوا اور اس کے بعد یہ قطعۂ تاریخ دیا ہے ۔

عونِ توفیق ربِ سبحاں سے　　　ترجمہ یہ کیا تمام میں نے جب
ختم کی اس کے پیرِ عقل سے کی　　　میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا　　　باغ اردو ہوئی گلستاں اب[۵۳]

نیز اسوقت ہمارے پیش نظر جو نسخہ کلکتہ کا مطبوعہ سنہ ۱۲۵۱ھ کا ہے اس میں ناشر نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ خود افسوس نے سنہ ۱۲۱۶ھ تا سنہ ۱۸۰۱ء میں طبع کرایا تھا۔ افسوس کی یہ کتاب آج کل بالکل نایاب ہے اور سیر المصنفین کے مولف کو باوجود تلاش و سعی بلیغ کے ایک نسخہ بھی حاصل نہ ہو سکا اور نہ کہیں اس کا پتہ چلا ان کا بیان ہے کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں انھوں نے اس کا ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا۔ افسوس کہ وہ بھی انھیں دستیاب نہ ہوا[۵۴] ہمارے پیش نظر اسوقت جو نسخہ ہے وہ سنہ ۱۲۵۱ھ میں کلکتہ کا چھپا ہوا ہے اور کلکتہ کی قدیم مطبوعہ کتابوں کی طرح ٹائپ کے حروف پر ہے یہ نسخہ بالکل مکمل اور اچھی حالت میں ہے صرف دیباچہ کے چار صفحوں کا کسی قدر حاشیہ کرم خوردہ ہے ۔

باغ اردو کی ترتیب حسب ذیل ہے :-

۱ - احوال رسم خط - اس عنوان سے افسوس نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے رسالہ رسم خط و اعراب کا خلاصہ لکھا ہے ۔

۲ - پہلا دیباچہ "تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذروں میں کتاب کے" اس میں افسوس نے اپنے مربی لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کی مدح کی ہے اور سرسری طور پر اپنے حالات لکھکر ترجمہ کی مشکلات کا ذکر اور صاحبان فہم کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا عذر کیا ہے ۔

۳ - ترجمہ - دیباچہ شیخ سعدی رح

۴ - ترجمہ متن گلستان مشتمل بر ہشت ابواب

---

۵۱ سیر المصنفین از تنہا صـ۸۰

۵۲ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند صـ۲

۵۳ "باغ اردو" مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۲۵۱ھ صـ۳۲۷

۵۴ سیر المصنفین از تنہا صـ۸۱

ترجمہ خاتمہ اصل کتاب

خاتمہ باغ اردو کا

"چند سطور بعضے عذروں میں اور فایدوں میں" اس خاتمہ میں اپنے ترجمہ کے طریقہ پر بحث کی ہے۔

"چند سطریں شیخ مرحوم کے احوال میں" اس میں شیخ سعدیؒ کے حالات اور ان کے بعد حضرت امیر خسرو کا ذکر خیر اور شعرا کی قدر دانی کا بیان اور التماس علی دین ملوکہم کی تشریح لکھی ہے۔

فایدہ۔ اس میں اردو زبان میں تصنیف، تالیف کا کام کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے ان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مولف و مصنف کے لئے بھاکا، فارسی، عربی، قدرے سنسکرت اور ترکی کا جاننا ضروری ہے۔ نیز بلاغت اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔

اردو زبان میں گلستان کے ایک دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں ان کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہم ٹھیک طور پر موازنہ کر کے نہیں کہ سکتے کہ افسوس کا ترجمہ بہترین ہے یا نہیں لیکن صرف ان کے ترجمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ افسوس نے گلستاں کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ نثر سلیس و صاف ہو۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور ان کا ترجمہ ان کے اپنے زمانہ کی اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ گلستاں میں جا بجا برمحل اشعار بہ کثرت دے ہوئے ہیں ان اشعار کا اگر نثر میں ترجمہ کیا جائے تو ان کی اصلی خوبی بالکل غائب ہو جاتی ہے اور شیخ سعدیؒ کے بعض مصرعے اور شعر ایسے اچھوتے، نفیس اور زبان زد و عام ہیں کہ وہ کسی طرح ترجمہ کے متحمل ہی نہیں۔ افسوس نے ایسے مصرعوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ان کے حسن و خوبی کو خراب نہیں کیا اور انھیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے۔ افسوس کا طرز بیان میر امن دہلوی سے زیادہ گنجلک ہے اس میں میر امن کے بیان کا سارا لوچ اور بے ساختہ پن نہیں میر امن کی زبان بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں روزمرہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی اس کے برخلاف افسوس کی زبان میں سلاست و صفائی کے ساتھ سنجیدگی و عظمت پائی جاتی ہے۔ وہ عربی و فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور اس خصوص میں سید حیدر بخش حیدری سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مثال کے طور پر ان کے ترجمہ کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں۔

گلستاں

حکایت:- یکی از دوستاں را گفتم امتناع سخن گفتنم بعلت آن اختیار آمدہ است کہ غالب اوقات در سخن نیک و بد اتفاق افتد و دیدہ دشمناں جز بر بدی نمی آید۔ گفت دشمن آن بہ کہ نیکی نہ بیند۔

باغ اردو

حکایت:- ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب سے اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے اور آنکھ دشمن کی سوائے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی۔ بولا وہ کہ اے برادر دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔

شعر:- ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے ست — گل ست سعدی ودر نظر دشمناں خار است

بیت:- نور گیتی فروز چشمہ ہور — زشت باشد بچشم موشک کور

شعر:- واٰخو القذاذۃ لا یمر بصالح — الا ویلمزہ بکذاب اشیر

حکایت:- یکے از بزرگان پارسائے را گفت کہ چہ گوئی درحق فلاں عابد کہ دیگراں درحق او بہ طعنہ سخنہا گفتہ اند، گفت بر ظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش عیب نمی دانم بیں بردے طعنہ چگونہ کنم

ہر کسے را کہ پارسا بینی — پارسا داں و نیک مرد انگار

ور ندانی کہ در نہانش چیست — محتسب را درون خانہ چہ کار

حکایت:- درویشے را شنیدم کہ در آتش فاقہ می سوخت و خرقہ بہ خرقہ می دوخت و تسکین خاطر خود را می گفت

بنان خشک قناعت کنیم و جامۂ دلق — کہ رنج محنت خود بہ کہ بار منت خلق

کسے گفتش چہ نشینی کہ فلاں دریں شہر طبع کریم دارد و کرمے عمیم، میاں بخدمت ازادگان بستہ و بر در دلہا نشستہ۔ اگر بر صورت حالت چنانکہ ہست وقوف یابد پاس خاطر عزیزاں داشتن منت دارد و غنیمت شمارد۔ گفت، خاموش کہ در پستی مردن بہ کہ حاجت پیش کسے بردن قطعہ

ہم رقعہ دوختن بہ والزام کنج صبر (۱) کز بہر جامہ رقعہ بر خواجگان نوشت

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است (۲) رفتن بپائے مردئی ہمسایہ در بہشت

شعر:- ہو بڑا عیب ہنر دشمنی کی آنکھوں میں — پھول ہو سعدی پہ ہو آنکھ میں دشمن کی خار

بیت:- گو جہاں روشن ہے سورج سے سرا — پر چھچھوندر کی نظر میں ہے برا

شعر:- مدعی کا ہو گزر صالح کیجانب اگر — تو اشارہ یوں کرے یہ ہے بڑ جھوٹا شریر

حکایت:- ایک بزرگ نے کسی پرہیز گار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے

جسکو ظاہر میں متقی دیکھے — اسکے تقوی کا تو نہ کر انکار

کھوج مت کر کسی کی باطن کی — محتسب را درون خانہ چہ کار

حکایت:- ایک فقیر کو میں نے سنا ہے کہ فاقہ کی آگ میں جلتا پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا

سا اس فقر دنان خشک پر بس — یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت

ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا — ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم اپنا اس نے کھولدیا ہے اور اپنی کمر کو آزادوں کیخدمت کیلئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال پر تیری اطلاع پا دے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا چنانچہ کہ گئے ہیں۔

پیوند گانٹھ صبر کا کونا کر اختیار (۱) پر اغنیا سے کرنہیں جامہ کی التجا

مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب (۲) جانا تر اجو گلشن فردوس میں ہو!

۱۸۰۲ء میں گلستان سعدی کے ترجمہ سے فارغ ہوکر افسوس نے بجائے کسی اور تالیف یا ترجمہ کے دوسری کتابوں کی تصحیح و نظر ثانی کا کام شروع کیا اور اواخر ۱۸۰۹ء تک اسی میں مشغول رہے۔ سب سے پہلے میر بہادر علی حسین کی کتاب "نثر بے نظیر" کی نظر ثانی کی۔ میر بہادر علی حسین بھی فورٹ ولیم کالج کی منشیوں میں تھے انھوں نے "مفرح القلوب" کا اردو ترجمہ "اخلاق ہندی" کے نام سے کیا ہے علاوہ ازیں ولی محمد کی "تاریخ آسام" بھی انہی کی ترجمہ کی ہوئی ہے اور انھوں نے ہی "سحر البیان" مثنوی میر حسن کو ڈاکٹر گل کرایسٹ کے حکم سے اردو نثر میں لکھا تھا۔ غالباً اردو خواں یورپینوں

کے لئے مثنوی میرحسن کے پڑھنے میں سہولت پیدا کرانے کی غرض سے گل کرائسٹ نے بہ خلاصہ بطور پیرا فیرز (Paraphrase) کے ان سے مرتب کرایا تھا۔

نہال چند لاہوری بھی فورٹ ولیم کالج کے مولفین میں سے ہیں انھوں نے شیخ عزت اللہ بنگالی کی ایک فارسی کتاب "گل بکاؤلی" کا ۱۲۱۷ھ میں "مذہب عشق" کے تاریخی نام سے اُردو ترجمہ کیا تھا۔ افسوس نے ان کے ترجمہ کی بھی نظر ثانی کی ہے مذہب عشق کے مضمون ہی کو پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے نظم کا جامہ پہنا کر مثنوی گلزار نسیم رکھا۔

فورٹ ولیم کالج کے لئے علاوہ نثر کی کتابوں کے نظم کی کتابوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا اردو میں کافی ذخیرہ موجود تھا صرف نظر ثانی و انتخاب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مرزا رفیع سودا کا دیوان داخلی و خارجی دونوں قسم کی اعلیٰ شاعری کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے نظر اول میں چن لیا گیا اور اس کی تصحیح و انتخاب کا کام افسوس کے سپرد کیا گیا۔ افسوس نے اپنے حسن و مذاق سے کلیات سودا کا ایک ایسا انتخاب مرتب کیا جنہیں صنف سخن کا بہترین نمونہ موجود ہے اور اس کو اپنے اہتمام سے کلکتہ سے شائع کرایا اس کے نسخے بھی کمیاب ہیں۔ حیدرآباد کے کتبخانہ آصفیہ[۵]، کتبخانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں ایک ایک نسخہ موجود ہے اور ایک نسخہ میرے پاس ہے۔ یہ ۱۸۱۰ء کا مطبوعہ ہے اور اس میں سودا کے چند چوٹی کے قصائد، غزلیات کا بہترین انتخاب اور مثنوی، مرثیہ اور قطعات کے عمدہ نمونے صحت کے ساتھ مندرج ہیں۔

آرائش محفل افسوس کا ایک اور یادگار کارنامہ "آرائش محفل" ہے یہ ہندوستان کی ایک معتبر و مستند فارسی تاریخ موسوم بہ خلاصۃ التواریخ کا اردو ترجمہ ہے "خلاصۃ التواریخ" کے مصنف منشی سبحان رائے ساکن پٹیالہ ہیں۔ انھوں نے ۱۱۰۷ھ میں یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے تیار کی تھی۔ سبحان رائے نے اپنے جو مصادر و ماخذ بتائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

عہد ہنود (۱) مہابھارت، رامائنا اور ہری بنسا کے فارسی ترجمے جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے تھے۔ (۲) بھگوت گیتا، یوگا اور سیشتاجو شیخ احمد اور دیگر علماء نے دارا شکوہ کے لئے فارسی میں ترجمہ کئے تھے۔ (۳) گل افشاں یعنی سنگاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ (۴) پدماوت یعنی رتن سین مہارانا چتور کی تاریخ وغیرہ عہد اسلام۔ (۱) تاریخ محمود غزنوی از مولانا عنصری (۲) تاریخ سلطان شہاب الدین غوری (۳) تاریخ علاء الدین خلجی (۴) تاریخ فیروز شاہی از مولانا عزیز الدین خالد خانی (۵) تاریخ افاغنہ از حسین خان افغانی (۶) ظفرنامہ از شرف الدین یزدی (۷) تیمور نامہ ہاتفی (۸) تواریخ بابری (۹) اکبرنامہ ابوالفضل (۱۰) طبقات ناصری (۱۱) جہانگیرنامہ (۱۲) تاریخ شاہجہاں از وارث خاں (۱۳) تاریخ عالمگیر از میر محمد کاظم وغیرہ۔

چونکہ مصنف کے پیش نظر ہر بادشاہ اور راجہ کے متعلق اس کے معاصرین کی تاریخیں تھیں، اس لئے اس نے ان سے استفادہ کر کے نہایت معتبر و صحیح تاریخ مرتب کی ہے۔ افسوس نے مسٹر جے۔ ایچ۔ ہارنگٹن کے ایماء سے ۱۲۱۹ھ میں اس کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور عہد ہنود کا

---

[۵] فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول

پورا حصہ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء میں ختم کرکے "آرائش محفل" اس کا نام رکھا۔ "آرائش محفل" پہلی مرتبہ ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی اور چند سال بعد ہی اردو دانی کے اعلیٰ امتحانات میں داخل نصاب ہوگئی۔ اس ضرورت کے سلسلہ میں ۱۸۴۲ء اور پھر ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے اس کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن نکلے اس کے بعد لکھنؤ اور لاہور کے مطابع سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے

جان شکسپیر نے اس کے دس ابواب کا انگریزی میں ترجمہ بھی اپنی "منتخبات ہندی" مطبوعہ ڈبلن ۱۸۲۴ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کو انگریزی میں منتقل کرکے ۱۸۷۱ء میں الٰہ آباد اور ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے شائع کیا "آرائش محفل" میں۔ ہندوستان اور اس کے مختلف صوبجات کا مفصل بیان، وہاں کی پیداوار وغیرہ کے حالات کے ساتھ دیا ہے۔ اس کے بعد زمانہ قدیم سے لیکر فتوحات اسلامیہ تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی ہے۔ اس کتاب کا طرز بیان مضمون کتاب کی نوعیت کا لحاظ کرتے بالکل سلیس اور صاف ہے اور اس کے ساتھ ادبیت ٹپکتی ہے۔ گو ہمیں اس زمانہ کی عام کتابوں کی طرح بڑھی ہوئی مبالغہ آرائیاں نہیں ہیں تاہم بعض موقعوں پر ان کا قلم بے راہ ہو جاتا ہے اور تعریف میں دو چار فقرے زیادہ لکھ جاتا ہے۔ ذیل میں پہلے باب کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے طرز بیان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

"مملکت ہندوستان کی تعریف"

سب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر، قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اسکو نہیں لگتی یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم جا بجا ایک نئی طرح کا عالم ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ، پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے، ہر موسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں اکثر بلیسیوں مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے، باغات، غریبوں بیکسوں مسافروں کے لئے متعدد مکانات، قلعے بڑے بڑے مضبوط، وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں۔ ندی، نالے، تالاب کنوئیں لطیف و پاکیزہ، ہزارہا پانی ایسے میٹھا ٹھنڈا، بھرا بھرا ہوا۔ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں، نواڑے، بجرے وغیرہ بے شمار، شاہراہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں میں پل بندھے تیار اکثر رستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار، ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار، ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا سودے والوں کی دوکانیں جا بجا، مسافر خوش و خرم، کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں۔

جہاں دیکھئے خیر ہی خیر ہے سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سوائے اس کے راہ میں اگر سونا اچھالتے چلے جائیں کہیں خطرہ نہیں اور جنگل میں رات کو جہاں چاہیں سورہیں کچھ پروا نہیں چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے، مال و متاع، غلہ دور دور سے بھر لاتے ہیں اور منزل مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں"

سید محمد قادری (حیدرآبادی)

منیر شکوہ آبادی

اور

مثنوی معراج المضامین

منشی سید اسمٰعیل حسین منیر سادات میں سے تھے۔ میانہ قد، کتابی چہرہ، دوہرا جسم، چمپئی رنگ، کشادہ پیشانی، پیوستہ ابرو، بڑی بڑی رسیلی آنکھیں، بھرے ہوئے گال، ستواں ناک، باریک دانت، خشخشی داڑھی رکھتے تھے جو دور سے نظر آجائے، متوسط مونچھیں اور سلامت روی کو چھپائے، شبنم یا لکھنؤ کی چکن کا کرتہ، ململ یا باریک تنزیب کا انگرکھا، چوگوشیہ ٹوپی، جالی کا کوٹ، دو رنگین کار رومال، اوڑھے ہوئے گلبدن یا مشروع کے عرض پائنچوں کا پاجامہ اور لکھنؤ کی ساخت کا زرد مخملی گرگابی پہنتے تھے۔ شکوہ آباد وطن تھا جس کے متعلق خود لکھتے ہیں:-

شکوہ آباد اک قصبہ ہے آباد وہی ہے مسکن آبا و اجداد
سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں ہوا تحصیل ریاض گفتگو میں

اُن کے والد منشی سید احمد حسین شکوہ آباد کے "رؤسا" لوگوں میں سے تھے۔ "منشی" ان کا قصباتی لقب تھا اور اہل قصبہ ان کو "منشی جی" "منشی جی" کہکر مخاطب کرتے تھے۔

منیر کی سنہ پیدائش کا تو پتہ نہیں چلا، ہاں مہینہ و تاریخ خود منیر نے اپنی مثنوی (معراج المضامین) میں نظم کر دی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سنہ پیدائش اُن کے بھی حافظہ سے محو ہو چکا تھا اور "جنم پترا" بھی کتب خانہ کے ساتھ تلف ہو گیا تھا ورنہ وہ اس کو بھی نظم کئے بغیر نہ رہ سکتے۔

نویں تاریخ ذالحجہ کی جو ہے ہمایوں ماہ ہے روز نکو ہے
اُسی دن مجھکو دنیا میں اُتارا عجب روز خجستہ میں اُتارا

شکوہ آباد میں زندگی کی پہلی آواز نکالی، لکھنؤ میں پروان چڑھے اور رام پور کے محلہ پھلواری میں سنپل خیر حسین کے مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔ سیاقی ہیضہ (جسمیں غالب نے مرنا پسند نہیں کیا) نے اُن کی زندگی کا موسم ختم کر دیا۔ پہلے ناسخ کے گروہ تلامذہ میں داخل ہوئے، جب ناسخ کی شاعری کا جنازہ اٹھ گیا تو رشک کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اُن سے اصلاح لیتے رہے۔ مرثیہ میں دبیر کو استاد بنایا۔ خود اقرار کرتے ہیں:-

دیا اُستاد ناسخ سا شہنشاہ کہ جسکا سکہ ہے ماہی سے تا ماہ
اُٹھا جب میرے سر سے انکا سایہ جناب رشک سے پھر فیض پایا
عطا کی مرثیہ میں اس کی اصلاح کہ جس کی بزم ہے خورشید مصباح

مسیحائے سخن اعجاز گستر　　دبیر پاک دین مقبول داور

ابتدائی درسی کتابیں جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا پہلے اپنے والد سے پڑھیں پھر لکھنؤ کے مختلف اُستادوں سے۔ "کالے پانی" میں تقریباً پانچ برس مولوی فضل حق خیرآبادی ایسے فلسفی سے عربی میں فلسفہ معقول اور حکمت کے درس لئے کتابیں وہاں کہاں تھیں مگر قابل استاد کے علوم حکمیہ کے لبریز دماغ سے "منہ زبانی" مستفید ہوئے۔ داستان سنتے سنتے "داستان گوئی" کا شوق ہو گیا تو میر قاسم علی دہلوی کے شاگرد نسیم خان کے سامنے مٹھائی رکھی اور راتوں کو جاگ جاگ اور جگا جگا کر اس "شاہ پسند" فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ شرع کے پابند تھے، اثنا عشری گروہ سے تعلق تھا۔ افیون لکھنؤ کا مذاق تھا۔ منیر کیوں نہ اس کے عادی ہوتے۔ اور حقہ تو افیون کی "گزک" ہے، اس کو کیوں نہ منہ لگاتے۔ منیر کی عربیت و فارسیت تو اس سے ظاہر ہے کہ "کالے پانی" میں ہی مولانا فضل حق دہلوی کے حافظہ کا جائزہ لے ڈالا۔ اردو کے تو گہوارے میں نشو و نما پائی تھی۔ مثنوی (معراج المضامین) میں "مناجات" کے تحت میں اپنے کچھ خاندانی حالات اور حوادث روزگار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو شعراء کی عام سنت ہے۔ شاعری نام ہے "توکل" پر زندگی بسر کرنے کا وہ زمانہ لد گیا۔ جب ایک ایک شعر کی قیمت میں شاہی خزانہ کی مخملی تھیلیوں کے منہ کھول دئے جاتے تھے، ایک ایک قصیدہ پہ سلاطین زندگیوں کو مطمئن کر دیا کرتے تھے، شعراء کے منہ موتیوں سے بھر دئے جاتے تھے۔ اور جواہرات سے ان کے سمیت ان کی شاعری کا وزن کیا جاتا تھا۔ ہارون و مامون کے شاعرانہ درباروں کا اب صرف تصور کر کے رہ جائیے، شاہنامہ کی قدر و قیمت محمود کی گور سے پوچھ لیجئے۔ جہاں آرا کی شاعر نوازیاں کوئی صیدی طہرانی سے پوچھتا۔ خانخاناں کی شاعرانہ فیاضیاں کوئی نظیری سے دریافت کرتا۔ منیر یا ہمارے زمانہ کے شعراء اُس وقت پیدا ہوئے تھے جب شاعری کے قدردان پیوند زمین ہو چکے تھے۔ ہندوستان مغربی کروٹیں بدل رہا تھا اور طلائی و نقرئی سکے صرف بازاروں کے چلن کے لئے ڈھالے جاتے تھے۔ آخر منیر کی مفلوک الحالی پر نواب علی بہادر رئیس باندہ کو ترس آیا۔ انھوں نے بلایا، ملازم رکھا اور شاعری میں استاد بھی بنایا۔ یہ غدر سے پہلے کے واقعات ہیں۔ غدر کا فتنہ منیر کی آنکھوں کے سامنے اُٹھا، غدر کے ہنگامے نے ان کے بنے بنائے گھر کو اجاڑا کتب خانہ کو تلف ہوتے ہوئے دیکھا ــــــــ عُسرت نے دعوت دیدی، غدر کی ہنگامہ خیزیاں ایسی نہ تھیں کہ ایک شاعر متاثر نہ ہوتا، اسی تاثر نے جزیرہ انڈمان کی سیاحت اس مصرع کے بدولت کر لی کہ:۔　　گوروں کے پاؤں اُٹھ گئے کالوں کے سامنے۔

تقریباً پانچ برس اس کالے کوسوں والے جزیرہ میں رہے اور علوم حکمیہ کی تحصیل میں وقت گزارا اور احباب کی طویل مفارقت کو تعلیمی اشغال میں محو کرنے کی کوشش کی۔ فردوس مکان نواب سید یوسف علی خان بہادر فرمانروائے رام پور کی سعی و سفارش سے جب رہائی کی نوید ملی تو اس مسرت میں وہیں یہ اشعار کہے :۔

بارے آئی نجات کی باری　　کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہمکو منصب ملا رہائی کا　　قید کو جائداد بے کاری
پاؤں کو چھوڑ بھاگے مار دو سر　　سر کو پشتارۂ گرانباری

کلّے پانی سے ہوتے ہیں رخصت — اب وطن چلنے کی ہے تیاری
دال، فے، نون، عین اے کتابت قید — گاف، میم، اے حساب سرکاری
مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں — پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری

غدر کے حالات اور اپنی مصیبتوں کا ذکر "معراج المضامین" میں کچھ کیا ہے:۔

ہوا جس وقت برپا فتنۂ عام — ہوئے برہم رعیت سے یہ حکام
کہ ہو لا قصۂ دہلی و نادر — ہوئے احکام قتل عام صادر
سلاطین و رئیسانِ فلک شاں — چڑھے پھانسی، ہوئے محبوس نالاں
بچا دی تونے میری جان یارب — ترے احسان کے قربان یارب
بلا سے ہو گیا اسباب تاراج — بلا سے میں ہوا بیکار و محتاج
کتابوں کے تلف ہونے کا کیا غم — بچا دی جان یہ نعمت ہے کیا کم
پھنسا جس وقت زندان بلا میں — ہوا قیدی نئی وحشت سرا میں
بچایا تونے طوفانِ بلا سے — رہا حافظ سمندر کی ہوا سے
اسیری میں بھی کیفیت سے رکھا — مشقت کی جگہ راحت سے رکھا
فرنگستاں کے زنداں سے چھڑایا — موئے ہندوستاں پھر تو ہی لایا
نہ پائی جب یہاں جنس نکوئی — نہ دیکھا ہند میں غمخوار کوئی
نہ چھوڑا ساتھ اس بیکسی نے — نہ پوچھا لکھنؤ میں بھی کسی نے

تو نواب سید کلب علیخان بہادر فرمانروائے رامپور نے طلب فرمایا اور پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر دیئے۔ منیر بڑے پرگو تھے وہ تو نظم میں باتیں کر لیتے تھے، متعدد مرثیے لکھے، ائمہ کی شان میں قصیدے کہے، غزلوں کا انبار لگا دیا اور دوسرے اصناف سخن کا بھی ڈھیر کر دیا ضخیم کلیات ان کی پرگوئی کا شاہد، ۷ ہزار شعر کی مثنوی (معراج المضامین) اُنکی شاعری کے ثبوت میں زندہ اور یہ مثنوی تو اس حالت میں کہی ہے جبکہ افکار زندگی نے اُن کے دل و دماغ کو اگر بیکار نہیں تو پریشان کر ہی رکھا تھا مگر طبیعت کی فطری موزونی ہر حالت میں کہلواتی رہی "انتخاب یادگار" (تذکرہ شعرائے رامپور مصنفہ حضرت امیر مینائی) کے سوا سب تذکرے ان کی شاعرانہ زندگی سے خاموش ہیں۔ اتنا تیز کہنے والا جو ناسخ و رشک اور دبیر کے تلامذہ میں رہ چکا ہو جس نے اپنی شاعری کی پیداوار فردوسی سے بھی بڑھا دی ہو جو جلال کا ہمعصر، تسلیم کا ہموزن، امیر و داغ کا ہم عہد اور اسیر کی آنکھیں اور بحر کی روانی دیکھ چکا ہو اس کا تذکروں سے خالی ہونا ایک پرگو شاعر

پر ظلم کرتا ہے اور شاعری کی اس افراطِ پیداوار کی قیمت گھٹاتا ہے۔

منیر کی مثنوی (معراج المضامین) غالباً اردو کی دنیائے شاعری میں اسوجہ سے شہرت نہ پا سکی کہ اس کے مضامین مذہب کا آئینہ دکھاتے ہیں احادیث کا عکس پیش کرتے ہیں۔ سرورِ کائنات سے لیکر مہدیِ آخر الزماں تک کے معجزات اور ان مقدس ہستیوں کے زندگی کے تابناک واقعات ولادت سے لیکر شہادت تک سب منیر نے شرح و بسط سے نظم کر دیئے ہیں۔ منیر نے مثنوی کا میدان ہی ایسا تلاش کیا کہ جسمیں بے تکان دوڑیں لگائی جا سکتی ہیں۔ یورپ کا ہومر، ایران کا رودکی، اور دلی کا جرأت باوجود مادرزاد اندھے ہونے کے اس میدان میں "انکھیارے" ہیں، اس میں جدھر سینگ سمائے چلئے پھرئے، نہ اس میں قافیہ کی پگڈنڈی ہے اور نہ اس میں ردیف کا "سدِ سکندری" حائل ہے، جتنا چاہئے دوڑئے، جتنا چاہئے پھیلئے اور اس "صفاچٹ" میدان کو اپنی شاعرانہ کلبلوں سے روند ڈالیئے، اسمیں سب کچھ ہے۔ کیونکہ اس میدان کا ہر ذرہ (شعر) اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے، نہ اس میں اشعار کی کسی تعداد کا تعین ہے اور نہ اسمیں مضامین کی کوئی تخصیص۔ اس میدان میں رزم کی تلواروں کو چمکایئے، بزم کی چہل پہل دکھلایئے، حسن و عشق کے واردات کا نقشہ کھینچیے، تصوف کے فلک فرسا نعرے مارئیے، فلسفہ کی الجھنوں میں پڑیئے، اور واقعات کھری کھری باتیں بھی سنا دیجئے، تلاش سے اگر دماغ تھکتا نہیں ہے تو مضامین سے مضامین پیدا کرتے چلے جایئے، اجمال کی تفصیل اور اشارات سے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کر لیجئے۔ غزل میں یہ وسعت کہاں، جبتک قافیے و ردیف اس کے ہم جلیس نہ ہوں گے۔ وہ اپنے وجود کو ثابت ہی نہیں کر سکتی۔ اصنافِ سخن میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جو انسانی جذبات کا بھی خیر مقدم کرتی ہے اور مناظرِ قدرت کا بھی، اس کا دروازہ اذنِ عام کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ پھر اسی میں قافیوں والی غزل کو بھی نکال لیجئے اور اسی میں قصیدہ کی بھی شان و شوکت دیکھ لیجئے، اس میں عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام اور شجاعت و بہادری، غرض تمام انسانی جذبات کو اس کے دسترخوانِ عام پر مدعو کر لیجئے۔ بہار و خزاں کا بھی اس کے یہاں پھیرا لگتا رہتا ہے اور گرمی و سردی کے بھی موسم اس کے یہاں آتے رہتے ہیں، برسات کا ابرِ رحمت بھی اپنے فیضان سے غافل نہیں رہتا، صبح و شام کا اندھیرا اور اجالا بھی اس کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ جنگل و بیابان کا سناٹا بھی اس میدان میں محوِ خواب رہتا ہے۔ کوہ و صحرا کی آواز بازگشت بھی اسی میدان سے ٹکراتی رہتی ہے اور ریگ و سبزہ کی چمک دمک بھی آنکھوں میں کھبتی رہتی ہے۔ تاریخی واقعات بھی اس میدان میں کہانیوں کی طرح سنے جاتے ہیں۔ غرضکہ انسانی جذبات ہوں یا مناظرِ قدرت، ملکی و قومی انقلابات ہوں یا مرنے جینے کے حوادث، سب اس میدان میں خس کی طرح کھینچے چلے جاتے ہیں۔

مثنوی کی تخلیق اُس بہارستان میں ہوئی جہاں دارا کی دارائی دفن ہے، جہاں کیکاؤس کا شاہانہ جام و چشم سرنگوں ہے، عرب کے اصیل گھوڑے اس کی خوش سوادی میں گام زنی نہ کر سکے، یہ تخیل پسند دماغوں کی جدت طرازیوں کی شگفتگی تھی۔ عرب کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے رجز مثنوی کی صورت رکھتے ہیں کیونکہ بنی اُمیہ کے زمانہ میں رجز نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ سو سو شعر کے بھی رجز پائے جاتے تھے۔

جن کو مثنوی کہنا مشکل ہے، بسیط مثنوی کا وجود عرب میں کہاں! اس کا تو ایران ہی باغبان ہے، اسی نے اس درخت کو لگایا اور اُسی کی آبیاریوں نے اُس کو سر سبز رکھا اور اُسی نے فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کو اس کی گلچینی کے لئے چھوڑ دیا، عنصری کو وامق و عذرا کی داستان عشق نظم کرنے کے لئے تیار کر دیا۔ فردوسی نے تو شاہنامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو زندہ کر دیا اور واقعہ نگاری کا خاتمہ۔ نظامی نے خمسۂ نظامی لکھکر پانچ کے عدد کو اپنے نام کا جزو بنالیا اور محبوب الٰہیؒ کے توخوشگوار مُرید (خسرو) نے ایک ایک سانس میں نہ معلوم کتنی مثنویاں ہندوستان کی فضا میں جھوم جھوم کر لکھ ڈالین۔ اسدی طوسی نے تو اپنے لغت میں ابوشکور، طیان، اور لبیبی کے بھی نام مثنوی گویوں میں گنا ڈالے۔

ہندوستان جب مغلیہ بادشاہوں کی بدولت "اردو" میں باتیں کرنے لگا اور انسانی فطرت کے لحاظ سے جب یہ لشکری بھی موزون طبع ہو گئے تو جو اصناف سخن فارسی میں جاری و ساری تھے اردو مین بھی رائج ہو گئے چونکہ فارسی اُسوقت شاہی زبان تھی، ہر مذہب و ملت کے اظہار خیالات کا یہی واحد ذریعہ تھی، ہندو بھی اس کو شوق و رغبت سیکھتے تھے اور صاحب استعداد ہو جاتے تھے راجہ ٹوڈرمل اور بیربل تو خیر فیضی و فیاضی کے ہمنشینوں میں تھے لیکن تمام فارسی فارسی کی بدولت اب تک "منشی" کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ غرضکہ اردو بولنے والے بھی ایران کی تقلید میں شعر کہنے لگے میں نے سنا ہے کہ ایمان کی بنیاد تقلید پر رکھی جاتی ہے، جب تک کلمہ گو کسی کے "دست حق پرست" پر بیعت نہ کرے اور کسی کا مقلد نہ ہو جائے اسوقت تک اسکے عبادات بارگاہ قدسیت میں مقبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہی کورانہ تقلید تھی کہ اردو بولنے والون نے بیعت کے لئے حضرت رودکی کیطرف معتقدانہ ہاتھ بڑہا دیئے۔ بیعت لینے والا تو بھوکا ہوتا ہے اس نے جلدی سے ہاتھ پھیلا دیئے۔ ان پجاریوں نے چوما چاٹا اور شاعر بن گئے۔ پیر طریقت تو ہر قسم کی ریاضتوں کی عادت ڈلواتا ہے اس نے غزلیں بھی لکھوائیں اور قصیدے بھی، رباعیان بھی اور مسدس بھی، مرثیے لکھواکر رونے کا خوگر بنایا اور مثنویاں لکھواکر واقعہ نگاری کی مشق کرائی۔

سب سے پہلے دار الحکومت دہلی سے اثر دحسن کی آوازین بلند ہوئیں تو گومتی میں ہیجان کیوں نہ پیدا ہوتا، لکھنؤ نے آتش کے پردہ میں نسیم کو اُکسایا اور پھر آفتاب الدولہ قلق کو، رنگین مزاج شوق زہر کا پیالہ پی ہی چکا تھا "آپ بیتی" کیون نہ نظم کرتا۔ میر و سودا کی اُستادانہ شان سے یہ بعید تھا کہ وہ اس صنف کو ہاتھ نہ لگاتے، غالب کیون چُپ رہتے، مصحفی کیوں نہ "بحر المحبت" میں غوطے لگاتے، مومن اس میدان مین کیسے نہ دکھائی دیتے۔ مثنوی شعراء کی آشفتہ دماغی پر مستولی ہو گئی، گھر گھر اس کی خوشبو پھیل گئی، گلیوں گلیوں اس کا چرچا ہو گیا۔ ہمارے زمانہ کی اسیر کی آخری یادگار شوق قدوائی اُٹھ بیٹھے انھوں نے مثنوی کیا لکھی محاورات کا ایک لغت تیار کر دیا ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا اور اب تو جس طرح حشرات الارض کی طرح غزل گو پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح مثنوی گو بھی شمار سے فزوں تر ہو گئے۔ ایرانی شعراء ایک صنف کو لیتے تھے اور اسی میں عمرین صرف کر کے یگانہ روزگار ہو جاتے تھے، یورپ کو جاکر دیکھو تو اگر ایک فلسفی ہے تو منطق کے صغریٰ و کبریٰ سے، نا آشنا، اگر ایک سائینٹیٹ ہے تو ادب کی شگفتگیوں سے بیگانہ، مگر جس سبجکٹ کو لیا اُسے

اپنا کر کے دم لیا۔ عماد الملک بلگرامی کا یہ قول مجھے کبھی نہ بھولے گا جو وہ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے متعلق فرمایا کرتے تھے :۔

"سید علی زبانوں کے سیکھنے میں بہت حریص ہے اور گو ہر زبان کو کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے مگر ادھورے رہنے کا نقص رہ جاتا ہے۔ ایک چیز میں انسان جو پختگی حاصل کر سکتا ہے وہ متعدد چیزوں میں ناممکن ہے"

فردوسی کے لئے یہ بس ہے کہ اُس نے شاہ نامہ لکھدیا، نظامی کو زندہ رکھنے کے لئے خمسۂ نظامی کافی ہے، حافظ کی یہ کرامت ہی تو ہے کہ اُن کے مضامین رندی و سرمستی سے بھی کم، ورعقیدے والے فال دیکھ لیتے ہیں، سعدی کو دنیا نے اخلاق و موعظت کا دیوتا مان لیا ہے، شکسپیر کے ڈراموں نے دنیائے اسٹیج پر قبضہ کر ہی لیا ہے، گرے کو صرف "ایلجی" یاد دلاتی ہی رہیگی، مگر ہمارا ہندوستان اپنی آب و ہوا کے لحاظ سے فطرتاً حریص ہے، جس نے اُس کو سرگرداں ہی رکھا اور خوشہ چینی میں کچھ نہ کچھ مشاق کر ہی دیا۔

بدر منیر کے بعد نہ معلوم کتنی مثنویاں اب تک عالم وجود میں آئیں مگر نقش اول کے مرتبہ کو کہاں پہنچ سکتی تھیں۔ یہ تو دلی و لکھنؤ کی معاصرانہ چشمکیں ہیں کہ وہ کبھی نسیم کی سرگرم چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی قلق کی زباندانی پیش کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کے لئے یہ کچھ کم نہیں ہے کہ شوق کی "زہر عشق" کے دنیائے اردو میں بکثرت حافظ موجود ہیں۔ گو اُس کے جذبات بے حیائی کا درس دینے والے ہیں اور مخدرات کی نظر سے دور رہنے کے قابل مگر کوئی نوجوانوں سے پوچھے اور ان کا از کار رفتہ بوڑھوں سے جنھوں نے ۔ مصرع ۔ پان کل کے لئے لگاتے جائیں ۔ پر سر دُھنا ہے اور اپنی زندگیوں میں خستگی محسوس کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نوچندی جمعرات کو لکھنؤ کی درگاہ پر ہمارا بھی جانے کو جی چاہتا ہے۔

اردو کی مثنویوں میں زیادہ تر دیو پری کی محیر العقول داستانیں ہیں، کیرکٹر کی تصویر کشی جو مثنوی کا پہلا منصب ہے۔ اس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ ہمارے مثنوی گو اس کوچہ سے ناواقف اور اس راستہ سے نابلد ہیں۔ اور یہی عیب ہم کو ان مثنویوں میں آنکھ کے شہتیر کی طرح نظر آتا ہے۔ صرف "زہر عشق" ہی ایک ایسی مثنوی ہے جس میں شوق کی "آپ بیتی" عینی مشاہدہ معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کے نظم کرنے میں اگر شوق لکھنوی تکلف کو دخل دیتے اور عشق و محبت کے معصومانہ جذبات میں تصنع کی آمیزش کر دیتے تو شوق کا شاعرانہ دماغ مصوری کا کمال نہ دکھلا سکتا اور واقعات کو حیثیت نہ بنا سکتا۔

منیر نے اچھا کیا کہ فرضی انسانوں کی طرف رُخ نہیں کیا ورنہ وہ بھی اپنے پیشروؤں کی طرح "قلابازی" کھا جاتے۔ منیر نے مضمون ہی ایسا تلاش کیا کہ اس آئینہ میں اصلی ہی خط و خال نظر آ سکتے ہیں یعنی انھوں نے احادیث کو نظم کا جامہ پہنایا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ منیر نے ۱۲۸۶ھ میں "معراج المضامین" کو ختم کیا اور اس کا دعویٰ کیا ہے کہ اس میں احادیث صحیحہ نظم کی گئی ہے۔ مگر ہمیں تو منیر کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ منیر واقعہ نگاری میں تو مشاق معلوم ہوتے ہیں اور مضامین کو پھیلانا بھی خوب جانتے ہیں۔ مگر غیر فصیح اور ناآشنا الفاظ اکثر مقامات کو پھیکا کر دیا ہے اور جنھوں نے میرے مذاق پر تو ناسخی تازیانے لگائے ہیں۔ میں تو فصاحت اس کو سمجھتا ہوں کہ معمولی لفظ بھی جہاں بے تکلفی سے

رکھدیا جائے وہ جڑا ہوا خوبصورت نگینہ معلوم ہو۔ لفظوں کی ثقالت اور روکھا پن فصاحت کہاں برداشت کرسکتی ہے یہ تو اس کے مرتبہ کی اہانت ہے۔ منیر نے جہاں رنگ ناسخیت سے دور رہنے کی کوشش کی ہے وہاں انداز بیان کی سادگی بلائیں لے رہی ہے۔ مگر منیر آخر کہاں تک اس پردہ میں انیس کی مدارات کرتے جبکہ ناسخ و دبیر کے گھروں میں ان کی شاعری نے آنکھیں کھولی ہوں، جہاں الفاظ کی شائستگی اور مطالب میں سادگی کا گزر نہیں اور پھر منیر خود منطق کے پیچیدار راستوں میں بھٹک چکے ہیں، فلسفہ کی بھول بھلیوں میں پھنس چکے ہیں جن کو سادگی ادا سے بیر ہے۔ منطق کے مذہب میں تو وزنی لفظوں کے پتھر لڑھکانا اپنی منطقیب کی شان و شوکت دکھلانا ہے، فلسفہ الجھنیں پیدا کر کے اپنی فلسفیت کا سکہ بٹھاتا ہے۔ مگر بہ حیثیت مجموعی منیر نے جو کچھ کہا ہے اس میں شعریت بھی ہے اور شاعری کے لوازمات بھی اور بعض بعض مقامات تو جن کو میری نظروں نے انتخاب کئے ہیں منیر کی شاعرانہ حیثیت کو منوائے بغیر نہیں رہتے

"معراج المضامین" کا سبب تصنیف سنئے، ایک روز الہ آباد میں احباب جمع تھے اور منیر کے "خصوصاً راز دلجوئی کے محرم" دوست الطاف حسین صاحب غازی پوری نے منیر سے کہا کہ آپ کے آئمہ کی مدح میں قصیدے بھی دیکھے اور رندی و سرمستی کی غزلیں بھی مگر:۔

مناسب آپ کو ہے اب یہ تدبیر — کہ یکجا ہوں فضائل سب کے تحریر
کچھ اعجاز ائمہ بھی ہوں موزوں — مناسب معنی و الفاظ و مضموں
کرو اب مثنوی میں صرف ہمت — کہ ہیں مشتاق ارباب متانت
پسند آیا مجھے اُن کا اشارا — قدم اس راہ میں یہ کہکے ڈالا
دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا — توکلت علی اللہ تعالےٰ

تمہید میں مناجات کی لپیٹ میں منیر نے اپنے کچھ سوانح بھی بیان کر دیئے ہیں، نعت میں شب معراج کے مشہور واقعات کو نظم کر کے براق کی سرعت پرواز کو اس شعر پر ختم کیا ہے:۔

نبی ادنےٰ تو حیدر بھی ہے ادنےٰ — یہی ہیں معنی من کنت مولےٰ
کیا قبضہ دو عالم پر علی نے — خدا نے تیغ دی دختر نبی نے

بی بی کی شان عصمت میں بھی یہ دو چار شعر سن لیجئے:۔

اسی کے جاں نثاروں میں ہے عصمت — اسی کے پردہ داروں میں ہے عصمت
زمانے بھر میں جو آب و نمک ہے — انہیں کے مہر میں وہ حشر تک ہے
یہاں تک تھی خطاپوشی میں کامل — کہ تنہاں دل میں رکھا نام قاتل
ہوئی الماس کے صدمہ سے بیجاں — زمرد گوں ہوا یاقوت ایماں

پھر دس آئمہ کے فضائل پانچ پانچ دس دس شعر میں بیاں کرتے ہوے بارہویں امام پر اس تمہید کو ان شعروں پر ختم کیا ہے۔

پناہ دیں ہے ان کا آستانہ　　انھیں کے دم سے ہے قائم زمانہ
خدائے پاک کے اسمائے اعظم　　صحیفے اُترے تھے جو بجر آدم
زبور، انجیل، توریت اصل قرآں　　علوم ما یکون و علم ما کاں
رسولوں کے تبرک کا خزینہ　　علوم غیب، تابوتِ سکینہ
پیغمبر کا جو تھا ترکۂ پاک　　شب معراج جو پہنی تھی پوشاک
جناب سیدہ کی خاص چادر　　علی کی ذوالفقار برق پیکر
کتاب جامعہ جفر مجلد　　تمامی مصحف زہرائے امجد
طبقچہ نعمت خلد بریں کا　　تبرک شہپر روح الامیں کا
معظم جسقدر نعمائے رب ہیں　　امام عصر کے قبضہ میں سب ہیں
نہیں اعجاز سے یہ بات خالی　　خدا نے کی مطول عمر عالی
ہویدا ہے حساب عمر کا حال　　ہوا اب الکھزار انیسواں سال

یہ عمر ۱۲۸۶ھ تک ہوئی تھی اسمیں ساٹھ گرہیں اور لگا دیجئے تو ۱۳۴۶ھ میں امام عصر کی عمر ۱۰۷۹ سال کی ہو جاتی ہے۔ "معراج المضامین" ۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ہر صفحہ میں ۲۴ - ۲۴ شعر ہیں، جہاں سرخیاں قائم ہوگئی ہیں وہاں اشعار کی تعداد میں کچھ کمی ہوگئی ہے ۱۹ صفحہ تمہید نے لئے ہیں، ۲۰ دیں صفحہ سے اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جسمیں میلاد سرور کائنات کو اس طرح شروع کیا ہے، چند شعر ادہر اُدہر کے انتخاب کرکے لکھتا ہوں :—

پلا ساقی شراب علم تاریخ　　کہ ہو فتاح باب علم تاریخ
حقیقت کیا مری، کیا میری ہستی　　کہ ہاتھ آئے مے کوثر کی مستی
کہ عام الفیل ہے سال ولادت　　ربیع الاولیں شہر ولادت　　(قافیہ ندارد)
صباح جمعہ سترہویں[1] تھی اسروز　　کہ چمکا آفتاب عالم افروز
چراغ آتش پرستی کا ہوا گل تو　　پڑا ایوان کسرے میں تزلزل
مدائن میں اُٹھا اک شور محشر　　گرے چودہ کلس روئے زمیں پر
وہ آتش خانے جو تھے شعلہ افگن　　ہزاروں سال سے دنیا میں روشن

[1] شیعی نقطۂ نظر سے

ہوے یکبارگی اس شب کو خاموش ۔۔۔ دہوئیں کی طرح ہر مو بد سیہ پوش

چہل سالہ ہوے جب شاہ لولاک ۔۔۔ ہوا نازل کلام ایزد پاک

غرض جب سے نبوت کا ہوا دور ۔۔۔ زمانے میں ہوئے تیئس سال اور

ہوا تر سٹھ برس کا جب سن پاک ۔۔۔ زمانہ سے سدہارے شاہ لولاک

یہی لکھتے ہیں جو ہیں واقف الحال ۔۔۔ کہ ہجرت کو ہوا تھا گیارہواں سال

صفر کی بست و ہشتم[1] یوم اثنین ۔۔۔ گیا حضرت نے باغ خلد میں چین

اس کے بعد معجزات نبوی حضرت علی کی زبان سے گنوائے ہیں، پہلے شعر میں حسب عادت "اپنے ساقی" کو پکارا ہے اور جرعۂ شراب کیلئے اُسکی خوشامدیں کی ہیں اور اسی نشۂ صہبا سے گریز پیدا کیا ہے :۔

کہاں ہے ساقیٔ زہرہ شمائل ۔۔۔ دکھا دے آج کیف سحر بابل

حضرت علی فرماتے ہیں کہ :۔

میں جتنا حال حضرت سے ہوں عارف ۔۔۔ نہیں اتنا کوئی دنیا میں واقف

دو شنبہ کو ہوئی تھی وحی نازل ۔۔۔ سعادت میں نے کی منگل کو حاصل

سبھوں سے ہے قدیم اسلام میرا ۔۔۔ لکھا ہے سابقوں میں نام میرا

رہا تا ہفت سال آخر یہی طور ۔۔۔ نہ تھا اسلام میں میرے سوا اور

پڑھی حضرت کے پیچھے فارغ البال ۔۔۔ نماز حق فقط میں نے کئی سال

پھر حضرت علی نے فرمایا کہ ایک روز سرور کائنات وعظ فرما رہے تھے، میں بھی اس محفل وعظ میں حاضر تھا کہ :۔

کہ آئے چار فرقے کافروں کے ۔۔۔ جو تھے سردار سارے لشکروں کے

کہا سب نے کہ سن لے اے محمدؐ ۔۔۔ نبوت کا ہے دعویٰ تجھکو بیجد

ہمیشہ لاف تو کرتا ہے اکثر ۔۔۔ کہ میں سارے رسولوں سے ہوں برتر

جو اس دعوے میں ہے تو راست گفتار ۔۔۔ ابھی ہمکو دکھا دے معجزے چار

نمایاں نوح کا طوفان کر دے ۔۔۔ تر و خشک زمین پانی سے بھر دے

دکھا ہمکو خلیل حق کے آثار ۔۔۔ بنا دے آتش سوزاں کو گلزار

کلیم اللہ کی پا بند اُٹھا کر ۔۔۔ کوئی کوہ گراں رکھدے ہوا پر

سلہ ۲۸ صفر کی یہ تاریخ وفات بھی شیعی روایات کی بنا پر ہے۔

بنادے صورت عیسیٰ و مریم ذخیرہ اپنے گھر رکھتے ہیں جو ہم

سرور کائنات ؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید خود اسلام کی حقانیت کا سب سے بڑا معجزہ ہے، ایک آیت بھی تو آج تک اس کے مانند فصیحان عرب نہ لا سکے۔ یہ ارشاد نبوی ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ جبریل نازل ہوئے اور فرمان خداوندی سنایا کہ :۔

کرو تم قوم پر اتمام حجت ہوئے یہ معجزے چاروں عنایت

پھر یہ چاروں معجزے منیر نے نہایت تفصیل سے نظم کئے ہیں جو اسلامی تاریخ کے جاننے والوں کے حافظہ میں تازہ ہوں گے فرق اتنا ہے کہ یہ نظم کے قالب میں ہیں۔

اس ذکر اولین کے بعد جناب امیرؑ کے سوانح کی طرف منیر اپنی عقیدت کی شاعرانہ نگام پھیرتے ہیں اور حضرت علیؑ کی ولادت گاہ کی خصوصیتیں، معجزات، غزوات، شجاعت و بطالت، تقویٰ و پرہیزگاری، علم و فضل اور اسلام پر جان نثاری وغیرہ کو نظم کیا ہے۔ اور سلسلۂ امامت کی بقیہ کڑیوں کو بھی اسی خوش عقیدتی سے بانیٔ اسلام کی زنجیر سے جوڑتے چلے گئے ہیں، میدان کربلا کے روح فرسا مصائب بھی تڑپ تڑپ کر بیان کئے ہیں، اگر ہر ایک کے منتخب اشعار بھی نقل کئے جائیں تو مضمون کی عمر طولانی ہو جائیگی اس لئے میں ان مضامین کو نہایت افسوس کے ساتھ ترک کرتے ہوئے ادھر متوجہ ہوتا ہوں جہاں منیر نے امام ہشتم کے ایک معجزے کے سلسلہ میں دریا کا منظر دکھلایا ہے :۔

ہوئے گوہر فشاں جس دم لب پاک	ہوا اک بارگی شق پردۂ خاک
نظر آیا وہاں اک بحر مواج	صفا میں جس کا پانی لوحۂ عاج
وہاں پانی بھری نہر آبرو کی	نظر آنے لگی نیت وضو کی
وہ دریا تھا کہ قدرت کا مرقع	ہر اک موج اس کی زنجیر مرصع
خرام موج پر نظارے بے خود	دم عیسیٰ کی جیسے آمد و شد
نہ سست اپنے چلن میں تھی نہ چابک	رواں جس طرح نبض دست نازک
وصال یار سے بھر آتا تھا دل	کھلی تھی شوق میں آغوش ساحل
کتاب عمدہ تھا وہ بحر مقصود	مگر آغاز و انجام اس کا مفقود
نمایاں مچھلیاں خوش وضع ہر سو	جبین صاف پر جس طرح ابرو
چمک فلسوں کی ان کی زیر دریا	چراغ آئینہ خانہ میں گویا
محیط چرخ و آب زندگانی	اسی کے گھاٹ کا پیتے تھے پانی

جہاں دریا ہے وہاں کشتی لازم ہے ——— منیر کے اس دریا میں لب معجز نما سے کشتی رواں ہوتی ہے، حوادث طوفانی میں پھنستی ہے اور ساحل ہند پر ٹھہر جاتی ہے۔ آپ بھی ان لفظی تصویروں کو دیکھئے :-

غرض کشتی کو حسرت نے دیا حکم — رواں ہونے کا دریا میں کیا حکم
نہ کشتیباں کوئی اس میں نہ ملاح — چلی کشتی پہ تنگ مرد سیاح تو
کہوں دریا کی کیونکر شورہ پشتی — کہ موجیں لڑتی تھیں کشتی سے کشتی
شعاع مہر جب موجوں سے الجھے — سحر سے شام تک ہرگز نہ سلجھے
فلک کا اس کے دامن میں بھٹکنا — کہ جیسے طشت میں ڈبیا کا ڈوبنا
پہاڑ اٹھتے تھے پانی کے برابر — جو کوہ قاف سے لیتے تھے ٹکر
اگر مینڈھا کوئی اس کا اچھلتا — تو فیل چرخ کا بھیجا نکلتا
غرض ماہی سے لیکر تا بہ مہتاب — نظر آتا نہ تھا جز عالم آب
غم طوفان و باد ناموافق — ہزاروں طرح کے افکار لاحق
کیا موجوں نے یوں کشتی کو پامال — ہوا جیسے برگ خشک کا حال
سفینہ گاہ تھا پشت سمک پر — کبھی بالانشین بام فلک پر
نظر آتا نہ تھا کوئی جزیرا — کہ جس کی سیر ہو دل کو پذیرا
چلے جاتے تھے سب خوف و رجا میں — نہ تھا دھیان آشنا کا آشنا میں
ہر اک جانب کو کشتی مڑ رہی تھی — بط جو بیں ہوا پر اڑ رہی تھی
سفر کا ہو گیا بالجزم انجام — ہوئے سب ہند میں وارد سر شام

تو رات اسی کشتی میں مسافروں نے گزاری اور :—

سحر آفاق میں آئی، گئی رات — اٹھی آب بقا سے قید ظلمات
غرض خشکی میں اترے سب جہازی — کریں تا اپنی اپنی کارسازی
دیار ہند میں اترا جو راہب — نظر آئی طلسمات عجائب

منیر نے راہب کی اجنبی آنکھوں کو ساحل ہند پر جو خوبصورت و دلکش مناظر دکھلائے اور ہندوؤں کے اشنان کی حالت گونگھٹ والیوں کا انبوہ، ہندو رسم و رواج کے عجائبات کی جو تصویر کھینچی ہے اور اس میں شاعرانہ شوخیوں کا جو تلاطم برپا کیا ہے وہ بے پناہ ہے اور

مثنوی کی جان۔ منیر سمجھتے تھے کہ مذہب کا دریا اب کہاں بہتا ہے اور اس کی فطری موجوں سے اب کہاں لطف اٹھایا جاتا ہے جبھی منیر نے اس خشکی میں تر و تازگی پیدا کرنے کے لئے اپنی طوفانی کشتی کو ایسے ساحل پر پہنچا ہی دیا جہاں کی دنیا ہی نرالی ہے اور جہان کے عجائبات بدیسیوں کے لئے تو ضرور حیران کر دینے والے ہیں۔ گو موضوع مثنوی سے اس حصہ کو کوئی واسطہ نہیں ہے مگر منیر کی شاعری کا سیلاب کیونکر رک سکتا تھا، آپ بھی اپنے گھر کی باتیں سنئے اور منیر کی شاعرانہ علاش اور وسعت نظر کی داد دیجئے اور دیکھئے کہ منیر کی قوت متخیلہ نے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستان کی دیوپریوں کے معشوقانہ ناز و غمزے اور فطری شوخیوں کو جن اچھوتی تشبیہوں سے "نیک نام" کیا ہے اور جن استعاروں سے "حیا پرور" دوؤں کو خوبصورت بنایا ہے وہ منیر کا حصہ اور ادائے بیان کا اعجاز ہے۔ اب کیا دیکھتا ہوں

کنار آب انبوہ حسیناں　　ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چومک سے روشن　　بتاسے دوب، تلسی دھوپ چندن
مٹھائی تاریل پھول اور چانول　　گلوری کائے تل سیندور گوگل
چڑھاتی ہیں نہانے میں لب آب　　جہاں دیکھو وہاں پوجا کے اسباب
فلک پر ڈوبتے دیکھے ستارے　　لب دریا چمکتے چاند تارے
لگن تھی شمعوں کی جلوہ سے گرداب　　تجلی سے چراغاں تھا تہ آب
عیاں پانی میں یوں حسن جہانگیر　　نمایاں آئینہ میں جیسے تصویر
بہار نو دو جانب سے نمودار　　کنارے پر چمن پانی میں گلزار
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے　　کہیں جمنا کہیں گنگا جلی ہے
بڑی مانگوں میں سیندور اور صندل　　گلابی مدبھری آنکھوں میں کاجل
گندھی زلفیں بندھے جوڑے کھلے بال　　کہیں سمٹا کہیں پھیلا ہوا جال
بھنویں چھوٹی بڑی آنکھیں بھرے گال　　یہ ریشم کے سے لچھے سنبلی بال
نگہ سے سرمہ ساں دل پیس ڈالیں　　بتا دیں ہنس کو چلنا یہ چالیں
کلائی دست بازو گات گردن　　ہنسی تو بے شکن بے چین چتون
ادا سے بولی بوٹی کا پھڑکنا　　بگڑنا خود بخود رکنا جھجکنا
ہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا　　پھر آپ ہی شرم سے گردن جھکانا
دم صبح اس غضب کا رنگ و روغن　　نہ دیکھا باسی پھولوں پر یہ جوبن

طراوت تھی پسینے سے بدن کی — چلی آتی تھی خوشبو بھینے پن کی
اُداسی جاگنے کی چتونیں مست — کبھی سینہ کبھی چہرہ تہ دست
زبانیں خشک نیندیں چھا رہی تھیں — لبوں کی سرخیاں پپڑا رہی تھیں
نشاں گورے بدن میں سرخ نیلے — سراسر چوٹیوں کے پیچ ڈھیلے
جماہی لینے میں منہ کا یہ معمول — کبھی غنچہ کلی تھی گہہ کھلا پھول
کوئی انگڑائی لیکر ٹالتی تھی — کوئی سُستی کسی پر ڈالتی تھی
کوئی پھولوں کو پانی میں بہاتی — سمٹ کر کوئی دریا میں نہاتی
کسی کو نیند سے کوئی جگاتی — کوئی پھیلا ہوا آنچل چھڑاتی
کوئی دیتی تھی ٹیکا زعفرانی — چڑھاتی تھی کوئی سورج کو پانی
نہ لاتا تھا جو اُن کے حسن کی تاب — تو سورج پر چھڑک دیتی تھیں خود آب
جسے دیکھو شفق پوش و زری پوش — تکلف ساریوں کا آفتِ ہوش
لطافت میں پرندچین دوپٹے — شفق گوں چنریاں رنگین دوپٹے
عیاں کمخواب کے لہنگوں سے وہ طور — کہ جیسے شعلۂ جوالہ کا دور
قدم جب گھیر ان کے چومتا تھا — سرِ گردون گرداں گھومتا تھا
بچے کس طرح اس چکر سے دانا — اسی چکی میں پستا ہے زمانہ
ادا سے دیتی ہیں جب کوئی ٹھوکر — تو ٹھکر گرد پھر جاتا ہے چکر
حیا کا حکم ہے گھونٹ نہ ہو دور — نمائش حسن کو ہر دم ہے منظور
اشارہ بوسہ لینے کا وہاں ہے — دبانا ہونٹ دانتوں میں یہاں ہے
وہ کہتا ہے بہانہ سے چلی آؤ — انگوٹھا ٹھکے کہتا ہے ہوا کھاؤ

آخر منیر بھی تو عربی النسل تھے، کہاں تک سنبھلتے واقعہ نگاری کی ٹھوکریں کہیں کہیں اس حصہ میں کھانی ہی پڑیں، راہب کو یہ مظاہر پرستی عرب کے زمانۂ جاہلیت کی یاد دلاتی تھی اور اس عریاں مناظر سے شرماتا تھا، حیرت کی انگلی دانتوں میں دبا دیتا اور ان توہمات پر پیچ و تاب کھاتا تھا۔ دریا سے ہٹتا ہے اور شہر کی طرف روانہ ہوتا ہے، راستہ میں ایک کنوئیں پر "پنھاریوں" کا ایک ہوشربا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ یہاں بھی راہب ایسے صحرا نورد کو مصیبتیں پکار رہی تھیں، اچٹتی نظریں ڈالتا ہوا ایک باغ کے حدود میں جب داخل ہوتا ہے

تو باغ کو اسی حالت میں پاتا ہے :-

خزاں نے اس طرح گلشن کو لوٹا　　نہ گلبن تھے نہ پتا تھا نہ بوٹا

رہا یوں فرش سبزہ نا مکمل　　کہ دیمک خوردہ جیسے سبز مخمل

خزاں کے ڈر سے گل داغ بلبل　　چراغ صبح ہو سکتا نہ تھا گُل

غرض اس باغ میں آیا جو راہب　　ہوا اندوہ و حرماں کا مصاحب

شب غربت گلستاں میں بسر کی　　برنگ شبنم گریاں سحر کی

تو راہب آنکھیں ملتے ہوا اُٹھا اور وضو کر کے نماز سحر کا فریضہ ادا کیا اور یہ ارادہ کر کے چلنے والا ہی تھا کہ کوئے منزل مقصد کا رستہ بتانے والا مل جائے کہ یکا یک :-

نظر آیا چمن سے تھوڑی ہی دور　　دبستان عجب آباد و معمور

سماں دیوار و در سے آشکارا　　لیا ہے گائے کے گوبر سے سارا

ہوا راہب نہایت حیرت اندیش　　سر دروازہ تھی تصویر گنیش

بچھے تھے تختۂ چوبیں سراپا　　ہر اک تختہ پہ اک کم عمر بیٹھا

کہیں باہم جوان و پیر دکود ک　　کوئی پوتھی لئے ہے کوئی پستک

کوئی پڑھتا ہے پیش چشم اُستاد　　کوئی کرتا ہے کچھ بھولا سبق یاد

کہیں ہے بھاگوت گیتا کا چرچا　　مہا بھارت ہے رامائن کسی جا

کہیں ہے شاستر کا غل کہیں بید　　کسی کو جوتشی بننے کی اُمید

کوئی اشلوک پڑھکر پوجتا ہے　　کہیں پنگل کا ٹیکا ہو رہا ہے

کبت اک طرف گرم بیاں ہیں　　کبت دوہرہ چھپا کنڈلیاں ہیں

کہیں پنڈت ہیں گرم بید خوانی　　پر یر و شن رہے ہیں دیو بانی

کہیں بیدانت ہے میمانسا ہے　　کہیں جوگ اور بیدک بدیا ہے

پُرانوں کی کہیں ہوتی ہے تجدید　　کہیں ہوتی ہے دیبی پاٹ کی دید

زبان اُن کی نہ سمجھا راہب نیک　　نہ سمجھا پنڈتوں میں اسکی بات ایک

جب راہب اس دبستان کے حالات دیکھکر بیزار ہو گیا تو اس کو وہاں سے بھاگنے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی تو منیر کو بھی راہب ایسے

مہمان کی خاطر سے یہ کہنا پڑا کہ :-

منیر اب ترک کر وضعِ تکلف یہاں تک شاعرانہ تھا تصرف
عیاں ہو منصفوں پر تالیاقت دکھادی مثنوی گوئی کی طاقت
اگرچہ ہے فضائل کا یہ دفتر حدیثیں آیتیں ہیں نظم اکثر
نہ تھا زیبا کہ آتا اسمیں یہ رنگ لگایا ناحق اس آئینہ میں زنگ
ہوئی مستوجب شرم نہایت نمود اپنی جوانوں کی رعایت
ادہر اہلِ قناعت ہوں گے برہم اُدہر خوفِ خدا وند دو عالم
یہ تھا اس مثنوی کے شان سے دور ہوا رنگین مزاجوں سے میں مجبور

جب منیر خاموش ہوگئے تو میں بھی اسی حصہ پر اپنے قلم کے مسافر کو روکتا ہوں اور منیر کی روح شاعری پر فاتحہ پڑھتا ہوں، یہ حقیقت ہے کہ منیر نے ہر واقعہ کے جزئیات اور باریک سے باریک خط وخال کو بھی اپنے مصورانہ دماغ میں سمیٹا ہے اور صفحہ قرطاس پر تصویر بناکر دکھلادیا ہے جو واقعہ نگاری کا کمال اور وسعت نظر کی آخری حد ہے ۔

دیکھئے اگر میری پریشان زندگی نے اس کی کسی وقت اجازت دیدی تو آپ کو منیر کے کلیات کی بھی سیر کراؤں گا۔ اس قسم کے مشغلوں کے لئے دماغی سکون کی ضرورت ہے جس کا میری زندگی میں قحط ہے ۔

ہوش بلگرامی

دادا کا مزار

(ایک سچا واقعہ)

کریم خان صرف خاص کا ایک سوار تھا ممکن ہے کہ کبھی اُس کے بیوی بچے ہوں مگر اب وہ تنہا رہتا تھا مہاراجہ چندو لعل بہادر کی ڈیوڑھی پر متعین تھا اور وہیں رہتا بھی تھا، افیون اور مدک کا عادی تھا اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ انہیں چیزوں کے نذر کردیتا تھا، اس کا سال خوردہ غریب گھوڑا ہمیشہ تھان پر بندھا ہنہنایا کرتا تھا سوکھی گھاس تو مل جاتی تھی مگر نہ تو اُس غریب نے کبھی ہری گھاس کی صورت دیکھی تھی اور نہ "چنوں" کا ذائقہ اسے یاد تھا، سواری کا اتفاق سال میں ایک آدھ مرتبہ ہوتا تھا، اور وہ بھی میل دو میل کے لئے۔ کوسوں تک چلنے کی نوبت شاید جوانی میں آئی ہو تو آئی ہو مگر اب تو زمانہ سے وہ بیکار سا ہو رہا تھا۔

بعض وقت لوگوں کا مذاق بھی غریبوں کا جان لیوا ہو جاتا ہے اسی طرح غریب کریم خان کے گھوڑے کی جان بھی گئی، راجہ راجندر مہاراجہ چندو لعل بہادر دیوان کے متصدی تھے، ایک مدت سے کریم خان کو "بیڑے" میں پڑا ہوا اور اس کے گھوڑے کو تھان پر بندھا ہوا دیکھ رہے تھے دل لگی جو سوجھی تو ایک دفعہ ایک ضروری مراسلہ کریم خاں کو بلوا کر دیا کہ بیدر لے جاؤ اور فوراً جواب لیکر واپس آؤ۔ کریم خان نے لاکھ لاکھ کہا کہ میرا گھوڑا بوڑھا ہے، میں خود بیمار ہوں چالیس کوس کا راستہ مجھ سے طے نہ ہوگا مگر راجہ راجندر نے ایک بات نہ مانی۔ مجبوراً کریم خان کو تیار ہونا پڑا، رات بھر بیٹھ کر اپنی نشہ کی چیزیں تیار کرلیں، صبح نماز فجر کے وقت ناشتہ کر کے روانہ ہوگئے، اور چھ دن کی شبانہ روز کی راہ روی کے بعد قلعہ بیدر پہونچے اور جواب لیکر دوسرے ہی دن واپس لوٹے، مدت سے بیٹھے بیٹھے گھوڑے کی رگیں بھی اکڑ گئی تھیں، بیچارہ پہلے ہی سے لنگڑاتا ہوا چلتا تھا بیدر پہونچکر تو بالکل مفلوج ہوگیا مگر وہاں بھی آرام نہ ملا، حیدرآباد کو واپس ہونے لگا تو چلا نہ جاتا تھا۔ بہزار خرابی آٹھویں روز آدھا راستہ ختم کیا اور مغرب کے وقت ایک درخت کے نیچے نہایت ہی عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا ہوگیا، کریم خاں مار مار کر تھک گیا گالیاں بکتے بکتے منہ خشک ہوگیا، مگر اُس نے ایک قدم آگے نہ بڑھایا، خان صاحب اُتر پڑے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر "نشہ پانی" میں مصروف ہوگئے اور یہ مصروفیت ایسی رہی کہ رات کے بارہ بجے کچھ ہوش آیا تو گھوڑا نہ تھا۔ خانصاحب نے بکمال سراسیمگی درخت کے نیچے آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انکا رفیق سفر شدائد کی تاب نہ لاکر اُن کو جواب دے چکا ہے پہلے تو خاں صاحب نے خیال کیا کہ گھوڑا سو گیا ہوگا مگر دیر تک جگانے کے باوجود بھی وہ نہ جاگا تو آپنے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر لیا اور نعش کے قریب بیٹھکر مراقبہ کرنے لگے، خانصاحب کی تنخواہ عہ۵ اور گھوڑے کی ماہوار سہ۵ تھی مگر للعہ۵ بھی خاں صاحب کے اشغال کی تکمیل کے لئے کافی نہ تھے اب جو گھوڑے نے عین وقت پر دغا دیدی تو سہ۵ بھی گئے صرف عہ۵ رہ گئے جو کسی طرح خاں صاحب کے لئے کافی نہ تھے، دوسرا گھوڑا کہیں سے مل نہیں سکتا تھا اور روپیہ بھی نہ تھا جو خرید لیتے، بہرحال دیر تک خاں صاحب نے مراقبہ کرنے کے بعد ایک بہترین ترکیب سوچی اور کھڑے ہو کر گرد و پیش کے میدان پر ایک تفصیلی نظر ڈالی، گھوڑے

گھوڑے کی نعش سے بیس قدم کے فاصلہ پر ایک بڑا گڑھا تھا جس میں گھوڑے کی نعش سما سکتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ نہ تو گھوڑے نے وہاں پہونچکر مرنے کی کوشش کی اور نہ خاں صاحب اس کی نعش کو کھینچ کر وہاں پہونچا سکتے تھے اُس کے لئے یہی دیر تک مراقبہ کرنا پڑا آخر دو بجے رات کو خاں صاحب نے کرتا، پائجامہ، انگرکھا سب اُتار کر رکھ دیا، زین پوش کو تہمد کی طرح لپیٹ کر میان سے زنگ آلودہ تلوار نکالی اور لگے اپنے رفیق سفر پر تیغ آزمائی کرنے ایک گھنٹہ کی محنت میں انھوں نے گھوڑے کے مختلف حصے مختلف صورتوں میں علیحدہ کر لئے اور ایک ایک ٹکڑا گڑھے میں ڈال کر ساری نعش منتقل کر دی جس قدر زمین اس معصوم گھوڑے کے خون سے بھیگی تھی وہاں کی مٹی بھی خنجر سے کھود کر اُسی گڑھے میں ڈال دی گئی اور پھر اِدھر اُدھر سے مٹی پتھر لکڑی جو کچھ بھی ملا ڈال کر گڑھا بھر دیا، صبح کو قریب کے قصبہ سے ایک کدال پھاوڑا مانگ لائے اور گھوڑے کی ایک نہایت ہی شاندار قبر مع چبوترہ تیار کر دی اور سُرخ مٹی سے لیپ کر اسے بالکل قبر کی طرح بنا دیا املی کے درخت کی کچھ شاخیں جھک کر قبر کے قریب آ گئی تھیں ان میں سُرخ دھاگے کے "ناڑے" باندھ دیئے اور ایک عود دان لاکر سرہانے رکھ دیا اور خود قبر کے پائیں میں درخت سے ٹیکا لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ موضع کے پٹیل پٹواری نے آکر جب ایک نیا مزار دیکھا اور اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے قبر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ حضرت کو یہاں دفن ہوئے مدت ہوئی آپ حضرت خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے ہیں، قبر کا نشان مٹ گیا تو لوگوں نے یہاں آکر بیٹھنا شروع کیا، پرسوں حضرت نے خواب میں تشریف لاکر فرمایا کہ اٹھ میرے مزار کو بے حرمتی سے بچا چنانچہ میں نے آکر چبوترہ اور مزار از سرِ نو بنا دیا ہے" اس واقعہ کی شہرت اسقدر ہوئی کہ لوگ دور دور سے دیکھنے کے لئے آنے لگے اور نذر و نیاز بھی خوب ہونے لگی نذر کا روپیہ فاتحہ خوانی کے پانچ پیسے خاں صاحب لے لیا کرتے تھے، جو اب خاں نہیں بلکہ شاہ تھے اور کریم شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، خوش اعتقادوں نے اس قدر دیا کہ کریم شاہ صاحب نے ایک حجرہ اپنے رہنے کے لئے اور ایک تکیہ فقراء کے ٹھہرنے کے لئے بنا لیا، دو ہی تین مہینے میں خاصی شہرت ہوگئی اور بیدر اور حیدرآباد تک سے لوگ مرادیں لیکر آنے لگے۔

مہاراجہ چندولعل بہادر فقیر دوست تھے انھیں جب اطلاع ملی تو اسی موضع کی دس بگیہ زمین مزار کے لئے واگزاشت کر دی اور ایک ہزار روپیہ سالانہ عرس کے لئے مقرر کر دیا اور سجادۂ درگاہ یعنی کریم شاہ صاحب کے نام دو روپیہ یومیہ مقرر فرما دیا، اب کریم خان سوار نہ تھے بلکہ حضرت سید شاہ گھوڑے سوار حسینی قدس سرہٗ کے سجادہ نشین اور کریم شاہ حسینی یومیہ دار تھے۔

مدت تک یہی عمل درآمد رہا درگاہ کی معاش سے کریم شاہ صاحب فائدہ اُٹھاتے رہے اور نہایت ہی مزے سے زندگی کے دن گزارے تقریباً دس سال تک کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی مگر "فضلنا بعضکم علی بعض" دنیا میں کریم شاہ صاحب سے زیادہ ہوشیار لوگ بھی موجود ہیں ایک صاحب جو سید اور حسینی مشہور تھے اور انھیں یومیہ دعاگوئی کی تنخواہ بھی ملا کرتی تھی اتفاق سے حضرت گھوڑے سوار حسینی کے عرس شریف میں تشریف لائے، سجادۂ درگاہ حضرت کریم شاہ نے ان کی خوب خاطر مدارات کی مگر سید صاحب کو کریم شاہ صاحب کے

حرکات و سکنات میں مشائخیت نظر نہ آئی اور انھوں نے حضرت کے خاندان وغیرہ کے متعلق دریافت فرمایا، شاہ صاحب رکنے والے تھوڑے ہی تھے انھوں نے ایک طول طویل داستان سنا دی اور اپنا اور صاحب مزار کا شجرۂ نسب حضرت غریب نوازؒ تک پہونچا دیا۔ سید صاحب کو یقین تو کیا آتا مگر اُنھوں نے چند باتیں غور کرنے کے قابل پائیں اور عرس شریف سے واپس ہو کر مہاراجہ چندو لعل بہادر کے پاس ایک درخواست پیش کر دی کہ "حضرت سید شاہ گھوڑے سوار حسینی میرے دادا تھے کریم شاہ کوئی غیر شخص ہے جو سجادہ بنا ہوا بیٹھا ہے۔ سید صاحب نے ایک کرم خوردہ اور بوسیدہ شجرہ اور گھوڑے سوار حسینی کے چند ملفوظات وغیرہ ثبوت میں پیش کر دئے اور بعض مشائخ کی گواہی بھی دلوا دی اور نہایت ہی محنت و کوشش کے ساتھ اپنے نام معاش بحال کرا کر غریب کریم شاہ کو بے دخل کر دیا اور خود اس کے یومیہ اور زمین اور مزار وغیرہ پر قابض ہو گئے۔

کریم شاہ نے حیدر آباد آکر بہت کوشش کی ہزار ہزار ترکیبیں کیں کہ کچھ نہ کچھ ملے مگر ایک پیش نہ گئی اور ہر درخواست نامنظور ہوئی۔ مثل مشہور ہے کہ تو کو نہ مو کو چولھے میں جھونکو" جب انسان کسی چیز کو اپنے قبضہ سے نکل کر دوسرے کے قبضہ میں جاتی ہوئی دیکھتا ہے تو پہلے اُسے دنیا ہی نہیں چاہتا اور اگر چھن جاتی ہے تو واپس لینے کی فکر کرتا ہے جب یہ بھی ممکن نہیں ہوتا تو یہ کوشش کرتا ہے کہ مابہ النزاع چیز یا تو باقی ہی نہ رہے یا کسی تیسرے شخص کے قبضہ میں آجائے، مگر اُسکو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اس کا مدمقابل اس سے متمتع ہو۔

یہی خیال آخر میں کریم شاہ کو بھی پیدا ہو گیا اور انھوں نے ناامید ہو کر مہاراجہ بہادر کے پاس ایک درخواست پیش کی کہ اگر خود مہاراجہ بہادر درگاہ شریف تک تشریف لے چلیں تو اس کا تصفیہ باحسن الوجوہ ہو سکتا ہے کہ وارث حقیقی کون ہے؟ راجہ صاحب سلطنت کے کاروبار کی وجہ سے خود تشریف نہ لیجا سکے مگر اپنے متصدی راجہ راجندر پرشاد بہادر کو حکم دیا کہ وہ مزار پر جاکر تحقیقات کریں، اتفاقاً عرس ہی کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا اور چراغوں کے دن کریم شاہ راجہ راجندر پرشاد کو لیکر مزار پر پہونچے وہاں پہونچکر پہلے تو شاہ صاحب نے سید صاحب کا شجرۂ نسب دیکھنے کی تمنا کی اور پھر ان سے حلف لیا کہ وہ انہیں گھوڑے سوار کے خاندان سے ہیں جن کا مزار ہے جب سید صاحب نے بہ کمال اطمینان قسم بھی کھالی تو کریم شاہ نے قبر کھدوانے کی درخواست کی اس پر سب لوگ بگڑ گئے اور قریب تھا کہ پیر پرست اصحاب کریم شاہ صاحب سے بے ادبی کر گزریں مگر کریم شاہ نے سب کو مخاطب کر کے اپنی سرگزشت سنانی شروع کی اور اپنی مفلسی تنگدستی گھوڑے کی لاغری اور بیدر جانے کے حکم اور واپسی میں اس کے انتقال پر ملال وغیرہ کی تفصیل سنا دی، راجہ راجندر نے غور کرنے کے بعد پہچان لیا کہ کریم شاہ وہی کریم خان ہے جو اُن کی ڈیوڑھی پر سواروں کے زمرے میں ملازم تھا اور بیدر روانہ کیا گیا تھا مگر واپس نہیں آیا۔ کریم شاہ کے اصرار پر قبر کھودنے کی اجازت دی گئی اور جب قبر کھودی گئی تو پہلے پتھر وغیرہ برآمد ہوئے اور پھر رکاب اور چند تسمے کے ٹکڑے وغیرہ نکلے اور پھر گھوڑے کی ہڈیاں نکلیں جن کو جوڑ کر دیکھا گیا تو پورا ڈھانچہ موجود تھا، قبر کھدنے سے پیشتر سید صاحب فرار ہو چکے تھے، ان کے دادا کی ہڈیاں دکھانے کے لئے انہیں ڈھونڈھا بھی مگر پتہ نہ چلا، زائرین اور خوش اعتقاد لوگ جس قدر جوش و خروش سے آئے تھے اسی قدر منغص اور شرمندہ ہو کر واپس ہو گئے

"جسوقت راجہ راجندر بہادر نے یہ قصہ مہاراجہ چندولعل بہادر کو سنایا اور کریم شاہ کی سواروں میں ملازمت وغیرہ کی تصدیق کی تو وہ باوجود متانت وسنجیدگی کے دیر تک ہنستے رہے اور کریم خاں کو اصطبل خاص سے ایک گھوڑا دیکر سلحدار کر دیا۔"

سید صاحب قبلہ دادا کی مزار سے فرار ہوکر حیدر آباد آئے تو لوگوں نے چھیڑنا شروع کیا اور ہر ایک شخص ان کے دادا کے ڈھانچہ کا تذکرہ کرنے لگا۔ الغرض غریب سید صاحب کو بچوں اور لوگوں نے اس قدر ستایا کہ وہ حیدر آباد چھوڑکر ہجرت کر گئے۔

تمکین کاظمی (از گلبرگہ)

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(گزشتہ سے پیوستہ)

قومی منافرت

اگر دراصل تباہی ہندوستان میں انقلاب کا بڑا سبب قرار دیا جائے تو شہروں میں سیاسی تعلیم کی نشوونما اس کا کمتر سبب ضرور قرار دیا جائیگا یعنی ایسی سیاسی تعلیم جسمیں سیاسی اختیارات کی نشوونما شامل نہیں ہے۔ اگرچہ ایشائیون کی ترقی کے بارے میں مجھے کامل یقین ہے تاہم میں اقرار کرتا ہوں کہ ہندوستان آنے سے پہلے میں یہ دیکھنے کے لئے تیار نہ تھا کہ ہندوستانی باشندے سیاسیات میں اس قدر ترقی پا چکے ہیں میں نے اس کا اندازہ اخبارات کی ان آرا سے کیا تھا جنھیں اکثر انگریزی اخبارات مخالفانہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور میں اُن کی بنا پر غلط رائے قائم کر چکا تھا۔ ہندوستان کے اخبارات کم سے کم وہ جو انگریزی میں شائع ہوتے ہیں، ہمارے اخباروں سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اور نہ ان اشخاص کے ذہنی قوی سے انہیں مساویانہ نسبت ہے جنکی وہ نیابت کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انگلستان میں ٹائمز یا کسی اعلیٰ درجہ کے رسالہ میں جب کبھی کسی مسئلہ پر کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو ذہنی اعتبار سے وہ مدبروں کی تقریروں سے زیادہ پایہ کا ہوا کرتا ہے، حالانکہ ہندوستان میں زبانی دلائل ہمیشہ بہترین ہوتے ہیں اور نہ یہ کہنا مبالغہ میں داخل ہوگا کہ دنیا میں بہت کم قومیں ایسی ہیں جو سیاسی تقریروں میں ہندوستانیوں کا مقابلہ کر سکیں حتیٰ کہ ہمارے دارالعلوم میں سے کسی ایسے آدمی کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو کسی دلچسپ مضمون پر بہترین تعلیمیافتہ ہندوستانیوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے میں کامیاب اتر سکے۔ دوران سیاحت میں میرے دل پر ہمیشہ اس بات کا اثر پڑا ہے۔ ہندوستانی دماغ بہت جلد اور صاف طور پر ایک بات کو سمجھ لیتا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ قانونی واقع ہوا ہے۔ کلکتہ کی بعض تقریروں میں اگرچہ فصاحت و بلاغت اور صنائع و بدائع کا زیادہ استعمال ہوا تھا تاہم کوئی بات ایسی نہیں بیان کی گئی تھی جو لائق سے خالی ہو اور میرے دل میں بار بار یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ جس لہجہ میں مقرر بالعموم تقریر کرنے کے عادی ہیں اس سے زیادہ سخت لہجہ اختیار کیا جائے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سچائی کو قربان کئے بغیر زیادہ سخت زبان استعمال کیجا سکتی ہے یہ کہ بسا اوقات برائیوں کو کم کرنے کی کوشش کیجاتی تھی، فوائد مبالغہ کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے اور عام طور سے بحث و مباحثہ میں مبالغہ کرنے کے بجائے معاملہ کو کم بتانے کی سعی ہوتی تھی اور دوران گفتگو میں مجھے کئی مرتبہ اس قدرتی اعتماد کے خلاف صدائے ناراضگی بلند کرنے کی ضرورت پیش آئی جو ہندوستانی کسی انگریزی سیاسی کارروائی کی نیک نیتی پر ہم رکھنے کے عادی ہیں۔ نیز اس یقین کے خلاف کہ جب وہ اپنی شکایات کو حق بجانب ثابت کر چکے ہیں تو انہیں خود بخود رفع کر دیا جائیگا۔ ہندوستان کے متعلق انگلستان کی مختلف پارٹیوں کی خودغرضی اور بے اعتنائی کو ارادۃً نظرانداز کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی فریب کاریوں کا تجربہ رکھنے کے بعد بھی وہ مزید روباہ بازیوں کا شکار ہونا پسند کرتے ہیں۔

یہ دیکھنا حیرت انگیز ہے کہ باوجود اس کے کہ موجودہ صورت حالات کے خلاف حقیقی شکایات موجود ہیں اور روزانہ ایسے دلخراش واقعات ہوتے رہتے ہیں جو اجنبی حکومت کی یاد کو تازہ کرتے رہتے ہیں اور باوجود اس کے کہ فوری تبدیلی کے آثار بھی نہیں

پائے جاتے، پھر بھی ہندوستانی آرا کی نیابت کرنے والوں میں چند ہی شورش پسند تھا۔ ایسے ہوں گے جو انگلستان سے رشتۂ تعلق کرنے کے حامی ہوں۔ مجھے تمام سیاحت میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو سنجیدگی کے ساتھ اس قسم کا خیال رکھتا ہو۔ وہ اپنی گزشتہ تاریخ کی برائیوں سے کماحقہٗ واقف تھے اور اپنی گفتگو اور افعال میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے مجھے یہ خصوصیت بہت امید افزا معلوم ہوئی کیونکہ میں ہندوستانیوں میں خود اختیاری حکومت کی اہلیت کا مطالعہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ غصہ، بیجا جوش اور سخت سست کلمات ہندوستان میں ناپید ہیں منطقی دلائل میں نے ہر جگہ سے جنکی بنیاد واقعات پر ہوا کرتی ہے اور یہی بہترین استدلال ہے۔

اگرچہ میں ذمہ دار لیڈروں کے غیر معمولی اعتدال کی تصدیق کرنے کے لئے تیار ہوں تاہم تعلیم یافتہ طبقوں سے ملاقات کرتے وقت میں نے ہمیشہ منافرت کی اس وسیع خلیج کا مشاہدہ کیا جو انفرادی طور سے حاکم و محکوم کو جدا کئے ہوئے ہے ہندوستان میں قومی منافرت کے مسئلہ پر بحث کرنا نہایت نازک کام ہے اور جب میں اسپر بحث کرنے کی جرارت کرتا ہوں تو میں اسکی ذمہ داری سے بھی ناواقف نہیں ہوں، اور اگر میں نے اس پر اظہار خیالات کرنے کا ارادہ کیا ہے تو محض اسوجہ سے کہ میں اس محض تصنع اور بناوٹ خیال کرتا ہوں کہ موجودہ ہندوستانی سوسائٹی کے اہم اور نمایاں پہلو کو نظرانداز کر جاؤں اور یہ کہ بعض ایسے ایسے پیش آجاتے ہیں جنکے خواہ کتنا ہی خطرہ کیوں نہ ہو سچائی کا بیباکی کے ساتھ اظہار کر دینا چاہئے اسلئے کہ یہ بہتر ہے کہ تکلیف دہ اور ذلت آفرین واقعات کو اس وقت بیان کر دیا جائے جبکہ دماغ قابو سے باہر نہ ہو گیا ہو بجائے اس کے کہ انہیں اسوقت پیش کیا جائے جبکہ جوش کے باعث صحیح رائے قائم کرنا ناممکن ہو جائے یہ میری قطعی رائے ہے کہ جو منافرت انگریزوں اور ہندوستانی اقوام میں اسوقت موجود ہے اگر اسے زیادہ فیاضانہ سلوک کے ذریعہ سے مٹانے کی

کوشش نہ کیجائے گی تو چند سال کے اندر اندر انگلستان اور ہندوستان کا باہمی تعلق رکھنا بالکل ناممکن ہو جائیگا اور دونوں کے دوستانہ تعلقات کا خاتمہ ہو جائیگا جو دونوں کے لئے یقیناً بہت بڑی مصیبت کے مترادف ہوگا اور ممکن ہے کہ بدامنی اور فسادات ایسے پیمانہ پر رونما ہوں جنکی مثال ماضی نے نہ دیکھی ہو۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ آئرلینڈ میں خوشگوار جذبات کا کس طرح سے خاتمہ کیا گیا اس کی ابتدا ناانصافی سے شروع ہوئی اور بعد میں ہمدردی کا عنصر کم ہوتا گیا یہی صورت حالات ہم مصر میں دیکھ رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ہم کل ہندوستان کی حالت سے بھی ناامید ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی اس کی حالت امید افزا ہے لیکن یہاں تو ناانصافی کیجا رہی ہے اور لوگ بیدار ہو گئے ہیں اور ان اشخاص کی حماقت پر اظہار ناراضگی کر رہے ہیں جو ہندوستان میں انگلستان کی نیابت کرتے ہوئے دیدہ و دانستہ انہیں ناراض کرتے ہیں اور تاوقتیکہ انگریزی پبلک جس سے ابھی تک ہندوستانی اقوام کسی قسم کا تنازعہ نہیں رکھتی اپنی بے اعتنائی کے خطرہ سے واقف نہ ہو جائیگی اسوقت تک عام قومی منافرت کم نہ ہوگی جسکے نتائج کی تلافی ناممکن ہوگی صرف اس قدر یاد رکھنا چاہئے کہ آئرلینڈ اور مصر آبادی اور وسعت کے اعتبار سے مقابلتہً بالکل معمولی ملک ہیں اور اس وجہ سے طاقت سے جلد مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان ایک وسیع براعظم ہے جہاں ہم سے دس گنی آبادی رہتی ہے اور جب کبھی وہاں انقلاب ہوا تو وہ اتنے وسیع پیمانہ پر ہوگا کہ ہم نے آج تک اس کا تجربہ نہ کیا ہوگا اور اسی بنا پر زیادہ خوفناک ہوگا۔ ایک مرتبہ ہندوستان کو آئرلینڈ و مصر کی طرح قومی منافرت کے جذبات میں متحدہ متفق ہونے دو، پھر دیکھو گے کہ وہاں ہماری حکومت کا خود بخود خاتمہ ہو جائیگا اسے ایک مرتبہ انگریزی انصاف سے ناامید ہونے دو، پھر انگریزی افواج اسے اپنے ماتحت نہ رکھ سکیں گی۔ ہندوستانی ہاتھی مزاج کا نرم ہے اور

ایک بچہ بھی اسپر سوار ہو سکتا ہے - وہ سمجھ دار ہے اور آسانی سے ہل جاتا ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لئے بدسلوکی کو کبھی برداشت نہیں کریگا اور جب اُسے سچ مچ غصہ آجاتا ہے تو وہ اپنی دسیع تعداد کے باعث خطرناک بن جاتا ہے اور پھر طاقتور سے طاقتور شخص بھی نہ تو اس کی رہنمائی کر سکتا ہے اور نہ اپنے قابو میں رہ سکتا ہے +

میرے ہندوستانی دوستوں میں سے بعض بوڑھے اور باخبر اشخاص نے (میں بنگالیوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان اشخاص کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور جن پر گورنمنٹ کو اعتماد ہے) صراحتہً بتایا ہے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین کس طرح سے بد اعتمادی کے جذبات پیدا ہوئے اور یہ بجائے خود سبق آموز ہے وہ کہتے ہیں کہ تیس چالیس سال پیشتر جبکہ ہم جوان تھے ہندوستانی سویلین افسروں کا ادب و احترام کرتے تھے اور ان سے محبت رکھتے تھے اگرچہ کمپنی کے افسروں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کی وجہ سے بری نظر سے دیکھے جاتے تھے اور جن سے بعض اوقات ہندوستانی خائف رہتے تھے۔ ہندوستانی کیرکٹر میں محبت جوش اور ادب و احترام کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ابتدا میں انگریز اپنی اعلیٰ قابلیت اور کیرکٹر کی مضبوطی کے باعث ہندوستانیوں پر نہایت خوشگوار اثر ڈالتے تھے تقریباً تمام بوڑھے اشخاص اُن کا ذکر نہایت ادب کے ساتھ کرتے ہیں جنھوں نے ابتدائی ایام میں تعلیم پائی تھی اور وہ شکریہ کے ساتھ اس اثر کو تسلیم کرتے ہیں جو انفرادی مثالوں کے ذریعہ ان پر اور اُنکی اولاد پر پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کا انگریز آج کل کے مقابلہ میں زیادہ اختیارات کا مالک تھا لیکن وہ انہیں زیادہ ذمہ داری کے ساتھ استعمال کرتا تھا اور اپنی عزت کا خیال رکھتا تھا۔ وہ باشندوں کی ضروریات سے واقف ہونے کی کوشش کرتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اُن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر وہ بہت ہی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے تو خیر ورنہ اُس تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھی وہ زیادہ تر لوگوں کے درمیان رہتا سہتا تھا اور انہی کی عادات و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اچھے آدمیوں کے ساتھ دوستانہ روابط رکھنے میں عار نہیں سمجھتا تھا اور بعض اوقات وہ انہی میں شادی کر لیتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض اعتبار سے اس کے نتائج خراب ہوں لیکن اس نے مشرق و مغرب کے تعصبات ذاتی کی دیوار کو تو ضرور مسمار کر دیا تھا اور افسر کے دل میں باشندوں کی طرف سے ذاتی دلچسپی پیدا کر دی تھی جو محض احساس فرض شناسی سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس زمانہ کا انگریز بسا اوقات ہندوستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتا تھا۔ انگلستان جانے کا راستہ افریقہ کے گرداگرد ہو کر جاتا تھا سفر تکلیف دہ اور گراں پڑتا تھا اور خط و کتابت کم اور دیر سے ہوتی تھی اور پنشن لینے کے بعد بہت سے افسر اپنے اس دوسرے وطن کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ وہ طویل طویل سفر کی تکالیف برداشت کرنے کے بجائے زندگی کے باقی ماندہ دن اسی سرزمین میں بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ کمپنی کے افسران ہندوستان سے اتنی محبت رکھتے تھے کہ ملکہ معظمہ کے افسر اتنی نہیں رکھتے۔ اور چونکہ انہیں محبت ہوتی تھی اس لئے وہ آج کل کے مقابلہ میں زیادہ اچھا کام کرتے تھے اور اس کا عوض انہیں یوں ملتا تھا کہ اُن سے بھی لوگوں کو گرویدگی ہو جاتی تھی +

مگر دخانی ذرائع آمد و رفت اور انگلستان سے تعلقات رکھنے کی سہولتوں نے کمپنی کی موت سے کچھ دن پہلے افسروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا تھا جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے اور سرعت پیدا کر دی تھی اور بالآخر اُسکو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔ رفتہ رفتہ جب انگلستان جانے میں زیادہ سہولتیں پیدا ہو گئیں رخصت کی درخواستیں بھی زیادہ ہونے لگیں تو ہر افسر جب اپنی طویل رخصت

سے واپس آتا تھا تو مغربی تعصبات کا نیا ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا تھا۔ وہ اپنے تئیں اتنے ملک کی سیاسی زندگی سے منقطع نہیں سمجھتا تھا یا کلیتہً ہندوستان کی سیاسیات سے متعلق نہیں سمجھتا تھا اور اس لئے وہ ہندوستان میں رہ کر نام پیدا کرنے کے بجائے اور اطراف کی جانب اپنی توجہ مبذول کرنے میں مصروف ہونے لگا سب سے آخر میں غدر نے (جسکے بعد بھی اس کی تلخ یاد باقی رہ گئی) اس بات کا خاتمہ کر دیا کہ انگریز ہندوستانی عادات سیکھیں اور ہندوستانیوں سے روابط و مراسم پیدا کریں ریلوے ڈاک کے جلد جلد آنے اور تار برقی کے پیغامات نے انگریز عورت کے دل میں یہ دہشت بٹھال دی کہ صرف ہندوستان ہی اسکی شادی کا میدان ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اب ہر انگریز جس مقام پر بھی اسکا تقرر ہو، انگریزی گھر کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ اس طریقہ سے ہر سال اُسکی دلچسپیاں انگریزی خبروں اور انگریزی واقعات کے باعث بڑھتی جاتی ہیں اور ہندوستان سے اسکی دلچسپیاں بتدریج کم ہوتی جاتی ہیں +

بلاشبہ لوگ مجھ سے ناراض ہوجائیں گے اگر میں یہ بات کہوں (اور یہ امر واقعہ ہی) کہ گزشتہ ۲۵ سال کے عرصہ میں نسلی غیریت اور تلخ احساسات کا آدھا سبب ہندوستان میں انگریزی عورت ہے کانپور اور لکھنؤ میں اسی کی موجودگی کا نتیجہ تھا کہ غدر کے بعد انتقام کی تلوار لٹکائی گئی اور اب بھی اسی کے روز افزوں رسوخ کا اثر ہے۔ کہ منافرت کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی جاتی ہے اور باہمی ارتباط کو ناممکن بنا رہی ہے میں نے بار بار اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ انگریز کلکٹر یا جج یا انگریز ڈاکٹر اپنے ہندوستانی ہمسایوں سے یا ماتحتوں سے مساوی طریقہ سے ملنا پسند کرتے ہیں مگر اُن کی بیویاں اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جانبین سے بے معنی سرد مہری کا برتاؤ ظہور میں آیا ہے۔

دنیا میں اس امر سے بڑھکر اور کوئی منظر پُر فریب نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی اور اینگلو انڈین مرد ایک ساتھ مجمعوں اور مجالس میں شریک ہوں کیونکہ کہ پھر وہاں کوئی چیز اصلی حالت میں نظر نہ آئیگی اور اکل و شرب کی چیزوں کے سوا ہر جگہ تصنع ہی تصنع ہوگا اور دلوں میں باہمی بے اعتمادی کے جذبات کھیدے طریقہ سے پنہاں رہینگے میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ ایسے مجمعوں کو ترتیب دینے میں مدد دی ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ تکلیف دہ رہا ہے

ہندوستان کی انگریز عورتیں اپنی جلاوطنی کے مقام کو قید خانہ سمجھتی ہیں اور وہاں کے باشندوں کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتی ہیں اور اپنی روانگی کے دن کو اپنے افق خیال پر اُمید کا ستارہ قرار دیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ احساس قدرتی ہو اسلئے کہ یہ اغلب ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں نسلی تعصبات زیادہ گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت نہایت ناخوشگوار ہے اور جس حالت میں کہ ملک میں تعلیم دن بدن بڑھتی جاتی ہے اسے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھنا چاہیئے +

اینگلو انڈین بالعموم یہ عذر پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم میں اور صاحب حیثیت ہندوستانیوں میں مراسم اس بنا پر ترقی نہیں پا سکتے کہ موخر الذکر ذات پات کی قیود میں جکڑے رہتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص سے جو نہ تو تمھارے ساتھ کھائے اور نہ پئے اور اپنی بیوی سے تمھیں ملائے، یقیناً تمھارے تعلقات گہرے نہیں ہو سکتے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ دلیل قابل سماعت نہیں ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، ہندوستانیوں سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی راہ میں ذات پات کے تعصبات بالکل حائل نہیں ہوتے۔ ان میں برہمن مسلمان، پارسی اور دیسی عیسائی سب شامل تھے اور نہ مجھے کوئی شخص ایسا ملا جو مساوی طریقہ سے ملنے کا خواہشمند ہو۔ میرے اور اُن کے خیالات میں ایسا گہرا اختلاف نہ تھا جو دور نہ کیا جا سکے، حالانکہ اگر وہ اطاوی یا ہسپانوی ہوتے تو اختلافات کبھی دور نہ ہو سکتے محض یہ وجہ کہ وہ میری روٹی میں سے ٹکڑا توڑ کر نہیں کھاتے تھے، دوستانہ تعلقات کی نشو و نما میں مانع نہیں آ سکتی۔ برخلاف اس کے یہ بدیہی ہے کہ کم سے کم دیسی عیسائیوں پر یہ بات عائد نہیں ہو سکتی۔ وہ ذات پات کی قیود سے آزاد ہیں لیکن باوجود اس کے انگریزی سوسائٹی کے دائرہ سے خارج ہیں +

انگلستان میں مشکل سے یقین کیا جائیگا لیکن ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی یہ حالت ہے کہ کوئی ہوٹل والا ہندوستانی کو اپنے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وجہ یہ نہیں کہ اس سے اُسے کسی قسم کی دشمنی ہے بلکہ اس لئے کہ اُسکے گاہک کم ہوجائینگے۔ جب میں بمبئی میں تھا تو ہر ہندوستانی کمیونٹی نے مجھ سے مہربانی آمیز برتاؤ کیا اور سب سے بڑھکر مسلمانوں کے لیڈر محمد علی روگھے نے مدارات کی وہ یورپ کی سیاحت کرچکے تھے، یوروپین لباس میں رہتے تھے، اور ہمارے اطوار کو اسقدر تک اختیار کرلیا تھا کہ تمام خیراتی کاموں میں چندہ دیتے تھے اور چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے جب میں نے اُن سے ایک دن ہوٹل میں آکر کھانا کھانے کی درخواست کی تو اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کم سے کم اس کمرے میں تو نہیں جسمیں سب کھاتے ہیں، مبادا انگریز مہمان برا مانیں اور اُٹھکر چلے جائیں +

بنگال اور شمالی ہندوستان میں حالات اور زیادہ ابتر ہیں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کوئی ہندوستانی شریف آدمی خواہ وہ کسی مرتبہ، عمر یا خصائل کا ہو، کم سے کم ایسے عام مقام پر نہیں جاسکتا جہاں انگریزوں کی گزرگاہ ہو، بالخصوص جبکہ وہ ملکی لباس میں ہو، کیونکہ اس میں بے عزتی اور بُرے سلوک کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس بارے میں ریلوے کا سفر ان کے لئے سخت خطرناک ہے اور تقریباً تمام ہندوستانی واقف کار اشخاص اپنے ہمسفر انگریزوں کی بدسلوکی کے شاکی پائے گئے ہیں۔ گارڈ انگریزوں کو جگہ دینے کے لئے انھیں نکال دیتے تھے اور چند مرتبہ اُن کی بیعزتی بھی کی گئی اور ٹھوکریں بھی ماری گئیں اعلیٰ درجہ کے ہندوستانی جنھیں خودداری کا پاس ہے، مجبوراً سفر کرنے سے پیشتر خاص انتظامات کرلیتے ہیں۔ یا تیسرے درجہ میں سفر کرتے ہیں۔ دوسرے درجہ سے وہ بدرجہ اتم خائف ہیں۔ میں ایسی بات ہرگز بیان نہ کرتا اگر مجھے اسکے صحیح ہونے کی شہادت ناقابل انکار ذرائع سے نہ مل جاتی۔ کلکتہ کی سوپریم لیجسلیٹو کونسل کے دو ممبروں سے بھی اسکی تائید حاصل ہوچکی ہے جنھوں نے علحدہ طور پر اپنے تجربات مجھے سنائے صوبہ کے بعض بڑے بڑے اشخاص نے جو یوروپین لباس اختیار کیا ہے اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بدسلوکی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک دردناک واقعہ میری موجودگی میں پیش آیا۔ چونکہ چشم دید واقعات معرفتی ہوا کرتے ہیں اسلئے میں اُسے یہاں درج کرونگا میں پٹنہ میں نواب ولایت علی خان کا مہمان تھا۔ اپنی پیرانہ سالی اور خدمات کے باعث نہ صرف ہندوستانیوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے بلکہ گورنمنٹ کے یہاں بھی اُنہیں نہایت وقار حاصل تھا یہاں تک کہ وہ سی آئی ای کے خطاب سے ممتاز تھے۔ ۷ جنوری کو صبح کیوقت وہ تیس چالیس صحاب کیساتھ مجھے چھوڑنے کے لئے اسٹیشن پر آئے میرے کمرے میں بیٹھ جانیکے بعد وہ پلیٹ فارم پر بدستور کھڑے رہے۔ ان سب کا طرز عمل نہایت باقاعدہ اور شریفانہ تھا۔ نہ کسی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ تھی، نہ شور تھا نہ بھیڑ بھاڑ۔ لیکن برابر کے کمرے والے انگریز کو "دیسیوں" کی موجودگی بہت خراب معلوم ہوئی کھڑکی میں سے اپنا سر باہر کرکے اس نے گالیاں دیں اور انہیں وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ اور جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے تو اپنی لکڑی سے انہیں مارا اور نواب صاحب کو خاص طور پر یہ کہکر دھمکایا کہ اگر تم قریب آئے تو میں اس لکڑی سے تمھاری خبر لونگا۔ میں اس شخص کی حیرت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جب اُس نے مجھے دخل اندازی کرتے ہوئے دیکھا ——— جب میں نے اُسے ڈانٹا تو وہ میری طرف غصہ کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، بہرحال یہ اسکا فعل تھا میرانہ تھا۔ میرا کیا استحقاق تھا کہ میں ایک انگریز اور اس کے قدرتی حق کے درمیان حائل ہوں؟ اور جب تک پولیس کی امداد میں نے حاصل نہ کی اسوقت تک وہ غالباً اپنی مظلومیت ہی کا یقین رکھتا تھا۔ میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ

پڑھنا

ارتقاء حقیقت

(نظم)

ٹامس ہارڈی کی ایک نظم نے جسکی نقل بھیج رہا ہوں مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے بحر و قوافی کی ترتیب مجھے بہت پسند آئی تھی۔ یوں تو پہلے سے اس نظم کو اردو میں ترجمہ کرنے کا خیال مجھے تھا۔ لیکن جب کالج میں طلبا کو انگریزی عروض (Prosody) پڑھانے کا موقع آیا تو یہ خیال دل نشین ہوگیا کہ ہر زبان میں بحریں بیشمار ہوسکتی ہیں آوازوں کی جو ترتیب انگریزی میں یا کسی زبان میں موزوں (metrical) ہے وہ اردو میں بھی موزوں ہوگی۔ چنانچہ ہارڈی کی اس نظم پر جب اس ارادے سے پھر غور کیا تو ایک دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ اصل نظم میں ہر بند کا آخری مصرع میر کی مشہور غزل "الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا" کی بحر میں ہے انگریزی نظموں کے ترجمے اردو نظم میں اکثر ہوئے ہیں لیکن غالباً یہ امر پہلی بار اسی ترجمے میں ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ترجمہ کا ہر مصرع اسی بحر میں ہو جس بحر میں اصل مصرع ہے اور قوافی کی ترتیب بھی وہی ہے جو اصل میں ہے اصل کے ایک مصرع کا ترجمہ کرکے مصرع سے بغور تقابل کرنے سے یہ واضح ہوجائے گا۔

(نغمۂ ماہ و سال) (رگھوپت سہائے فراق بی اے)

(۱)	
اَب تک کھل نہ سکا یہ راز	Last, as first, the question sings
کیوں ہے یہ عالم سوز و گداز	Of the Will's long travellings.
کیوں قدرت نے	Why the All-mover
کیوں فطرت نے	Why the All prover
ہر اک شے سے چھیڑ دیا ہے درد بھرا یہ نغمۂ ساز	Ever urges on & measures out the droning tune of things
(۲)	(2)
بے حس و بیجاں	Heaving dumbly
کچھ تغیّر	As we deem
خواب پریشاں	Moulding numbly
کی تصویر	As in dream
بیخبر اُس سے کہ ہر حال میں ذی احساس ہر اک گیر	Apprehending not how fare the sentient creatures of its scheme
(۳)	(3)
کیا ہوگی نہ یہ ظلمت دور	Nay, Shall not its blindness break
کیا ہوگی نہ یہ غفلت دور	Aye, shall not its heart awake

(نغمۂ ترحم)

Gently tending	رفتہ رفتہ
To its ending	درجہ بدرجہ
In a genial germing purpose & for loving Kindness' sake	کیا نہ دل فطرت بدلے گا ہو کے محبت سے مجبور
(4)	(۴)
Should it never	جو یہ حالت
Mend or cure	یونہی رہی
Aught whatever	جو یہ اذیت
Those endure	کٹ نہ سکی
Whom it quickens, let them darkle to extinction swift & sure.	مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی
(5)	(۵) (آخری ترانہ)
But a stirring thrills the air	لیکن کچھ ہے فضا لرزاں
Like to sounds of joyance there	جوش تموج سے ہے عیاں
That the rages	ساری بلائیں
Of the ages	غم کی صدائیں
Shall be cancelled & deliverance offered from the darts that were	مٹ جائینگی اور نہ چلیں گے دکھتے دلوں پر پھر پیکاں
Consciousness the Will informing till it fashion all things fair	فطرت کو ہوش آئیگا۔ دنیا ہو جائیگی رشک جناں

(Thomas Hardy) — فراق گورکھپوری

شادی کب کرنا چاہیے

علم اجتماع بشری کے ماہرین اس مسئلہ میں مختلف ہیں کہ آیا انسان کو حد بلوغ تک پہونچکر معرکہ حیات میں قدم رکھتے ہی اپنے لئے ایک شریک زندگی کی تلاش کر لینی چاہیے جو رجا و بیم، کامیابی و ناکامی عزت و ذلت غرض حیات کے ہر روشن اور تاریک پہلو میں اسکے ساتھ رہے یا اس انتخاب کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہیے جب تک کہ ہئیت اجتماعی (سوسائٹی) میں اپنے لئے ایک ایسا مرکز نہ بنالے جس پر اس کی اور اس کی شریک حیات کی آئندہ زندگی کا مدار ہو۔

اجتماعیئن کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ شہری زندگی میں ہمکو جو اخلاقی فساد، اور خرابیاں نظر آتی ہیں اس کا اساسی سبب صرف یہ ہے کہ انسان کی شادی اسی زمانہ میں نہیں ہوتی جو قدرت نے میلان جنسی کے لئے مقرر کیا ہے، عام طور پر بیس سال کی عمر میں انسان کے دماغی اور جسمانی قویٰ نشو و نما پاکر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ بخوبی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں برداشت کرسکے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بمشکل کسی نوجوان کی شادی تیس سال سے کم عمر میں ہوتی ہے، حد طبعی سے یہ تجاوز جو کبھی دس سال بھی زیادہ ہوجاتا ہے نظام اجتماعی میں شدید ترین مفاسد، اور برائیوں کا سبب ہے جس کے نتائج آج ہم متمدن دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے برعکس قصبات، اور دیہات میں، یا ایسے ملکوں میں جہاں جوان ہوتے ہی شادی کردی جاتی ہے یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں، اجتماعیئن کی اس رائے سے کہ جوان ہونے کے بعد فوراً شادی کردینی چاہیے، مذہبی لوگ بھی اتفاق کرتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی ایک بڑی جماعت، اور خاصکر مذہب (　　　　) کی تائید کرنے والے (جو نوع انسانی کو حفظ صحت اور دوسری قسم کی خاص تدبیر اختیار کرنے سے زیادہ خوبصورت اور مکمل بنانے کے قائل ہیں) اس عمر میں شادی کرنے کے شدت سے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمر پختہ ہونے سے قبل شادی کردینے سے جو خرابیاں اور غیر قابل تلافی نقصانات نوع بشری کو پہونچتے ہیں اور بطریق توارث ان کا سلسلہ آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے، وہ اُن مفاسد سے کہیں زیادہ مصیبت خیز ہیں جو بہ دیر شادی کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ اس کی مثال میں وہ قومیں پیش کیجا سکتی ہیں جنہیں نوجوان ہوتے ہی یا اُس سے بھی پہلے شادی کرنے کا رواج ہے، مثلاً جزائر بحر پسفک اور امریکہ کے قدیم باشندوں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں جو نسلی اور دماغی کمزوریاں پائی جاتی ہیں اس کا تنہا سبب پختگی سے قبل شادی کردینے میں مضمر ہے۔ ایک شادی کرنے والا نوجوان ان دونوں متناقض مشوروں کو سنکر حیران رہجاتا ہے کہ کونسی رائے قابل عمل ہے، اور اس کا یہ تردد بالکل بجا ہے کیونکہ اسے دونوں جانب عقلا اور اہل علم کی ایک بڑی جماعت نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک، اس کے لئے ایسی صورت میں بہتر ہے کہ تقلید کو چھوڑ کر واقعات پر نظر ڈالے اور بچشم خود افراد،

جماعات، اور اقوام کا مطالعہ کرکے ایک صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرے،

نیویارک کا ایک مشہور ڈاکٹر لکھتا ہے "میں نے ایسی ماؤں کو دیکھا جن کی عمر پندرہ سال سے متجاوز نہیں تھی، لیکن ان کے چہرہ پر ضعف اور خون کی کمی کے آثار بالکل نمایاں تھے، ان کی صورتیں دیکھ کر ایک ڈاکٹر بہ آسانی اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ یہ عورتیں جسمانی کمزوریوں کا شکار اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ انھوں نے اپنے نشو و نما کے کمال تک پہونچنے سے پہلے اپنی قوت جسمانی ولادت اور دیگر مہماتِ خانگی میں ضائع کر دی۔ الغرض اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات پندرہ سولہ سال کی لڑکیاں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک لڑکے کی شادی کسی حال میں بھی ۲۵ سال سے پہلے اور لڑکی کی ۲۲ سال سے پہلے نہ کرنا چاہیے۔

ناپختگی سے قبل شادی کرنے میں کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ مردوں کی جسمانی قوت کمزور ہو جاتی ہے عورت کا خون کم ہو جاتا ہے اور اس ضعف کی وجہ سے وہ امراضِ عصبی کی وجہ سے دق اور سل وغیرہ کا شکار ہو جاتی ہے، جن ملکوں میں لڑکی کی شادی جلد کر دینے کا رواج ہے وہاں تم دیکھو گے کہ ۳۰ برس کی عمر میں عورتوں کے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور شباب کا دور ختم ہو جاتا ہے بخلاف اس کے جن ملکوں میں ۲۰ سال کی عمر کے بعد شادی کرنے کا دستور ہے وہاں عورتیں تندرست، قوی اور باہمت ہوتی ہیں اور اُن کا حسن و شباب بھی دیرپا ہوتا ہے۔

نوجوان ہوتے ہی شادی کرنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ جو اولاد ایسے والدین سے پیدا ہوتی ہے ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ بالکل کمزور ہوتے ہیں اور اگر اسی طرح کئی نسل تک شباب کامل سے قبل شادیوں کا سلسلہ جاری رہے تو ہر آنے والی نسل پچھلی سے ہر حیثیت سے کمزور ہوتی جائے گی

یوجنسٹ (　　) خیالات کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی قوم میں ہرگز کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہو سکتا جن میں ایک صدی کے اندر چار نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض تو کہتے ہیں کہ تین نسلیں بھی ایک صدی میں نہ ہونی چاہیے جس کا مطلب یہ ہوا کہ باپ کی عمر کسی حال میں بھی ۳۳ سال سے کم نہ ہو۔

بظاہر اس میں بہت زیادتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک صدی میں تین سے زیادہ نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر اگر دقیق بحث کی جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم ترین لوگ اس وقت بھی امریکہ میں جو بڑے بڑے اربابِ علم و حکمت ہیں اُن کے باپ کی عمر بھی اُن کی ولادت کے وقت ۴۰ سال سے کم نہیں تھی۔ اور ان میں اب کوئی نہیں ہے جس کی ولادت کے وقت اُس کے باپ کی عمر پچیس سال یا اس سے کم ہو۔

آج کل علمائے نسلیات بیٹے کی ولادت کے وقت باپ کی عمر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ باپ کی عمر اُس کی اولاد کی جسمانی اور

ذہنی حالت پر بہت کچھ اثر ڈالتی ہے، ایک ہی والدین کی مختلف اولاد میں بلحاظ ان کی عمر کے بڑا فرق ہوتا ہے، ذیل میں ہم چند مشاہیر عالم کے ناموں کے ساتھ ان کے باپ کی عمر درج کرتے ہیں اور یہ عمر اس وقت کی ہے جب ان مشاہیر کی ولادت ہوئی

فرنکلین	۵۱ سال
اِرونگ	۵۲ سال
وبسٹر	۴۳ سال
بتیشر	۴۰ سال
واشنگٹن	۴۰ سال
گوئٹے	۵۳ سال
ملٹن	۴۵ سال
کونفشیوس	۴۵ سال
بسمارک	۴۴ سال
اڈیسن	۴۴ سال
شکسپیر	۴۰ سال

علما نسلیات کو اس حقیقت پر اس درجہ یقین ہے کہ اُن میں سے ایک عالم نے ۴۰ پونڈ انعام اس شخص کے لئے مقرر کیا تھا جو یہ ثابت کرے کہ دنیا میں مشہور آدمی کے باپ دادا اور پردادا ایک ہی صدی میں گزرے ہوں اس انعام کے مقرر کرنے پر ہر چند کوشش کی گئی مگر ایسی کوئی مثال نہ مل سکی۔

اگر ہم انسان کی عمر کا بہ لحاظ اوسط مطالعہ کریں تو اس سے بھی ہماری مقصد کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ایک ڈاکٹر نے ۱۰۵ اشخاص کے والدین کی عمر معلوم کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر والدین کی اوسط عمر ۲۵ سال ہوتی ہے تو اُن کی اولاد کی اوسط عمر ۶۵ سال ہوتی ہے اور اگر والدین ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان ہوتے ہیں تو ان کی اولاد کی اوسط عمر ۶۶ سال ہوتی ہے اور اگر وہ ۴۰ اور ۴۹ کے درمیان ہوتے ہیں تو اولاد بلحاظ اوسط ۷۰ سال زندہ رہتی ہے اور پچاس یا اس سے زائد عمر ہونے کی صورت میں اولاد کی اوسط زندگی ۷۵ سال تک پائی گئی ہے اور اُسکی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی عمر پختہ ہوجاتی ہے تو امراض کے حملوں سے زیادہ محفوظ رہتا ہے اور دفع مرض کی قوت اسمیں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے، اور یہی صفت بطور وراثتِ نسلی اولاد میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دماغی اور جسمانی قوتیں مضبوط اور عمریں طویل ہوتی ہیں۔

کمسن کی شادی میں جہاں اور مضرتیں ہیں وہاں ایک زبردست خرابی یہ بھی ہے، کہ زوجین بوجہ ناتجربہ کاری، خانہ داری کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل نہیں ہوتے اور ان کے درمیانی تعلقات اُن کے ذاتی خیالات کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ دونوں کے خاندان صحیح یا فاسد مشوروں پر

مبنی ہوتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اکثر خانگی فساد اور فتنے برپا ہوتے رہتے ہیں، جن کا نقصان خاندان کے چند افراد تک محدود نہیں رہتا بلکہ بحیثیت مجموعی تمام قوم کے لئے باعث تباہی ہوتا ہے، کیونکہ قوم نام ہے انہی خاندانوں کے مجموعہ کا لہٰذا میں ہر ایسے نوجوان کو جو شادی کرنا چاہتا ہے یہی مشورہ دونگا کہ وہ اس مسئلہ میں عجلت نہ کرے جب تک کہ اُس کی عمر پختگی تک نہ پہونچے، شادی کی عمر گرم ملکوں میں ۲۵ سال اور سرد ملکوں میں ۳۰ سال ہونا چاہئے تاکہ خود زوجین اور ان کی اولاد حفاظت کی عمر دراز ہو اور اولاد صحیح تندرست اور ہر قوت کے لحاظ سے مکمل پیدا ہو اور یہی جنس بشری کو اوج کمال، اور معراج ترقی پر پہونچانے کا واحد ذریعہ ہے،

(ماخوذ) **ابوالمحاسن محمود علیخان**

جنوری ۱۹۲۸ء کا "نگار"

(۱) ۱۵۰ صفحات پر شائع ہوگا۔ یعنی بجائے ۶ جزو کے تقریباً ۱۰ جزو کے مضامین اس میں ہوں گے

(۲) کلام مومن پر ایسا بسیط و مکمل تبصرہ شائع ہوگا کہ اس سے قبل کبھی شایع نہیں ہوا۔ مومن کے مفصل حالات ہونگے اور اُسکی شاعری کے مختلف اصناف اور شاگردان مومن پر نہایت جامع و مکمل تنقید ہوگی اور اس کے کلام کا ایسا انتخاب ہوگا کہ اس کی کلیات سے آپ بے نیاز ہو جائیں گے۔ یہ مضمون بجائے خود ایک مستقل رسالہ ہے۔ جو جنوری ۱۹۲۸ء کے نگار میں شائع کیا جائے گا اور جسپر پچاس روپیہ کا ہدیہ نگار کی طرف سے صاحب مضمون کو پیش کیا گیا ہے

(۳) "علم النفس" پر ایک نہایت ہی بیش بہا اور نادر مضمون ہوگا اور بہت سے ان سربستہ رازوں کا انکشاف کریگا جن سے دنیا اسوقت بالکل ناآشنا ہے۔

(۴) مولانا نیاز فتحپوری کا ایک نہایت ہی بے مثل فسانہ شایع ہوگا اور اسی کے ساتھ اُن کی ڈائری کے دو ورق اور شائع ہونگے۔ (ایک ورق اس اشاعت میں بھی درج ہوا ہے صفحہ ۶۶ لغایتہ صفحہ ۷۰)

(۵) علاوہ ان کے اور بھی دلچسپ افسانے اور علمی مضامین ہوں گے اور وہ تمام خصوصیات جو نگار کے لئے مخصوص ہیں زیادہ نمایاں طور پر اس اشاعت میں نظر آئیں گی۔

(۶) خریداران نگار سے کوئی قیمت زاید نہیں لیجائے گی، لیکن جو صاحب صرف اس نمبر کو حاصل کرنا چاہیں گے اُن سے عہ علاوہ محصول لیا جائیگا

(۷) وہ قدیم خریدار جنکی خریداری نومبر یا دسمبر میں ختم ہوتی ہے اگر وہ اپنا چندہ پانچ روپیہ ذریعہ منی آرڈر پیشگی بھیجدینگے تو انکو جذبات بھاشا کی بھی ایک جلد بالکل مفت ملیگی (جس کی قیمت مع محصول ڈاک عہ ہے) گویا اس طرح ۱۹۲۸ء کے لئے نگار کا چندہ صرف للعہ رہجاتا ہے اور جنوری کا ضخیم رسالہ بھی بغیر کسی اضافہ کے ہات آتا ہے۔

مینیجر نگار۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

ہندوستان کی معاشیات پر ہیانکی معاشرت کا اثر

تمہید کسی ملک کی پیدائش دولت پر مختلف حالات کا اثر پڑتا ہے۔ اگر حالات اس قسم کے ہوں جو پیدائش کے ممد و معاون ہوتے ہیں تو دولت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی اور اگر حالات نامساعد ہوں تو ابتدائی حالت سے بھی ترقی مشکل ہے۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسانی کوششوں کو کچھ دخل نہیں اگر قدرت ان کے حال پر مہربان ہے تو ملک مالا مال ہے اور اگر نامہربان تو ویران۔ اس سے ہماری مراد ہر ملک کے جداگانہ جغرافیہ سے ہے مثلاً انگلستان کہ وہاں کوئلے اور لوہے کی کانیں بکثرت موجود ہیں جو آج کل صنعت و حرفت کی ترقی کا اہم جزو ہیں اس کے علاوہ تمام ملک سمندروں سے گھرا ہوا اور اس لئے قدرتی طور پر دشمنوں سے محفوظ ہے۔ آب و ہوا سرد جسکی بدولت باشندے محنتی اور جفاکش ہیں۔ اب کیا یہ حالات انسانی کوششوں سے پیدا ہو سکتے ہیں؟ برخلاف اس کے ملک عرب ہے کہ ریگستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں بارش کی قلت آب و ہوا گرم اور ذرائع معاش تنگ ہیں۔ یہ اسباب قدرتی طور پر اُن کی زندگی کو سادہ بنائیں گے۔ ایسی صورت میں دولت بڑھے تو کہاں سے۔ اس کے علاوہ ایک صورت اور ہے یعنی ملک کا جغرافیہ بھی پیدائش دولت کے موافق ہو زمین بھی زرخیز ہو اور قدرتی وسائل بھی موجود ہوں لیکن پھر بھی جو دولت پیدا ہونی چاہئے وہ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت جہالت۔ لاعلمی۔ سہل انگاری۔ کاہلی اور سب سے بڑھکر سیاسی دباؤ سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہ حالت بے حد افسوس ناک ہے اس تیسری صورت کی مثال میں ہمارا ہندوستان پیش کیا جا سکتا ہے۔

بیشک قدرتی حالات کو انسان تبدیل کر کے اپنی حسب منشا نہیں بنا سکتا اور نہ پیدائش دولت ہی میں (قدرت کی ناموافقت کی صورت میں) ———— زیادہ اضافہ کر سکتا ہے۔ لیکن بہت سی صورتیں ہماری اختیاری بھی ہیں جنہیں وہ حسب ضرورت ترمیم و تبدیل کر سکتا ہے اور جن پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے پیدائش دولت میں زیادتی اور کمی ہو سکتی ہے ان اختیاری صورتوں میں سے سب سے اہم کسی ملک کی طرز معاشرت ہے کیونکہ مختلف قسم کی طرز معاشرت سے ملک میں مختلف حالات پیدا ہو سکتے ہیں اور یہی بہت کچھ ملک کی ترقی و تنزل کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہر ملک کا طبعی رجحان۔ رسم و رواج اور طریق زندگی مختلف ہوتا ہے جسکا لازمی نتیجہ وہاں کی پیدائش دولت پر پڑتا ہے۔ ہم یہاں ہندوستان کو پیش نظر رکھکر نظم معاشرت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس طریق کا یہاں کی معاشیات پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ آیا وہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے مفید ہے یا مضر۔

طریق ذات بندی کے اثرات سب سے پہلے یہاں کی طریق ذات بندی کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس کا پیدائش دولت پر کیا اثر پڑ رہا ہے، اُس پر غور کرنے سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہاں ذات بندی کا طریقہ کس طرح رائج ہوا اور اسوقت کیا فوائد پیش نظر تھے۔

جب آریہ ہندوستان آئے تو انھوں نے اپنی قوم کو ہندوستان کے اصلی باشندوں سے بالکل الگ رکھا۔ جیساکہ ہر فاتح کا دستور ہے (کسی نئے ملک اور غیر قوم پر فتح حاصل کرنے کے بعد حکومت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ مفتوحین کو اپنے میں جذب کر لیا جائے کہ دونوں ایک ہوجائیں اور محکوم رعایا کو اپنا بنائے یا یہ کہ خود اُن میں جذب ہوجائے اور اپنی تمام خصوصیات کھو بیٹھے۔ اگر فاتح قوم مفتوحین کو اپنے میں جذب کرنے کے بجائے خود اُن میں جذب ہوگئی تو یہ فتح نہیں بلکہ حقیقی شکست ہے اور وہ قوم بجائے فاتح کے مفتوح ہوجائیگی۔ جس طرح ایرانیوں نے یونان پر فتح پائی لیکن ان کے تمدن اور علم سے مرعوب ہوکر خود ان میں ضم گئے۔ بہتر صورت تو یہی ہے کہ مفتوحین کو اپنے میں ضم کرے لیکن یہ صورت نا ممکن ہو تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے کو مفتوحین سے بالکل علیٰحدہ رکھے جس طرح حجاج ابن یوسف نے اس قدر فتوحات کے باوجود عربوں کو دوسری قوموں سے علیٰحدہ رکھا۔ دور کیوں جائیں ہمارے سامنے ہندوستان میں خود انگریزوں کی مثال موجود ہے انھوں نے اپنی قوم کو ہندوستانیوں سے بالکل الگ رکھا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انکی قلیل تعداد بیشمار ہندوستانیوں کو اپنے میں جذب نہیں کرسکتی اور اس کوشش میں بہت ممکن ہے کہ وہ خود ہندوستانیوں میں جذب ہو جائے۔ پس انھوں نے طریق حکمرانی کے دوسرے اصول پر عمل کرکے اپنی قوم کو علیٰحدہ رکھا۔ اکبر نے پہلے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود نامعلوم طریقہ پر ہندوؤں میں جذب ہوتا چلا جارہا تھا۔ اورنگ زیب نے بروقت اس خرابی کو محسوس کرلیا اور راجپوتوں کی قوت توڑنے کی کوشش کی) اسی اصول کی بنا پر آریوں نے بھی اپنے کو قدیم باشندوں سے علیٰحدہ رکھنا چاہا۔

پہلے پہل جب یہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان میں ذات بندی نہیں تھی بلکہ سب کے سب آریا کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان میں کوئی خاص کام کسی خاص فرقے یا جماعت کے سپرد نہیں تھا بلکہ سبکے سب ملکر کاشتکاری۔ لڑائی۔ اور مذہبی کام انجام دیتے تھے تھوڑے دنوں بعد اس طریق کار میں دقت محسوس ہوئی (یعنی ایک ہی شخص مختلف اوقات میں مختلف کام انجام دے) اس طرح وہ نہ تو فن سپہ گری میں ماہر ہوسکتے تھے اور نہ زراعت و تجارت میں۔ اس دقت کو محسوس کرکے تقسیم عمل کے اعلیٰ اصول کی بنا پر انھوں نے جو شخص جس کام کے لئے موزوں تھا وہ کام اس کے سپرد کیا اب ایک ایک گروہ کے ذمہ ایک ایک کام ہوگیا۔ جو مذہبی رسوم ادا کرتے اور درس و تدریس کا کام انجام دیتے وہ برہمن سپاہی پیشہ کھتری۔ تجارت پیشہ ویش اور اصلی باشندے (جنکا کام سوائے غلامی اور ادنیٰ درجہ کا کام انجام دینے کے کچھ نہ تھا) شودر کہلانے لگے جب ہر فرقے کے ذمہ ایک ایک کام سپرد کردیا گیا تو وہ بیفکر ہوکر اپنے فرائض کو سرگرمی سے انجام دینے لگے کام کی تقسیم ہوجانے سے آریوں نے پہلے پہل بہت ترقی کی۔ اسوقت اس ذات بندی کے یہ معنی نہیں تھے کہ کوئی برہمن یا کھتری (اگر وہ چاہے تو) زراعت یا تجارت نہیں کرسکتا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ذات پات کی سختی بڑھتی گئی اور ان فرقوں میں سے مختلف فرقے پیدا ہونے لگے اور جو پیشہ جس فرقے نے اختیار کیا کچھ دنوں بعد وہ رسماً اور مذہباً اسکو ترک نہیں کرسکتا تھا۔ زمانہ گزشتہ میں تو ذاتوں کی تقسیم سے فائدہ پہونچا لیکن اب اسی ذات بندی کی رسم سے ہندوستان کو

نقصان پہونچ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاشی جد و جہد آج کل روز بروز ترقی پذیر ہے دنیا جس قدر نئی نئی ایجادیں اور اہم معلومات حاصل کر رہی ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسوقت یہ کہنا کہ طریقِ ذات بندی مثل اس روڑے کے ہے جو چلتی گاڑی میں اٹک جائے غلط نہ ہوگا۔ ذات بندی کی قیود سے عموماً ایک پیشہ ور دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا اُس کے علاوہ نئی نئی ایجادوں سے مکمل فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ ذات بندی میں کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں مثلاً لڑکے بچپنے سے اپنے والدین کو ایک ہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسے اپنے والدین سے سیکھتے ہیں جو نہایت تن دہی اور شفقت سے اُن کو سکھاتے ہیں، لیکن دقت یہ ہے کہ لڑکے کا بزرگ جتنا خود جانتا ہے اس سے زیادہ کس طرح بتا سکتا اور نئی نئی ایجادوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ خصوصاً آج کل جبکہ روز بروز مصنوعات کو فروغ ہو رہا ہے اگر ذات بندی کا طریقہ نہ ہوتا تو ہر ایک پیشہ ور اپنے لڑکے کو جس کام میں چاہتا شریک کر سکتا تھا گو یا یہ طریقہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور لوگ ذات بندی کی قیود سے آزاد ہونا شروع ہوگئے ہیں خصوصاً تعلیم یافتہ لوگوں اور پیشوں میں یہ قید باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی بہت باقی ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے ملک کی پیدائش دولت کو نقصان پہونچانے کے لئے کم نہیں ادنیٰ طبقوں میں اگر کسی پیشے میں لوگوں کی کثرت ہو تو وہ فوراً اسکو چھوڑ کر کسی ایسے کام میں جسمیں لوگوں کی ضرورت ہو نہیں جاتے۔ ایسی صورت میں ایک طرف تو لوگوں کی زیادتی کی وجہ سے پیشہ وروں کی آمدنی کم ہوتی ہے اور دوسری صورت میں آدمیوں کی قلت سے اس قدر کام نہیں ہو سکتا جتنے کی ضرورت ہے۔

پیدائش دولت میں عورتوں کی عدم شرکت

ہندوستان کی آبادی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کمانے والوں کے مقابل کھانے والے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات ایک شخص کو پورے خاندان کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں کے عام لوگ پست ہمت اور تھوڑی آمدنی پر قناعت کرنے والے ہیں۔ یہاں بیکاروں۔ محتاجوں اور فقیروں کی کثرت ہے۔ اول تو دولت پہلے سے کم ہے دوسرے اُن کی وجہ سے اور کمی ہو رہی ہے۔ یونان میں جسوقت شہری مملکتیں تھیں اُسوقت اسپارٹا میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی بچہ کمزور یا ناقص پیدا ہوتا تو اس کو حکومت کی طرف سے ضائع کر دیا جاتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کی آمدنی بیکاروں پر نہ صرف ہو۔ ہندوستان میں پیدائش دولت کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی عورتیں عموماً بلا واسطہ پیدائش دولت کی کمی کی باعث ہیں بلکہ زیادہ تر بیشتر خانہ داری کے کام انجام دیتی ہیں۔ یہاں کی طرز معاشرت ہی اس قسم کی ہے کہ عورتیں ایسے کاموں میں بہت کم حصہ لے سکتی ہیں عام طور سے یہاں کے لڑکے بھی بڑی عمروں تک والدین کے سر رہتے ہیں (اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ بچوں کو کم عمر میں محنت مشقت کرنی چاہیئے یا عورتوں کو امور خانہ داری ترک کر دینی چاہیئے، بلکہ اس بیان سے ہمارا مقصد صرف عام واقعہ کا اظہار ہے)

غیر مساوی آبادی

ہندوستان کی آبادی بہت کچھ تو قدامت پسندی اور کچھ قدرتی اسباب کی بنا پر اس قدر غیر مساوی طور سے پھیلی ہوئی ہے جس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ ہندوستان کی آبادی کا غیر مساوی ہونا اسی سے ثابت

ہوتا ہے کہ یہاں آبادی کا اوسط کچھ کم تیس سے لیکر تقریباً ایک ہزار فی مربع میل نکلتا ہے۔ یورپ کے کسی ملک میں آبادی کی تقسیم اس قدر غیر مساوی نہیں جب تک ملک میں آبادی، مساوی طور سے نہ ہو اس وقت تک دولت اتنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جتنی مساوی تقسیم کی صورت میں پیدا ہوتی ہے ہندوستان میں کمی دولت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جہاں آدمی ہیں وہاں کام کم اور جہاں کام ہے وہاں آدمی نہیں۔ اب دولت بڑھے تو کس طرح۔ اگر آبادی مساوی طور سے پھیل جائے تو بیکار مزدور کام سے لگ جائیں اور بیکار رہنے کے معنی دولت پیدا کرنا ہے ہندوستان کی آبادی کو مساوی کرنے کی صورت یہ ہے کہ لوگ ترک وطن اختیار کریں۔ لیکن یہاں کے باشندے اُس کے خوگر نہیں۔ دوسرے یہاں نقل و حرکت پر ذات اور مقام کا خاص اثر پڑتا نظر آتا ہے۔ یہاں کے باشندے قدامت پسند ہیں اور عموماً اپنے وطن اور احباب و اعزہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ قدامت پسندی کا مادہ خصوصیت سے یہاں کے کاشتکاروں میں بہت زیادہ ہے۔ اپنی پرانی جگہ تنگی ترشی سے گزر کرتے ہیں لیکن ترک وطن منظور نہیں کرتے۔

کمسنی کی شادی

ہندوستان کی بہت سی بری رسموں میں سے ایک یہاں کی کمسنی کی شادی بھی ہے کمسنی کی شادی سے قبل اسکے کہ قوا پورے طور سے نشو نما پائیں اولاد ہو جاتی ہے جس سے اول تو بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے اور عموماً مائیں مختلف امراض میں مبتلا ہو کر چھوٹی سی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ اور جو زندہ رہتی ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ اولاد کی پرورش کے اہم کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ جس سے بہت سے بچے کم عمری میں ضائع ہو جاتے ہیں اور بقیہ جو پل کر جوان ہوتے ہیں اُنکی جسمانی اور دماغی قوتیں بھی تشفی بخش ثابت نہیں ہوتیں۔ لہذا ایسی پیدائش کا فائدہ ہی کیا جس سے سوائے تکلیف اور نقصان کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ کم عمری کی شادی سے مردوں پر قبل اس کے کہ وہ کمائیں دہرا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ یورپ میں حالت اس کے بالکل برعکس ہے وہاں کی عورتوں کی شادی عموماً پچیس سے لیکر پینتیس برس کی عمر تک ہوتی ہے۔ اولاد زیادہ پیدا ہونے اور زیادہ مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کم ہو مگر زندہ رہے اور ملک کے کام آئے۔ (کم عمری کی شادی کا رواج بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی ہندوؤں اور خصوصاً نیچے طبقے کے ہندوؤں میں یہ رسم بڑی حد تک باقی ہے)

زراعت پیشوں کی زیادتی

ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ زراعت پیشہ ہے۔ یہ طبقہ سب سے زیادہ قدامت پسند ہے اور کوئی دوسرا کام کرنا نہیں چاہتا۔ ہر کاشتکار کسی نہ کسی طرح تھوڑی سی بھی زمین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمین محدود ہے اور خواہشمند زیادہ اس لئے زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہاں کا کاشتکار حتی المقدور زمین ہاتھ سے جانے نہیں دیتا بعض اوقات تحصیل میں اُس کو لگان سے بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

دولت کو بطور اندوختہ رکھنا

ہندوستانیوں میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ دولت کو اصل بنانے کی بہت کم کوشش کرتے ہیں۔ اُنکی دولت زیادہ تر بشکل اندوختہ پڑی رہتی ہے دوسری طرف پیدائش دولت کے جتنے شعبے ہیں ان میں اصل کی

ضرورت بڑھ رہی ہے۔ ان خصوصیات کے یکجا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی دولت بیکار اندوختوں کو اصل بنانے سے پیدا ہو سکتی تھی وہ نہیں رہی ہے۔ ہم نے ہندوستان کی طرز معاشرت کے متعلق جو کچھ بیان کیا اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ بطور مجموعی پیدائش دولت میں جس قدر رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور اس طریق زندگی سے ملک کا کیا کچھ نقصان نہیں ہو رہا ہے۔ پھر لطف یہ کہ تمام نقصان ہمکو کسی ناقابل شکست مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی ہی جہالت اور لاعلمی سے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اگر قوم پرست ان امور کی طرف توجہ کریں اور ان رسوم اور خیالی نیوؤں کو کوشش کر کے دور کریں تو پیدائش دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہماری طرز معاشرت کچھ قانون قدرت نہیں کہ ہم اس میں کچھ دخل ہی نہیں دے سکتے۔ یہ تو ہماری اختیاری چیزیں ہیں جنہیں ہم حسب ضرورت ترمیم و تبدیل کر سکتے ہیں

ابوالمنصور حمید

اعتراف

(نظم)

(۱)

نہ خراب دید ہوں میں — نہ مری نظر میں تو ہے
نہ ترے قریب ہوں میں — نہ ہوائے جستجو ہے
نہ ضرورت تصور — نہ خیال کی ہوس ہے
نہ شکایت جدائی — نہ "وصال" کی ہوس ہے
نہ شباب کی تمنا — نہ جمال کی ہوس ہے
نہ سکوت آشنا ہوں — نہ سوال کی ہوس ہے
نہ شہید ذوق ہوں میں — نہ ہلاک شوق ہوں میں

مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

(۲)

جو بوقت صبح زریں — تو کنار "آب" میں ہو
تری ہر ادائے رنگین — اثر شراب میں ہو
ترے بے حجاب جلوے — جو شباب رنگ و بو ہوں
تری شوخیوں کی چھینٹے — جو گلاب رنگ و بو ہوں
تری مستیاں چھلک کر — جو شراب رنگ و بو ہوں
تو کبھی مری نگاہیں — نہ خراب رنگ و بو ہوں
جو قریب ہو یہ منظر — تو نہ آنکھ اٹھاؤں دیکھ

مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

(۲)

کسی جھیل کے کنارے — جو تو پھول توڑتی ہو
کبھی تتلیوں کو پکڑے — کبھی ان کو چھوڑتی ہو
وہ نیاز مند ہو میں — تجھے کر رہی ہوں سجدے
وہ تری حسین چڑیاں — ترے ہو رہی ہوں صدقے
تری گلفروش زلفیں — ترے لے رہی ہوں بوسے
مجھے کیا کریں گے بیخود — یہ فریب ہوش جلوے
نہ نظر اٹھا کے دیکھوں — نہ کسی نگاہ سے جھانکوں

مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

(۴)

کبھی جھوم کر جو اٹھیں — سر کوہ سے گھٹائیں
وہ شراب پاش بوندیں — جو پیام کیف لائیں
ترے باغ میں پڑا ہو — وہ ترا حسین جھولا
تو ملار گا رہی ہو — ہو خمار سا برستا
ترے مشک بار گیسو — ہر جہان کو جنکا سودا

مجھے یاس اگر بلائیں تو میں چھوڑ دوں وہ رستا
نہ پھر ایک لمحہ ٹھہروں ترے پاس تک نہ آؤں
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

-:(۵):-

وہ جمیلۂ بہشتی جو بہار بن کے آئے
شجر و گل و ثمر پہ نشۂ بہار چھائے
تو زمین رنگ و بو پر ہو خرام دلنشیں میں
ہوں ہزار میکدے جب تری مستی حسین میں
ہو پیام کفر رنگیں تری زلف عنبریں میں
تو خیال سجدہ آئے نہ کبھی مری جبیں میں
تجھے اس طرح جو دیکھوں تو چمن میں بھی نہ ٹھہروں
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

-:(۶):-

لب نہر تو اگر ہو تو شب ماہ منجلی میں
ترے گیسوئے پریشاں ہوں ادائے کافری میں
نشۂ شباب سے جب ترا حسن جھوم جائے
تری شوخیوں کی مستی جو صبا کو گدگدائے
تو رباب موج دریا تجھے زمزمے سنائے
مجھے محو دیکھ کر تو جو ادا سے مسکرائے
تو میں پھیر لوں نظر کو نہ کبھی اٹھاؤں سر کو
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

-:(۷):-

جو کبھی تو آ ہی جائے مری خلوت حسیں میں
مرا ہاتھ بھی گر آئے ترے دست نازنیں میں
تو مجھے تری قسم ہے میں حیا سے سر جھکا لوں
میں جھٹک کے انگلیوں کو ترے ہاتھ سے چھڑا لوں
تو ہزار مجھ سے بولے نہ زباں سے کچھ نکالوں
جو کچھ اور مدعا ہو تو معاً قدم ہٹا لوں
تو مجھے اگر بلائے مری گرد بھی نہ پائے
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

روش صدیقی

غزلیات

آزر رامپوری

اگر تا حدِ شوق امکانِ سعیِ جستجو ہوتا
تری تصویر میں ہوتا مری تصویر تو ہوتا

فریبِ ہجر ہوتا یا فریبِ گفتگو ہوتا
بشر تھا میں بہر صورت ہلاکِ آرزو ہوتا

ذرا مفہومِ رحمت کی ہی تم تشریح کر دیتے
گنہگاری کو کچھ اندازۂ لاتقنطو ہوتا

چھپے بیٹھے ہو جو چاہو کہو عرضِ تمنا پر
مکرنے کا مزہ جب تھا کہ میں بھی روبرو ہوتا

جدھر سے آپ کی آواز آئی اُس طرف دوڑا
میں آخر اور کس پہلو سے محوِ جستجو ہوتا

اگر میں عشق سے پہلے سمجھتا اُنکے رتبے کو
نہ رنجِ جستجو ہوتا نہ خونِ آرزو ہوتا

چمن میں پھول یہ ہرگز نہ رہتے میرے آنے تک
جو گلچینوں کو کچھ بھی امتیازِ رنگ و بو ہوتا

مصیبت اب تو جھیلوں گا کہ تم سے عشق ہے مجھکو
نہ دنیا ہی نئی ہوتی جو میں آرام جو ہوتا

جھکی پڑتی ہے دنیا آزر اس بے برگ و باری پر
غضب ہوتا جو شاخِ عشق میں جوشِ نمو ہوتا

حافظ غازیپوری

چشمِ غماز ہر اک ذرہ ہے ویرانہ کا
راز ہو جائے نہ افشا کہیں دیوانے کا

شوقِ تکمیل مجھے کھینچ کے لایا ورنہ
میں بھی تھا شاہدِ فطرت کسی کاشانے کا

دل میں آتشکدۂ عشق اٹھا لایا ہوں
شمع دیکھے تو ذرا حوصلہ پروانے کا

جرعۂ ذوقِ خودی میں ہے سرورِ جاوید
بیخودی نام ہوا ہوش میں آجانے کا

سو طریقوں سے وہ ہر روز ستاتے ہیں مجھے
ناز بھی ایک بہانہ ہے ستم ڈھانے کا

سن کے کیا کوئی کرے دور کی آواز ہوں میں
ایک عنوان سا ہوں شوق کے افسانے کا

عیش و عشرت پہ نہ اترائے وہ کیونکر حافظ
جس نے دیکھا ہو منظر کبھی ویرانے کا

آزاد انصاری

آج دل سے ضبطِ غم کا حوصلہ جاتا رہا — آج دل ہم سے گیا گزرا ہوا جاتا رہا
آج تا حدِ نظر خوش رنگ منظر ہیں تو ہوں — جس سے دلچسپی تھی وہ رنگِ فضا جاتا رہا
آج سو سامان عشرت جلوہ گستر ہیں تو ہوں — اک خوشی تھی چل بسی اک لطف تھا جاتا رہا
عالمِ حسرت ہوں۔ کیا مسرور ہوں کیا شاد ہوں — جو بنائے شوق تھا وہ سلسلہ جاتا رہا
وحشت دل سے نہ گھبراؤں تو آخر کیا کروں — جس سے لطف زیست تھا وہ مشغلہ جاتا رہا
ایک خوش وقتی کی صورت کیا مٹی دل مرگیا — ایک دل مرگیا۔ ہر حوصلہ جاتا رہا
کام کیا بگڑا کہ دل صرف ہجوم یاس ہے — آس کیا ٹوٹی کہ جینے کا مزا جاتا رہا
مرحبا اے دوستانِ باوفا صد مرحبا — وہ وفائیں کیں کہ سودائے وفا جاتا رہا

اب ترا آزاد ہے اور قید افکار جہان
اب وہ آزادی کا سچا ادعا جاتا رہا

جگر بریلوی

دل سے نکلی جو درد کی آواز — کھل گیا مجھ پہ زندگی کا راز
خو گر لطف کر دیا تم نے — کون اٹھائے ستمگری کے ناز
نہیں اچھی ہے بیخودی غم کی — کھل نہ جائے کہیں کسی کا راز
رکھدیا سر کسی کے قدموں پر — کاش نکلے یہی طریق نیاز
اُف چمن میں نہ چھوڑا اے صیاد — توڑتا ہے اگر پر پرواز
ہنستے ہنستے رلا دیا تم نے — چھیڑ کر میرا ماجرائے نیاز
دم قفس میں نکل گیا آخر — ہائے میں اور حسرت پرواز

بندگی کرنے پر جب آئے تو کیا
کہیں رکھدی جگر جبین نیاز

فرخ بنارسی

اے عشق ترے ہاتھوں گھر گھر ہوئی بربادی — ہاں گورِ غریباں کی بڑھتی گئی آبادی

پرواز کی طاقت بھی تا حد معین ہے — سمجھا ہے مجبوری کہنے کو ہے آزادی

صیاد کی مرضی پر موقوف رہائی ہے — یہ قیدِ قفس بلبل ہوتی نہیں میعادی

الفت کے [illegible] صیدوں کو — کیا جانئے کیا سمجھا کس واسطے ایذا دی

بے حکم کوئی ذرہ جنبش نہیں کر سکتا تو — اک راز ہے سربستہ پابندی و آزادی

تم نے تو قیامت پر انصاف اٹھا رکھا — مظلوم کہو کس سے دنیا میں ہو فریادی

توڑا نہ ہی ہاتھوں سے دیوارِ عناصر کو — پھر سیرِ حقیقت کر اے طالبِ آزادی

افسانۂ عالم کو عبرت سے سنے کوئی — اس منظرِ دلکش کا ہر نقش ہے فریادی

کرتے ہو جفائیں بھی پردے میں وفاؤں کے — کیا خوب نکالی ہے طرزِ ستم ایجادی

تقصیر تری الفت پہ الزام ادھر رکھا — قسمت کے نوشتے میں لکھدی ادھر آزادی

صیاد ابھی کچھ دن رہنے دے اسیری میں — لائے گی قفس میں پھر مجھ کو مری آزادی

کیا روتے ہو الفت میں ہونا ہی ہے فرخ — رسوائی پہ رسوائی بربادی پہ بربادی

ثمر دربھنگوی

مری بیکلی پہ ترس نہ کھا تو خیال مرا ذرا نہ کر — مجھے رہنے دے یونہیں مضطرب مرے درد دل کی دوا نہ کر

کہوں کیوں ستم کو ترے ستم ہے دلیلِ عشرتِ جاں فزا — ترے ظلم میں ہیں لگاوٹیں ہیں یہ کیوں کہوں کہ جفا نہ کر

یہ خلش بھی میری ہے وہ خلش جسے کہئے مایۂ عاشقی — مجھے زخم دل سے لگاؤ ہے مرے چارہ گر تو دوا نہ کر

ہے خیال تیرا شریکِ غم مرے حال سے نہ ہو بے خبر — یہ تغافل ایک ادا سہی مگر اس قدر بھی روا نہ کر

یہ جفا فریبِ وفا نہ تھی کہ کسی طرح کی نہ خلش رہی — اب اگر کرم کا خیال ہے مرا حال مجھ سے سنا نہ کر

یہ اگر جگر سے الگ ہوا نہ خلش رہے گی نہ کچھ مزا — میں نثار تیرِ نگاہ کے مرے دل سے اسکو جدا نہ کر

ارے او ثمر ارے بیخبر عبث ان سے شکوے بیاں نہ کر
ہے امید رسمِ وفا اگر کبھی اُن سے عرض وفا نہ کر

...عمرو عیار

...سجاد حسین مرحوم

- ...الذی ۸ر
- ...بغلول ۸ر
- ...ی دنیا ۸ر
- ...پلیٹ ۸ر
- ...چھری ۶ر
- ...دار لونڈی
- ...فانوس

...شاد برق

- ...ی ۱۲ر
- ...تین ۱۲ر
- ...دلہن ۱۲ر
- ...قہ فرنگ ۱۲ر
- ...ب ۱۲ر
- ...ی ۱۰ر

...ناشر مرحوم

- ...بغدادی
- ...بنت حسین ۶ر
- ...ذبیحہ ۳ر
- ...لعین ۳ر
- ...ت
- ...ے حق
- ...چین
- ...فتوح
- ...قری

- العاشقو
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومتہ الکبریٰ
- فلپانا
- عروس ملکہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن
- بدر النساء کی مصیبت
- خوفناک محبت
- میوۂ تلخ ۸ر
- نیکی کا پھل

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

- تیل کا سانپ
- رام پیاری
- عبرت
- حسن سرور
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر عباسہ ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زندانی ۶ر
- اصلاح زبان ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصل اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- " دوسری کتاب ۸ر
- " تیسری ۸ر
- " چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی۔اے

- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- نگہبان فصاحت
- بادۂ ناب

ظفر عمر بی۔اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری

- بہرام کی گرفتاری

مولوی عبد الماجد بی۔اے

- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- زود پشیمان ۸ر
- فلسفیانہ مضامین

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ
- خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ دو جلد
- سیرۃ عمر بن العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین
- فقرائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند دو جلد

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول
- " دوم
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الباری ندوی

- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی عبد الرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی و یورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

- گلستان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

سید سجاد حیدر بی۔اے

- زہرا ۱۳ر
- جلال الدین خوارزم شاہ
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸ر
- حکایات و احتساسات

مولوی راشد الخیری

- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- منازل السائرہ

- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- عروس کربلا
- یاسمین خانم
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوب خداوند
- موؤدہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- مقدمۂ شعر و شاعری
- دیوان حالی

تاریخی و دلچسپ جاسوسی ناول

- سراب فتین ۸ر
- بالشویک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۸ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس
- تیغ جلی
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور
- زر پرست